نقش حالی

حصہ دوم

مرتبین

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
احتشام حسین رضوی
شجاعت علی سندیلوی

قیمت پانچ روپے

مرثیاں

نقشِ حالی

حصہ دوم

مرثیں

نقشِ حالی

حصّہ دوم

مرتبین

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ
سیّد احتشام حسین رضوی
شجاعت علی سندیلوی

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

قیمت پانچ روپے

ترتیب

حالی اور ان کی دُنیا

حالی
اور
ان کی دُنیا

اختر اورینوی

حالی اور مسئلہ زبان

(حالی صرف ایک فرد نہیں بلکہ وہ ایک خاص تہذیبی مزاج کے نمونہ اور نمائندہ بھی تھے۔ وہ ایک ایسی عظیم ثقافتی تحریک کے ضروری عنصر تھے جو عہد آفرین تھی) سر سید نے ہند اسلامی کلچر کا ایک زندہ کیسہ (CELL) اپنے گرد منظم کیا تھا، جس کا نقطۂ مرکزی (NUCLEUS) خود سر سید تھے۔ حالی اس کلچری کیسہ کا ایک جیتا جاگتا حصہ تھے۔ وسط انیسویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں ایک نئی تہذیبی صبح طلوع ہونے لگی تھی۔ اس صبح نو کی ایک "شوخ کرن" سر سید تھے۔ وہ "فطرت کا اشارہ" خوب سمجھتے تھے اور "شب کو سحر" کرنا جانتے تھے۔ نہ وہ "مشرق سے بیزار" تھے اور نہ "مغرب سے حذر" کرتے تھے۔ سر سید نے ہزاروں ہزار زرّوں کو جہان تاب بنایا۔ ان میں ایک ایسا زرہ بھی تھا جو خود آفتاب اقبال بنا۔)

زندگی ایک بڑا پیچیدہ مرکب ہے۔ تعمیر حیات ایک دن میں نہیں ہوتی ہر چند کہ سر سید کا اثر حالی پر نہایت گہرا پڑا تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صرف

سرسید کی مقناطیسی بجلی نے حالی کو برق تاب بنایا۔ حالی کی شخصیت اسی طرح
ابھری جیسے خود سرسید کی شخصیت پنپی تھی۔ لہٰذا میں مختصراً حالی کی زندگی
کی اہم منزلوں کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے زبان و بیان کے متعلق اُنکے
نقطۂ نظر کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

حالی ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ پانی پت آپ کا مولد و وطن تھا۔ حالی
کی تعلیم مشرقی نہج پر ہوتی رہی۔ اوّل انھوں نے قرآن حفظ کیا اور پھر فارسی
اور عربی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مزید تعلیم کے لیئے دہلی کا سفر اختیار کیا۔
"کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا"[1] ۱۸۵۶ء میں
ضلع حصار کی کلکٹری میں ملازمت کی۔ غدر کے بعد بیکاری کی مصیبت ٹوٹ
پڑی دہلی کے قیام کے دوران "مرزا غالب کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق
ہوتا تھا۔ غالب نے حالی کو قدرے پڑھایا بھی تھا۔ ان کی نسبت یہ بھی فرمایا
تھا کہ "اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے"۔ غدر کے بعد نواب
مصطفٰے خان شیفتہ سے منسلک ہوئے۔ شیفتہ مومن کے شاگرد تھے۔ وہ نہایت
متین، سنجیدہ اور مہذب بزرگ تھے۔ حالی اور شیفتہ دونوں اپنا اپنا کلام
مرزا غالب کے پاس بھیجتے تھے۔ حالی لکھتے ہیں کہ نواب صاحب کی صحبت سے
انھیں بہت فائدہ ہوا۔ "وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے
بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے
دلفریب بنانا، اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری

---

[1] ترجمۂ حالی، صفحہ ۲۶، مقالات حالی، حصّہ اوّل۔

الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے"
(مقالات ج ۱ ص ۲۶۷)۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد حالی کو پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو، لاہور میں ایک اسامی مل گئی۔ وہاں جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے۔ ان کی اردو عبارت انھیں درست کرنی پڑتی تھی۔ لکھتے ہیں، "تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔" لاہور ہی میں کرنیل ہالرائڈ، ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، کی سرپرستی میں مولانا محمد حسین آزاد نے ایک نئی قسم کے مشاعرہ کی بنیاد ڈالی (۱۸۷۴ء)۔ جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا۔ حالی نے بھی اس زمانے میں چار مثنویاں لکھیں۔ ایک برسات پر دوسری امید پر تیسری انصاف پر اور چوتھی حب وطن پر۔ لاہور سے حالی پھر دلی آئے اور اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر مامور ہوئے لاہور کے اثرات قائم رہے۔ بعد از آں "سر سید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہو گی۔" چنانچہ حالی نے مسدس مد و جزر اسلام اور دوسری نظمیں اس رنگ میں لکھیں۔ نثر لکھنے کا آغاز ۱۸۶۷ء میں ہوا پہلی نثری تصنیف ایک مذہبی رسالہ کی صورت میں نمودار ہوئی۔ اس کا نام تریاق مسموم تھا۔ حالی نے ایک قصہ موسوم بہ مجالس النساء بھی لکھا تھا۔ ان کے بعد

حیاتِ سعدی، مقدمۂ شعر و شاعری ایعنی دیوان، یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید کی تصنیف ہوئی۔ ان کے علاوہ ثنیس بتیس مضمون مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے گئے (مقالاتِ حالی ہر دو حصہ)۔

حالی نے کرنل ہالرائڈ والے مشاعرے (۱۸۷۴ء) اور سر سید کے پرچے تہذیب الاخلاق (۱۸۷۰ء) کو ہندوستان کی ادبی فضا کی درستگی کے سلسلہ میں بڑی اہمیت دی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"...... یہ تحریک خوش قسمتی سے ایسے وقت ہوئی جبکہ اردو زبان میں مغربی خیالات کی روح پھونکی جا رہی تھی۔.......... سر سید احمد خاں نے پرچۂ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس کے سبب سے مسلمانوں کے خیالات میں جو لٹریچر کا صحیح مذاق رکھتے تھے۔ بہت جلد ایک انقلابِ عظیم پیدا ہو گیا...." (مجموعہ نظم حالی، دیباچہ صـ۲)۔ خود اپنے متعلق حالی کہتے ہیں۔ "میں نے اردو زبان میں نئی طرز کی ایک ادھوری اور ناپائیدار بنیاد ڈالی ہے۔ اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصرِ رفیع الشان بنانا ہماری آئندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے، جن سے امید ہے کہ اس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے" (ایضاً صـ۴)۔

حالی اور مسئلۂ زبان کے سلسلہ میں حالی کا نظریہ اردو زبان کی وسعت کے متعلق پیش کیا جا سکتا ہے۔ اردو کی ترکیب اور مزاج کے بارے میں انکی رائے کی وضاحت ہو سکتی ہے۔ نیز اردو کی جان داری اور ترقی کے متعلق انکے مشوروں سے بحث کی جا سکتی ہے۔ اس میدان میں خود حالی کا عمل کیا رہا ہے

اس کی تحقیق بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن ان باتوں کے علاوہ حالی نے زبان و بیان کے متعلق اور نکتے بھی پیش کئے ہیں، جن کا تعلق اُردو زبان و ادب کی ترقی کے ساتھ گہرا ہے۔ مثلاً الفاظ کی قدر و قیمت، خیال اور اسلوب کا تعلق روایت اور جدت میں ربط وغیرہ نکات کو حالی نے بہت اچھی طرح پیش کیا ہے۔ وہ ان مسائل کے بارے میں نہایت متانت، سنجیدگی، غور و فکر اور توازن کے ساتھ اپنے خیالات پیش کرتے ہیں۔ سب سے پہلے میں اُردو زبان کے متعلق حالی کے خیالات درج کرتا ہوں۔

"اگرچہ اُردو کم و بیش تمام اطراف ہندوستان میں متداول ہے لیکن ممکن ہے کہ بعض ممالک کے باشندے اپنی خاص زبان میں بہ نسبت اُردو زبان کے زیادہ آسانی سے شعر سر انجام کر سکیں............ چونکہ اردو زبان ہندوستان کی اور تمام زندہ زبانوں کی نسبت بالاتفاق زیادہ وسیع اور خیالات ادا کرنے کے زیادہ لائق ہے۔ تمام اطراف ہندوستان میں عموماً بولی اور سمجھی جا سکتی ہے اور اس بات کی زیادہ مستحق ہے کہ اسی کو ہندوستان کی قومی زبان بنایا جائے اور جہاں تک ممکن ہو اسی کو ترقی دی جائے۔ نیز اُس کا حاصل کرنا اور اُس میں کافی مہارت بہم پہنچانی ہندوستان کے باشندوں کو اتنی دشوار نہیں ہے جتنی کہ اور غیر مادری زبانوں میں دشواری ہوتی ہے۔ اس کے سوا ہندوستان کی تمام زندہ زبانوں میں بالفعل کوئی زبان ایسی نہیں معلوم ہوتی جس میں اُردو کے برابر شعر کا ذخیرہ موجود ہو......"

(مقدمہ شعر و شاعری، صہ ۹۹-۹۸۔ مطبع

انوار احمدی، الہ آباد)

حالی پھر حیات جاوید میں یوں رقم طراز ہیں۔

"اس بات کا کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں کوئی زبان اُردو سے بڑھ کر عام زبان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ملک کے بعض حصوں میں بہ نسبت بعض کم بولی جاتی ہے، مگر ایسا کوئی حصہ نہیں جہاں اُردو کے بولنے اور سمجھنے والے نہ ہوں۔ خود گورنمنٹ اس بات کو تسلیم کر چکی ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان اُردو ہے اور اسی بنا پر ۱۸۳۵ء میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو قرار دی گئی"۔ (ح ج صہ ۲۶-۱۲۵)

حالی نے اس مسئلہ کی نسبت مشہور مستشرق گارساں دتاسی کی رائے بھی تائید میں درج کی ہے۔

حالی متعصب اور انتہا پسند نہ تھے۔ اُن کی شخصیت میں بڑی سلامت روی اور حق پسندی پائی جاتی تھی۔ اردو کی وسعت اور ہمہ گیری ثابت کرنے کے بعد وہ اُردو کی اصلی ترکیب کے بارے میں نہایت منصفانہ رائے ظاہر کرتے ہیں۔

"اردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے اور جس میں عربی و فارسی کے صرف کسی قدر اسما اس سے زیادہ شامل نہیں ہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ہوتا ہے۔ اس کو ہمارے ہم وطن بھائیوں نے صرف اس بنا پر مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بنیاد مسلمانوں کے

عہد میں پڑی تھی "

(حیات جاوید صـ ۱۲۲ مطبوعہ
انجمن ترقی اُردو، ہند دہلی ۱۹۳۹ء)

مقدمہ شعر و شاعری میں لکھتے ہیں۔

" اردو زبان کی بنیاد جیسا کہ معلوم ہے ہندی بھاشا پر رکھی گئی ہے۔ اسکے تمام افعال اور تمام حروف اور غالب حصہ اسما کا ہندی سے ماخوذ ہے۔ اور اردو شاعری کی بنا فارسی شاعری پر جو عربی شاعری سے مستفاد ہے قائم ہوئی ہے۔ نیز اُردو زبان میں بہت بڑا حصہ اسما کا عربی اور فارسی سے ماخوذ ہے۔ پس اُردو زبان کا شاعر جو ہندی بھاشا کو مطلق نہیں جانتا اور محض عربی و فارسی کے تان گاڑی چلاتا ہے وہ گویا اپنی گاڑی بغیر پہیوں کے منزل مقصود تک پہنچانی چاہتا ہے۔ اور جو عربی و فارسی سے نابلد ہے اور صرف ہندی بھاشا یا محض مادری زبان کے بھروسے پر اس بوجھ کا متحمل ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسی گاڑی ٹھیلتا ہے جس میں بیل نہیں جوتے گئے "۔

(مقدمہ صـ ۱۰۳-۱۰۴ مطبع انوار احمدی الہ آباد)

اُردو زبان کے مزاج و ترکیب کی حفاظت حالؔی کے نزدیک نہایت اہم مسئلہ ہے۔ لکھنؤ کے متاخرین شعراء پر تنقید کرتے ہوئے حالؔی لکھتے ہیں۔

"...... طبیعتیں اس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ رفتہ رفتہ ترک اور اُن کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ سیدھی سادی اُردو امرا اور اہل علم کی سوسائٹی میں

متروک ہی نہیں ہو گئی، بلکہ بسیا ثقات سے سنا گیا ہے معیوب اور بازاریوں کی گفتگو سمجھی جانے لگی۔ اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر بھی غالب آگیا۔ .... باایں ہمہ انصاف یہ ہے کہ مرثیہ اور مثنوی میں خاص خاص شخصوں پر زمانہ کے اقتضا نے کچھ اثر نہیں کیا۔ انھوں نے زبان کے اصلی جوہر کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔"

(مقدمہ صہ ۱۴۳)

اُردو زبان و ادب کی ترقی کے لئے حالی نے اپنی کتابوں میں بہت ہی کارآمد اور نتیجے خیز مشورے بھی دیئے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"اردو پر قدرت حاصل کرنے کے لئے صرف دلی یا لکھنؤ کی زبان کا تتبع ہی کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضرور ہے کہ عربی اور فارسی میں کم سے کم متوسط درجہ کی لیاقت اور نیز ہندی بھاشا میں فی الجملہ دستگاہ بہم پہنچائی جائے۔" (مقدمہ صہ ۱۰۳)

اُردو زبان کی ترقی کے لئے حالی نے اور چند اہم اور مفید تجویزیں پیش کی ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔

"کوئی زبان تمام ملک میں یکساں طور پر اس وقت تک شائع نہیں ہو سکتی جب تک کہ مندرجہ ذیل ذریعے ملک میں مہیا نہ ہوں۔ ۱۔ اس زبان کی معتبر اور جامع ڈکشنری کا تیار ہونا۔ ۲۔ اس کی جامع گرامر کا مرتب ہونا ۳۔ اس میں کثرت سے نظم و نثر کی کتابوں کا تصنیف و تالیف ہو کر شائع ہونا۔ ۴۔ اس زبان کے اخبارات و رسائل کا تمام اطراف و جوانب

ملک میں اشاعت پاتا" ....

(مقدمہ صنن ۱۰۱)

پھر فرماتے ہیں ..." لیکن شاعرانہ خیالات اور خاص کر نیچرل شاعری کے فرائض ٹکسالی زبان میں ادا کرنے کے لیئے .... سب سے زیادہ مفید اہل زبان کی صحبت اور اُن کی سوسائٹی میں اتنی مدت تک بسر کرنا ہے کہ اُن کے الفاظ و محاورات بقدر معتد بہٖ نامعلوم طور پر زبان پر چڑھ جائیں۔ لیکن چونکہ ایسا موقعہ ہر شخص کو ملنا دشوار ہے۔ اس لیئے ضرور ہے کہ شعرائے اہل زبان کا کلام جس قدر زیادہ ممکن ہو غور اور توجہ سے بار بار دیکھا جائے نہ اس ارادہ سے کہ خیالات اور مضامین میں اُن کی تقلید کی جائے بلکہ اس نظر سے کہ وہ الفاظ و محاورات کو کس طرح استعمال کرتے ہیں اور خیالات کو کن اسلوبوں اور کن پیرایوں میں ادا کرتے ہیں۔"

(مقدمہ صنن ۱۰۱-۱۰۰)

حالی کی نظر اتنی سلجھی ہوئی تھی اور اُنکا مذاق اتنا صاف ستھرا تھا کہ ٹکسالی زبان سیکھنے کی راہ میں جو خطرہ تھا اُسی سے بھی متنبہ کر دیا۔ نقالی اور اندھی تقلید کے لیئے اساتذہ کا کلام نہیں پڑھنا چاہیئے بلکہ صرف الفاظ محاورات، اسالیب اور پیرایہ بیان سیکھنے کے لیئے۔ اُن کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ نیز حالی نے اہل زبان کے تنگ دائرہ کو بھی وسیع کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں " ابن خلدون کہتے ہیں کہ " ایک عجمی فصحائے عرب کے

کلام کی ممارست سے اہل زبان میں شمار کرنے کے لائق ہو سکتا ہے ؛ پس ہندوستان کے باشندے اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اہل زبان کے کلام کی مزاولت سے مثل اہل زبان کے سمجھے جائیں ۔"

(مقدمہ صـ ۱۰۱)

پھر فرماتے ہیں ۔ " جو لوگ اپنے تئیں اردو زبان کا مالک سمجھتے ہیں یعنی اہل دہلی یا اہل لکھنؤ ان کو اس بات پر فخر کرنا نہیں چاہیئے کہ ہماری زبان کا لوگ اتباع کرتے ہیں، اور ہمارے روزمرہ کی پیروی کی جاتی ہے ۔ اُن کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر وہ اپنی زبان کی خبر نہ لیں گے، اُس کے محفوظ رکھنے کے وسائل بہم نہ پہنچائیں گے، اس کے الفاظ و محاورات کو نہایت احتیاط کے ساتھ فراہم اور مرتب نہ کریں گے اور اس کی نظم و نثر کو زمانہ کے مذاق کے موافق ترقی نہ دیں گے تو ان کی زبان کا وہ حصہ جس پر اُن کو فخر ہے اور جو ان کی اور تمام ہندوستان کی اردو میں مابہ الامتیاز ہے وہ حرف غلط کی طرح صفحۂ روزگار سے محو ہو جائے گا ۔ اور یہی بُری بھلی اُردو جو عام اخبارات اور جدید تصنیفات کے ذریعے سے ملک میں پھیل رہی ہے اور جس کو وہ ابتک حقارت کی نظر سے دیکھتے رہے ہیں، زیادہ سے زیادہ نصف صدی میں یہی ملک کی ٹکسالی اور فصیح زبان قرار پا جائیگی"

(مقدمہ صـ ۱۰۲)

اس سلسلہ میں حالؔی نے قدیم عربی اور مروجہ عربی کی مثال دی ہے اور انجام سے خبردار کیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالؔی کی نظر زبان و لسان

کے قانون ارتقا کی طرف بھی اٹھی تھی اور انھوں نے بالکل صحیح نتیجہ اخذ کیا تھا۔ ہندوستان میں بھی پانینی اور پاتنجلی جیسے اہل زبان برہمنوں کی سنسکرت آہستہ آہستہ مٹ گئی اور اس کی جگہ عوام کی سنسکرت اور پھر پراکرت نے لے لی۔ یہی حشر معیاری پالی پراکرت کا بھی ہوا۔ ملک کی مختلف آپ بھرنشوں نے اُس کی جگہ لے لی۔ اُردو زبان بھی ارتقا کے قوانین سے ہرگز آزاد نہیں۔ اردو کا ظہور، دہلوی اردو، اور پھر لکھنوی اور عظیم آبادی دکنی اُردو کا ظہور علم الالسنہ کے قانون کے تحت ہی ہوا۔ اور پھر اہل زبان کے اعتراضات کے باوجود پنجاب میں جو اردو کی ترقی ہوئی وہ اور کہیں نہیں ہوئی۔ حالی نے اس مسئلہ کے اور گوشوں کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ انھوں نے صحت تلفظ متروک الفاظ اور مقامی اثرات کی بحثیں بھی چھیڑی ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"زبان کے متعلق ایک اور بات لحاظ کے قابل ہے۔ نیچرل شاعری کے لئے جیسا کہ ظاہر ہے ہماری موجودہ زبان کافی نہیں ہے۔ اس لئے ضرور ہے کہ اس میں وُسعت پیدا کی جائے۔ پس اہل لکھنؤ جو زبان کے دائرہ کو روز بروز زیادہ تنگ کرتے جاتے ہیں، یہ امر مقتضائے وقت کے بالکل خلاف ہے۔"

(مقدمہ صـ۱۰۴)

حالی نے ایک لکھنوی رسالہ شعر و سخن (۱۸۹۰ء) کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"اس میں کچھ اوپر پچاس لفظ ایسے لکھے ہیں جن کو خود صاحب رسالہ

یا اور اہل لکھنؤ واجب الترک خیال کرتے ہیں...............

اسی رسالہ میں بعضے ایسے الفاظ کو واجب الترک قرار دیا ہے جو اصل زبان کی گرامر یا قیاس لغوی کے خلاف برتے اور بولے جاتے ہیں جیسے "موسم" بفتح سین یا "مُیسّت" بفتح یا.............. لیکن فی الحقیقت یہ ایک غلطی ہے جو اکثر ہمارے عربی دانوں کو علم لسان کی ناواقفیت سے پیش آتی ہے۔ اُن کو یہ معلوم نہیں ہے کہ ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں منتقل ہو کر کبھی اصلی صورت پر قائم نہیں رہ سکتے۔"

(مقدمہ ص ۱۰۵-۱۰۴)

حالی نے اس باب میں سنسکرت کے بہتیرے ایسے لفظوں کی مثالیں دی ہیں جو اُردو میں آکر بدل گئے ہیں۔ مثلاً اُجل سے اُجلا، اَردھ سے آدھا، اندھکار سے اندھیرا۔ اسی طرح عربی الفاظ کی مثالیں بھی دی ہیں مثلاً غش بجائے غشی، مسلمان بجائے مُسلم، زیادتی بجائے زیادت سلامتی بجائے سلامت وغیرہ۔

سنسکرت الفاظ تو اُردو میں داخل نہیں ہوئے ہیں۔ اردو کے ہندی الاصل الفاظ کی اکثریت سنسکرت سے بدل کر فطری تشکیل کے قانون کے تحت موجودہ ہیئت میں نظر آتی ہے۔ یہ تبدیلی صوتی اور ترکیبی دونوں طور پر ہوتی رہی ہے اور اس میں صدیاں لگی ہیں۔ تبدیل شدہ الفاظ کو "تدبھاؤ" کہتے ہیں اور سنسکرت شبدوں کی اصلی شکل کو "تتسم" کہتے ہیں۔ تبدیلی کے عمل کو پراکرتی عمل کہا جاتا ہے۔ ساری پراکرتین

اور اپ بھرنشین اسی عملی ارتقا سے وجود میں آئیں۔ اُردو میں سنسکرت سے نکلے ہوئے الفاظ تدبھاؤ روپ میں ہی ملتے ہیں سوائے چند کے جو تتسم روپ میں ہیں جیسے پریم، نرمل، کومل، مدھر، روپ وغیرہ۔ عربی کے الفاظ اُردو میں ریختے کے طور پر ملے ہیں۔ سنسکرت کے شبد اگر ملے نہیں ہیں، وہ ہماری جڑ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حالی کو اس فرق کی وضاحت کرنی چاہیئے تھی۔ بہرکیف نتیجہ انھوں نے بالکل صحیح نکالا ہے۔ الفاظ زبان کی ارتقائی منزلوں میں صوتی لحاظ سے بھی بدلتے ہیں اور ترکیبی اعتبار سے بھی۔ کسی بنیادی زبان میں جب بیرونی الفاظ کی آمیزش ہوتی ہے تو نئے آئے ہوئے لفظوں میں بھی تبدیلیاں رونما ہونے لگتی ہیں۔ حالی نے انگریزی زبان سے بھی مثالیں دی ہیں مثلاً خلیفہ سے کیلف، مخزن سے میگزین، نواب سے نیباب، امیرالبحر سے ایڈمرل، فردوس سے پیرے ڈائز، قرمزی سے کرمسن، شکرے شکر وغیرہ۔ وہ انگریزی الفاظ جو اردو زبان میں داخل و شامل ہوئے ہیں وہ بھی مندرج بالا قانون کے اسیر ہیں مثلاً لینٹرن سے لالٹین، انجن سے انجن، ٹیکٹ سے ٹکٹ، کولونل سے کرنیل، رپورٹ سے رپٹ، جنرل سے جرنیل، لارڈ سے لاٹ، پوکٹ سے پاکٹ، کولج سے کالج وغیرہ۔ لیکن بہت سے ایسے انگریزی الفاظ بھی ہیں جو ابھی تک بدلے نہیں لیکن تلفظ میں تو بہرحال تبدیلی ہو گئی ہے۔ جیسے اسکول، اسٹیشن، سائکل، پلیٹ فارم، سوسائٹی وغیرہ۔

حالی فرماتے ہیں ــــ " جہاں تک استقرا کیا جاتا ہے کسی زبان کے الفاظ دوسری زبان میں جا کر اپنی اصلی وضع پر قائم نہیں رہتے.. .... بات یہ ہے کہ ایسے لفظوں کو جو کہ عربی یا فارسی یا انگریزی سے اُردو میں لیئے گئے ہیں۔ اور اصل وضع کے خلاف عموماً مستعمل ہوتے ہیں یہ سمجھنا ہی غلطی ہے کہ وہ موجودہ صورت میں عربی یا فارسی یا انگریزی کے الفاظ ہیں۔ نہیں بلکہ اُن کو اُردو کے الفاظ سمجھنا چاہیئے..."

(مقدمہ صفحہ ۱۰۶)

تلفظ کی راہ کے ایک بڑے خطرہ سے بھی حالی نے آگاہ کیا ہے۔ وہ عام غلطی اور عوام کی غلطی میں فرق بتاتے ہوئے صحیح راستہ کی نشان دہی کرتے ہیں۔

"جو غلط الفاظ خاص و عام دونوں کی زبان پر جاری ہو جائیں وہ عام غلطی میں داخل ہیں، ایسے الفاظ کا بولنا صرف جائز ہی نہیں بلکہ صحیح بولنے سے بہتر ہے ہاں جو غلط الفاظ صرف عوام اور جہلا کی زبان پر جاری ہوں نہ کہ خواص اور پڑھے لکھوں کی زبان پر۔ البتہ ایسے الفاظ کو ترک کرنا واجب ہے جیسے مزاج کو مجاز کہنا، خالص کو نخالص اور نسخہ کو نخسہ ـــ"

(مقدمہ صفحہ ۱۰۷)

حالی نے علاقائی اور مقامی اثرات کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا ہے اگر اُردو زبان کو ہندوستان گیر زبان بننا ہے تو پھر اس میں کچھ لچک

پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک وسیع زبان میں الگ الگ علاقوں کے رنگ ضرور ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان تمام لسانی رنگوں کو ہمیں قوس قزح کے رنگوں کی طرح پسند کرنے والی نظروں سے دیکھنا چاہیئے۔ حالی فرماتے ہیں:۔

"ان کے سوا بہت سے ایسے الفاظ واجب الترک بتائے ہیں جو شعرائے متقدمین نے عموماً استعمال کئے ہیں اور دہلی کے بعض شعرا اب بھی استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر روزمرّہ کی بول چال کے لحاظ سے دیکھا جائے تو آج تک دلّی کے خاص و عام برابر برتے رہتے ہیں۔ جیسے تئیں۔ کبھو۔ کسو...... سمیت۔ مت...... کیجئے۔ دیجئے۔ لیجئے............ مرا۔ ترا...... .... یہ الفاظ شاید لکھنؤ میں ترک ہو گئے ہوں، یا ہو جائیں..... .... جو صاحب ایسے الفاظ ترک کرنے کی عام ہدایت کرتے ہیں۔ اُن کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو آپ تو ملتان میں مقیم ہیں اور کشمیر جانے والوں کو اجازت نہیں دیتے کہ جڑاول کا بوجھ اپنے ساتھ باندھ کرلے جائیں۔"

(مقدمہ صـ۱۰۷)

اس معاملہ میں حالی کے ہاں تھوڑا سا تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ مقدمہ کے صفحہ ۱۰۴ پر متروک الفاظ کی بحث میں فرماتے ہیں کہ "بعض اُن میں سے خاص لکھنؤ کے ساتھ مختص ہیں۔ اہل دہلی کبھی اس طرح نہیں بولتے جیسے اندھیارا اندھیرے کی جگہ، اُجیالہ اُجالے کی جگہ....... ایسے الفاظ کا ترک کرنا ہم بھی نہایت مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس سے لکھنؤ اور دلّی

کی زبان میں مطابقت پیدا ہوتی ہے ......"

مندرجہ بالا جملے حالی نے اس لیے لکھے کہ وہ خود مضافاتِ دہلی کے تھے۔ مقامی عصبیت کی یہ ہلکی سی لہر تھی اور بس۔ اصل خیال حالی کا وہی ہے جو پہلے درج ہوا۔

حالی نے لسانیات کی بحث کے علاوہ ادبیات کے نکات سے بھی بحث کی ہے۔ دراصل یہ باتیں بھی مسئلہ زبان سے متعلق ہیں۔ بعد ازاں شعر و شاعری کی تفصیلات شروع ہو جاتی ہیں۔ اس باب میں بھی حالی نے نہایت اعلیٰ درجہ کی متوازن اور صائب رائیں دی ہیں۔ اُن کی نظر بہت گہری تھی اور سلامت روی اُن کی سرشت میں داخل تھی۔ ایسی شخصیت رہبری اور ہدایت کاری کے لائق ہوتی ہے۔ زبان و بیان کے بارے میں حالی کے عمدہ خیالات میں جستہ جستہ پیش کرتا ہوں۔ زبان کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"اے میری بلبلِ ہزار داستان! اے میری طوطیٔ شیوا بیان! اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری وکیل! اے میری زبان! .... تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشئے نہ چڑھا...... .... الٰہی! اگر ہم کو رخصت گفتار ہے تو زبانِ راست گفتار دے اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے"

(زبانِ گویا۔ مقالات ص ۲۰۷-۲۰۶)

"زبان گویا" ایک 'انشائیہ' (ESSAY) ہے۔ پھر بھی اس چھوٹے سے انشائیہ سے حالیؔ کا نظریۂ زبان اور نظریۂ ادب دونوں ظاہر ہوتے ہیں۔ حالیؔ کے نزدیک اظہارِ تجربہ و خیال و ابلاغ محسوسات و واردات کے لئے زبان سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔ روح و دل کی ترجمانی بھی زبان و بیان سے ہی ہوتی ہے۔ شخصیت کی ترجمانی کا وسیلہ زبان سے بہتر کوئی اور نہیں۔ فی الحال میں حالیؔ کے نظریۂ ادب کو پیش کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے 'زبان گویا' کے اُس حصہ سے حوالے نہیں دے رہا ہوں جس سے نظریۂ ادب پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی طرح مقدمہ شعر و شاعری میں جہاں حالیؔ نے اپنے مقصدی، افادی اور اخلاقی نظریۂ فن کی وضاحت کی ہے وہاں پر روشنی نہیں ڈالی گئی۔ اب تفحّصِ الفاظ کے متعلق حالیؔ کے خیالات ملاحظہ فرمائیے۔ لفظ زبان و بیان کی اِکائی ہے۔ لفظ ہی زبان ہے لفظ ہی کلام ہے۔ لفظ ہی جانور اور انسان کی آواز کے درمیان امتیاز پیدا کرتا ہے۔ حالیؔ فرماتے ہیں۔

"کائنات کے مطالعہ کی عادت ڈالنے کے بعد دوسرا نہایت ضروری مطالعہ یا تفحّص ان الفاظ کا ہے جن کے ذریعہ سے متکلّم اپنے خیالات مخاطب کے روبرو پیش کرتے ہیں۔ یہ دوسرا مطالعہ بھی ویسا ہی ضروری اور اہم ہے جیسا کہ پہلا۔"

(مقدمہ صـ ۱۲۴)

حالیؔ پھر الفاظ کے انتخاب و ترتیب کی اہمیت واضح کرتے ہیں حُسنِ بیان

کے لیئے مناسب الفاظ کا لباس تیار کرنا نہایت ضروری ہوتا ہے لیکن حالؔی کے خیالات میں اتنا توازن ہے کہ وہ ابن خلدون کی رائے پر محاکمہ کرتے ہوئے الفاظ اور معانی کی ہم آہنگی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ معانی سے الگ ہو کر الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہیں سے تجربہ اور فارم (ہیئت) کے ربط و تعلق پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ حالؔی نے روایت اور اسلوب بیان کے مسئلہ کی بھی تشریح کی ہے۔ لیکن انھوں نے ان نازک اور لطیف نکتوں کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ لہذا اظہار خیال میں جا بجا تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ "ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے اس قدر معانی پر نہیں"

(مقدمہ ص ۴۹)

یہ گویا ابن خلدون کے اس خیال کی تائید ہے جس کی تردید مثال دے کر کی جا چکی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے لفظ اور معانی، تجربہ اور ہیئت ایک فنی کل کے دو پہلو ہیں۔ ان کا علیحدہ علیحدہ پُر اثر اور زندہ وجود نا ممکن ہے جیسے روح و جسم کی الگ الگ زندگی اس دُنیائے آب و گل میں محال ہے۔

روایت کی پیروی اور قدما کے تتبع سے متعلق حالؔی فرماتے ہیں۔

"ابن رشیق نے یہ ہدایت خاص عربی زبان کی نسبت کی ہے۔ شاید عربی زبان کے لیئے یہ ہدایت مناسب ہو............ شاید وہاں یہ بات ممکن ہو کہ ہر مطلب کے ادا کرنے کے لیئے قدما کا اسلوب اختیار کیا جائے اور نئے اسلوب پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ لیکن ایسی نا مکمل زبان

جیسی کہ اُردو ہے .... ایسی زبان میں اگر اساتذہ کے تتبع ہی پر تکیہ کر لیا جائے تو جس طرح ابابیل کا گھونسلہ ابتدائے آفرینش سے ایک ہی حالت پر چلا آتا ہے .... اسی طرح اردو شاعری جس گہوارہ میں اس نے آنکھیں کھولی ہیں اُسی گہوارہ میں ہمیشہ جھولتی رہے گی۔"

(مقدمہ صہ ۵۱)

اس میں کیا شک ہے کہ حالی اپنے وقت کے نہایت ترقی پسند مگر متوازن ناقد اور فن کار تھے۔ لیکن عربی کلاسیکل شاعری سے متاثر ہونے کی وجہ سے وہ نئے تجزیوں کے متعلق جھجک کر اور رُک رُک کر باتیں کرتے ہیں حق یہ ہے کہ ہر ادب میں روایات کے احترام اور اُن کی پیروی کے ساتھ نئے تجربوں اور جدتوں کی ہر وقت ضرورت ہوتی ہے ایسا نہ ہو تو زبان و ادب پر جمود طاری ہو جاتا ہے اور پھر موت آجاتی ہے۔

حالی نے یادگار غالب میں بھی روایت اور جدت کے موضوعات سے بحث کی ہے اور خوب کی ہے۔ فرماتے ہیں ۔ "اعلیٰ درجے کا ملکۂ شاعری کسی خاص زمانہ یا خاص مُلک کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتا۔ پس یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ شاعری کی اعلیٰ قابلیت جیسی قدما میں ہوتی تھی ویسی متاخرین میں نہیں ہو سکتی، یا جیسی ایران کے شعرا میں ہوتی ہے ویسی ہندوستان کے شعراء میں نہیں ہوتی ...."

(یادگار صہ ۳۸۴)

اگر ایک طرف حالی نئے تجربوں اور نئی ترقیوں کے امکانات کی تائید

کرتے ہیں، تو دوسری طرف وہ روایات کی اہمیت اور افادیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ۔ "لیکن ہمارے نزدیک زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر جائے، اُس کو قدیم نمونوں سے کبھی استغنا حاصل نہیں ہو سکتا۔"

(صـ ۳۸۲)

حالیؔ کا مزاج ہمیشہ انھیں 'زرین اوسط' کے راستہ پر چلاتا ہے۔ اُن کی شخصیت اور فکر و نظر کی کشتی رواں میں اعتدال اور توازن کی پتوار لگی ہوئی ہے جو انھیں ہر موج و گرداب سے بچا کر سلامتی کے ساحل پر پہنچا دیتی ہے۔ غالبؔ کی اختراعوں پر نظر ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "بعض اسلوبِ بیان خاص مرزا کے مخترعات میں سے تھے جو نہ اُن سے پہلے اُردو میں دیکھے گئے نہ فارسی میں .... وہ اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرزِ خیال اور طرزِ بیان میں جدت اور نرالا پن پایا جائے .... اور یہی ان کی ٹیڑھی ترچھی چالیں اُن کی بلند فطرتی اور غیر معمولی قابلیت و استعداد پر شہادت دیتی ہیں۔ معمولی قابلیت و استعداد کے لوگوں کی معراج یہ ہے کہ جس پگ ڈنڈی پر اگلی کلیڑوں کا گلہ چلا جاتا ہے اُسی پر آنکھیں بند کر کے گلّے کے پیچھے پیچھے چلیں اور بھک کے اِدھر اُدھر آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں۔"

(یادگارِ غالب ص ۱۰۳)

لسانی اور ادبی اختراعات کی تجربہ گاہ میں بھی حالیؔ متوسط راہ و رفتار کو ہی پسند کرتے ہیں وہ انقلابی تبدیلی کی جگہ تدریجی ترقی کو سراہتے ہیں کہتے ہیں۔

"اسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرز بیان میں قدما کی طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انھیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں اور قدما کا دل سے شکر گزار ہو جو اُس کے لیئے ایسے منجھے ہوئے الفاظ و محاورات و تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔"

(دیوان حالی: دیباچہ ص۵)

مقدمہ میں فرماتے ہیں......"نئے اور اعلیٰ سے اعلیٰ خیالات بھی اوّل اوّل اسی زبان اور اسی روزمرّہ میں ادا ہونا چاہئیں جس میں پرانے..... خیالات ادا کئے جاتے تھے.............. مگر زبان میں دفعتہً وسعت پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ نامعلوم طور پر بیان کے اسلوب آہستہ آہستہ اضافہ کئے جاتے ہیں اور ان کو رفتہ رفتہ پبلک کے کانوں سے مانوس کیا جاتا ہے۔ اور قدیم اسلوب جو کانوں میں رچ گئے ہیں۔ ان کو بدستور قائم و برقرار رکھا جاتا ہے.......... کمال یہ ہے کہ..... اس طلسم کو جو قدما باندھ گئے ہیں ہرگز ٹوٹنے نہ دے۔ ورنہ وہ بہت جلد دیکھے گا کہ اُس نے اپنے منتر میں سے وہی انجھر بھلا دیے ہیں جو دلوں کو تسخیر کرتے تھے۔"

(مقدمہ ص۱۴۴-۱۴۵)

حالی زبان و بیان میں سادگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن وہ سادگی زبان اور عامیانہ میلان کے فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ سادگی کا معیا

پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو مگر پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو۔ اور الفاظ جہاں تک ممکن ہو تحاوُر اور روزمرّہ کی بول چال کے قریب قریب ہوں۔"

(مقدمہ ص۵۵)

سادگی کے باب میں حالی نے شیخ سعدی کی فن کاری کی مثال دی ہے۔ لکھتے ہیں۔ "گلستان کے ابواب کی عمدہ ترتیب، اُس کے فقروں کی برجستگی، اس کے الفاظ کی شستگی اُس کے استعارات کی جزالت، اُس کی تشبیہات و تمثیلات کی طرفگی، اور پھر باوجود ان تمام باتوں کے عبارت میں نہایت سادگی اور صفائی۔"

(حیات سعدی ص۶۷
مطبع انوار احمدی الٰہ آباد)

پھر لکھتے ہیں۔ "ان دونوں کتابوں (گلستان و بوستان) میں یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ باوجودیکہ صنائع لفظی و معنوی ان میں کثرت سے موجود ہیں، اور تقریباً نصف گلستان کے فقرے مسجع اور مقفّیٰ ہیں۔ بااین ہمہ وہ سادگی میں ضرب المثل ہیں اور جہاں نثر عاری کا ذکر آتا ہے وہاں سب سے پہلے گلستان کی مثال دی جاتی ہے۔ فی الواقع یہ شیخ کے کمال انشاپردازی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔"

(حیات سعدی ص۱۲۸)

حالی زبان و ادب میں روزمرّہ، محاورہ، تشبیہہ و استعارہ پر

بحث کرتے ہوئے صنائع وبدائع کے استعمال پر بھی مقدمہ میں تنقید کرتے ہیں اور اس طرح زبان کے برتاؤ کے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈال دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"اردو میں شعراء نے استعارہ کا استعمال زیادہ تر محاورات کے ضمن میں کیا ہے۔ کیونکہ اکثر محاورات کی بنیاد اگر غور کرکے دیکھا جائے تو استعارہ پر ہوتی ہے۔ مثلاً جی اچٹنا۔ اس میں جی کو اُن چیزوں سے تشبیہہ دی گئی ہے جو سخت چیز پر لگ کر اچٹ جاتی ہیں جیسے کنکر پتھر، نگینہ وغیرہ .... اصطلاح میں خاص اہل زبان کے روزمرّہ یا بول چال یا اسلوب بیان کا نام محاورہ ہے۔ پس ضرور ہے کہ محاورہ تقریباً ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ میں پایا جائے۔ کیونکہ مفرد الفاظ کو روزمرّہ یا بول چال یا اسلوب بیان نہیں کہا جاتا .... کبھی محاورہ کا اطلاق خاص کر اُن افعال پر کیا جاتا ہے جو کسی اسم کے ساتھ مل کر اپنے حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں جیسے ...... نقل اُتارنا، دل سے اُتارنا۔"

(مقدمہ ص ۵۶-۱۵۵)۔

پھر فرماتے ہیں۔" .... اہل زبان عموماً اس شعر کو زیادہ پسند کرتے ہیں جس میں روزمرّہ کا لحاظ کیا گیا ہو۔ اور اگر روزمرّہ کے ساتھ محاورہ کی چاشنی بھی ہو تو وہ اُن کو اور بھی زیادہ مزا دیتی ہے۔ مگر عوام اور خواص کی پسند میں بہت بڑا فرق ہے۔ عوام محاورہ یا روزمرّہ کے ہر شعر کو سُن کر سر دھننے لگتے ہیں، اگرچہ شعر کا مضمون کیسا ہی مبتذل یا رکیک اور

سبک ہو .... جب کوئی شعر باوجود مضمون کی متانت اور سنجیدگی کے روزمرّہ اور محاورہ میں بھی پورا اُتر جائے تو لا محالہ اُس سے ہر صاحب ذوق کو تعجب ہوتا ہے ... "

(مقدمہ صفحہ ۱۵۹-۶۰)

اصل میں زبان و بیان میں اظہار کا حُسن کُلّی تکمیل سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ کلام کی تاثیر محض کسی جزوی خوبی پر ہرگز منحصر نہیں۔ اس امر کا احساس حالی کو تھا۔ اس حقیقت کو وہ ایک تمثیل میں ظاہر کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں "محاورہ کو شعر میں ایسا سمجھنا چاہئے، جیسے کوئی خوبصورت عضو بدن انسان میں۔ اور روزمرّہ کو ایسا جاننا چاہئے جیسے تناسب اعضا بدن انسان میں جس طرح بغیر تناسب اعضا کے کسی خاص عضو کی خوبصورتی سے حسن بشری کامل نہیں سمجھا جا سکتا۔ اسی طرح بغیر روزمرّہ کی پابندی کے محض محاورات کے جا و بیجا رکھ دینے سے شعر میں کچھ خوبی پیدا نہیں ہو سکتی۔"

(مقدمہ صفحہ ۱۵۸-۵۹)

زبان و فن کا عضویاتی شعور اور کُلّی تصوّر ہی حالی کو صنائع و بدائع کے مصنوعی استعمال سے روکتا ہے۔ اور اسی بنا پر وہ شعر میں سنگلاخ زمینوں کے بھی خلاف ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"صنائع و بدائع پر کلام کی بنیاد رکھنے سے اکثر معنی کا سررشتہ ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اور کلام میں بالکل اثر باقی نہیں رہتا۔"

(مقدمہ صفحہ ۱۶۲)

باشعور فن کار کبھی اپنے کلام کی بنیاد ان پر نہیں رکھتے اور نہ ان کا التزام کرتے ہیں۔" ہاں اگر حُسنِ اتفاق سے کبھی کوئی ایسا مناسب لفظ سوجھ گیا جس سے معنی مقصود میں کچھ خلل واقع نہ ہو اور بیان میں زیادہ حُسن پیدا ہو جائے" تو ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیئے۔ پھر فرماتے ہیں۔

"کھانے کی اصل خوبی یہ ہے کہ لذیذ ہو، مفید ہو، جُزوِ بدن بننے کے لائق ہو، بو باس اور رنگ و روپ بھی اچھا رکھتا ہو۔ اگر باوجود ان سب باتوں کے چینی کے باسنوں میں کھایا جائے تو اور بھی بہتر ہے۔ یہی حال شعر کا ہے۔ شعر کی اصل خوبی یہ ہے کہ نیچرل ہو، موثر ہو، لفظاً اور معنیً سانچہ میں ڈھلا ہو۔ اگر اس کے ساتھ کوئی لفظی رعایت بھی اس میں پائی جائے تو اور بہتر ہے۔ ورنہ اس کی کچھ ضرورت نہیں۔"

"صنعتِ الفاظ نے ہماری شاعری بلکہ ہمارے تمام لٹریچر کو بے انتہا صدمہ پہنچایا ہے .... جس طرح عجائبِ قدرت کی تعظیم ہوتے ہوتے آخر کار دنیا میں عجائب پرستی ہونے لگی اور خدا کا خیال جاتا رہا، اسی طرح ہمارے لٹریچر میں صنائعِ لفظی کی کے بڑھتے بڑھتے آخر کار محض الفاظ پرستی باقی رہ گئی اور معنی کا خیال بالکل جاتا رہا۔"

(مقدمہ صفحہ ۶۵-۶۴)

کلام کی خارجی ہیئت اور تمام نوک پلک۔ اس غرض کے لیے ہونی چاہیئے کہ روحِ کلام کی تجلی کامل طور پر ظاہر ہو سکے۔ اگر بدن تجلیِ روح میں خارج ہو

تو مقصدِ اصلی فوت ہو جاتا ہے۔ اور کلام محض جسد بے روح ہو کر رہ جاتا ہے۔ شعر میں سنگلاخ زمینوں کا استعمال کرنے والے وہی بد توفیق بگڑے کاریگر ہوتے ہیں جو "شاعری کا مآل محض قافیہ پیمائی سمجھتے ہیں اور بس"

(مقدمہ صفحہ ۱۶۶)

ایسے لوگ کلام کا جنازہ بڑے دھوم سے اٹھاتے ہیں۔ اور بڑی عرق ریزی سے زبان و فن کی گورکنی کرتے ہیں۔

حالی مفکر، ناقد اور فن کار تھے۔ قبل اس کے کہ میں اس امر کا جائزہ لوں کہ انھوں نے کس حد تک اپنے لسانی اور ادبی نظریوں پر خود عمل کیا ہے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حالی کے تفصیلی مطالعہ کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ جناب کلیم الدین احمد نے اُن کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ یہ کہنا شدید قسم کی انتہا پسندی ہے کہ "شعر و شاعری کی اہمیت کا صحیح اندازہ حالی کے بس کی بات نہیں" اور اُن کے "خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی غور و فکر ناکافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط۔ یہ تھی حالی کی کائنات۔"

(اردو تنقید پر ایک نظر، جدید ایڈیشن مطبوعہ ادارہ فروغ اردو۔ لکھنؤ صفحہ ۱۰۹، ۸۸)

حالی کی تحریروں میں نقائص ہیں، اُن کے مطالب میں بھی جا بجا رسائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود حالی نے زبان و فن کے متعلق اتنی ضروری اور گہری باتیں لکھی ہیں کہ اُن کی قدر نہ کرنی زیادتی ہے۔ حالی کی شخصیت ہرگز اوسط قسم کی نہ تھی اور نہ دماغ و دل معمولی تھے۔ اُن کی نظر خاصی

گہری تھی۔ کلیم صاحب نے حالی کی خوبیوں کا یا تو تذکرہ ہی نہیں کیا یا محض سرسری طور پر صرف اُن کی تاریخی اہمیت کو نیم نگاہی سے دیکھتے ہوئے گزر گئے ہیں۔ یہ باتیں ناقدانہ توازن اور انصاف کے خلاف ہیں۔ بت شکنی اور کعبہ کو بتوں سے پاک کرنا اور بات ہے اور انہدام حرم اور سلامت روی کا تقاضا یہ ہے کہ خوبیوں کو بھی اُسی انداز میں پیش کیا جائے جس طرح خامیوں کو پیش کیا گیا ہو۔ حالی کی میانہ روی سے ہی یہ سبق سیکھا جا سکتا تھا۔

حالی

حالی ایک ایماندار ہنرمند تھے۔ اُن کے قول و فعل میں بڑی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی نثر و نظم کی تخلیق حتی الوسع اپنے لسانی اور فنی نظریوں کے مطابق کی ہے۔

حالی نے اُردو کی لسانی ترکیب اور مزاج کے متعلق جو تحقیق کی تھی اور اُس کی وُسعت کے بارے میں جو خیالات پیش کئے تھے انھیں کا لحاظ رکھتے ہوئے آپ نے اپنی طرزِ نگارش اور اسلوبِ اظہار کو ڈھالا۔ انھوں نے گران بار فارسی اور عربی ترکیبوں اور الفاظ سے عموماً اجتناب کیا۔ عام کھڑی بولی کے لفظوں کے برتاؤ کے علاوہ انھوں نے اور ہندی شبدوں کا استعمال بھی جا بجا کیا۔ مثلاً جنم بھوم، اوگھٹ، گھاٹی، بانا، ناٹک، سنسار، کرپا، میگھ، بَن، برکھا، دھیان، دیس بھید، پل، بن باس، جُگ، بپتا، پُن، پاپ، دکھن وغیرہ۔ اردو کے دامن کو وسیع اور زمانہ کے مطابق بنانے کے لئے حالی نے انگریزی

الفاظ بھی سلیقے سے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً گریڈ، ریمارک، سمپل، آرٹکل، نیشن، نیچر، نیچرل، مورل، آرٹیکل، لائف، ایمجنیشن، لٹریچر، لٹریری ریویو، اسپیچ، ورنکلر، رپورٹ، گورنمنٹ، لوکل، نیشن، ممبر، ایجکیشن، کمیشن، کمیٹی، سوسائٹی، سائنٹیفک، پولیٹیکل، اسپیکر، ڈائٹر، سیویلائزیشن، ڈکشنری، پمفلٹ، اسٹاف، فنڈ، سلف ہلپ، ما، بورڈنگ، سسٹم، ٹکنیکل، کلاس، اسکول، کالج، بائیاگرفی، سلف رسپکٹ، کریٹیکل، ہیرو وغیرہ۔

اگر حالی نے اسلوب بیان میں سادگی کو سراہا ہے تو خود بھی سادہ طرز میں نثر نگاری اور شاعری کی ہے۔ انھوں نے نثر میں مقفی انداز بھی برتا ہے مگر سادگی کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ملاحظہ ہو۔

"زمانہ کی نیرنگیاں مشہور اور اس کی تلون مزاجیاں ضرب المثل ہیں۔ وہ سدا ایک حال پر نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ ایک چال پر نہیں چلتا ...... جب وہ دن کا بانا بدلتا ہے تو دات کے سارے عمل باطل کر دیتا ہے، سوتوں کو نیند سے جگاتا ہے۔ نکموں کو کام پر لگاتا ہے...... جفاکشوں کو بستر راحت کی طرف کھینچ کر لاتا ہے......."

(زمانہ۔ مقالات ح صـ ۲۳)

"......... کبھی تو ایک ساحر فسون ساز ہے جس کے سحر کا نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک افعی جان گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے

غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی۔" اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔ (زبان گویا مقالات ح ا ص ۲۰۵

حالی نے لفظی اور معنوی صنعتوں کو کبھی بھی محض ان کی خاطر استعمال نہیں کیا صنعتیں راہ ہیں، منزل نہیں، ذریعہ ہیں مقصد نہیں۔ بات یہ کہ حالی نے صنائع و بدائع کی بھرمار نہیں کی۔ عبارت آرائی میں تنوع اور لچک پیدا کی ہے گنجائش و زیبائش سے انھیں احتراز رہا۔ اُن کے اسلوب کا نثری ترنم بہت خوشگوار، خوش رفتار، نرم، مدھم اور مدھر ہے۔ وہ کسی مسطح مرغزار کے شفاف چشمے کی طرح روان ہے۔ اُس میں آبشار کہستان کی سرمستی نہیں رفتہ رفتہ حالی کا اسلوب گنگا کی طرح پاٹ دار، گہرا اور گمبھیر ہو گیا۔ حیات جاوید میں حالی کی نثر نہایت سجل، متوازن، سلیس، رواں اور پرتاثیر ہو گئی ہے۔

حالی کی نثر کی بنیادی قماش تو ایک رہتی ہے مگر اس میں موضوعات کے لحاظ سے نیرنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ انشائیوں کا رنگ کچھ اور رہے اور سنجیدہ مقالات کا طور کچھ اور۔ سوانح عمریوں کا انداز جدا ہے اور تنقید کی انشا مختلف۔ با این ہمہ تنوع حالی کی آواز اور شخصیت کا سراغ ہر صنف سخن میں مل جاتا ہے۔

حالی کو یہ احساس تھا کہ اردو میں تمثیل کا عنصر نہایت ہی کم یاب ہے،

فرماتے ہیں: "اردو شعراء نے تمثیل کو بہت کم برتا ہے۔ البتہ نئی طرز کی شاعری میں اس کا کچھ کچھ رواج ہوتا چلا ہے"

(مقدمہ صفحہ ۱۵۵)

حالی نے خود اپنی نثر و نظم میں استعارہ و تمثیل کو کامیابی کے ساتھ برتا ہے ان کی نثر میں کبھی کبھی انجیل مقدس و قرآن شریف کے تمثیلی طرز کی پیروی ملتی ہے۔ استعارہ و تمثیل سے زبان میں دل کشی پیدا ہو جاتی ہے اور نقوش اثر گہرے پڑتے ہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں۔

"اس باغ میں پت جھڑ شروع ہو گئی تھی، کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ مگر جو باقی تھے...... وہ بھی ایسے تھے کہ نہ صرف دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا، کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچہ بدل گیا، اور جس ہوا میں انھوں نے نشو و نما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی"

(یادگار غالب دیباچہ صفحہ ۱۰۲)

"..... زمانہ کی یہ تمام قدردانی اس پر زوال کی سی قدردانی تھی جو ایک سوت کی انٹی لیکر یوسف کی خریداری کو مصر کے بازار میں آئی تھی۔ سچ یہ ہے کہ مرزا کی قدر جیسی کہ چاہیئے یا جلال الدین اکبر کرتا یا جہانگیر و شاہجہان"

(یادگار غالب دیباچہ صفحہ ۲،۱۳)۔

"مبارک ہیں وہ جنھوں نے اس کے تیور پہچانے اور اس کی چال ڈھال کو نگاہ میں رکھا۔ جدھر کو وہ چلا اس کے ساتھ ہو لیئے اور جدھر سے اس نے

رُخ پھیرا اُس کے ساتھ پھر گئے۔ گرمی میں گرمی کا سامان کیا اور جاڑے میں جاڑے کی تیاری کی۔ دن کو دن کی طرح بسر کیا اور رات کو رات کی طرح کاٹا۔ اور بدنصیب ہیں وہ جنھوں نے اس کی پیروی سے جی چرایا اور اُسکی ہمراہی سے ناک چڑھائی۔ گرمی پڑنے پر انھوں نے جاڑے کے کپڑے نہ اتارے اور ہلکے پھلکے نہ بنے۔ دن نکلا پر انھوں نے کروٹ نہ بدلی اور خواب نشینہ سے بیدار نہ ہوئے اور اب وہ بہت جلد دیکھیں گے کہ پیچھے کون رہا اور منزل تک کون پہنچا۔"

(زمانہ، صہ۲۳۰-۲۳۴، مقالات ح ۱)

حاؔلی کی کامیاب، صحت مند، پر قوت اور پرتاثیر نثر کی اہمیت کلیم الدین احمد صاحب نے بھی تسلیم کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"......ان کی نثر بلند پایہ ہے......" (صہ۸۷، اردو تنقید پر ایک نظر)

"ادبی نقطۂ نظر سے اگر کوئی چیز دائمی ہے تو وہ شاعری نہیں، تنقید بھی نہیں حاؔلی کی نثر ہے۔" (صہ۱۱۱) کلیم نے حاؔلی کی نثر کو "بے مثل نثر" بھی کہا ہے۔

اب میں ایک، دو مثالیں حاؔلی کی نظم سے پیش کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں، کیونکہ نہ تو حاؔلی کا فن میرا موضوع ہے اور نہ اُن کی تنقید۔ میں نے مسئلہ زبان کے متعلق حاؔلی کے خیالات کی وضاحت کرنیکی حتی المقدور کوشش کی اور یہ دکھلایا ہے کہ اُن کا عمل اُن کے قول کے مطابق رہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سن لو!
کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سن لو

افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں
چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سن لو

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی
کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پہ اتنا نہ رگڑ
دھبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

شعر میں بھی حالی نے فارسی، ہندی اور انگریزی الفاظ کو برتا ہے اب حالی کی سادہ کاری اور سہل ممتنع دیکھیے۔

برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا
ہے ابر کی فوج آگے آگے
اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
ہیں رنگ برنگ کے رسالے
گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی
اک آتی ہے فوج ایک جاتی
جاتے ہیں مہم پہ کوئی جانے
ہمراہ ہیں لاکھوں توپخانے
توپوں کی ہے جب کہ باڑھ چلتی
چھاتی ہے زمین کی دہلتی
مینہ کا ہے زمین پر ڈیرا
گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
بجلی ہے کبھی جو کوند جاتی
آنکھوں میں ہے روشنی سی آتی
گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں

(مجموعہ نظم حالی، صفحہ، برکھا رت)

حالی کی اہمیت مسلّمہ زبان کے ماہر کی حیثیت سے ہمیشہ قائم رہے گی اور
[illegible]

مولانا حاؔلی بحیثیت شاعر

یہ مضمون ایک انگریزی مضمون کے مکمل ترا سے سے سنہ ۱۹۴۰ء میں
اردو میں منتقل کیا گیا تھا اب نہ تو مضمون نگار کا نام یاد رہ گیا ہے
نہ یہ کہ اصل مضمون کب لکھا گیا تھا۔ ظنِ غالب ہے کہ ترجمہ کرتے
وقت بھی یہ مضمون ۱۰-۱۵ سال اُدھر کسی رسالے میں شائع ہوا تھا۔

کلب مصطفیٰ ۱۴ ۷/۵۶ء

موجودہ اردو جن حضرات کی ہمیشہ کے لئے ممنونِ کرم رہے گی ان میں شمس العلماء مولانا الطاف حسین حاؔلی کا نام نامی باعتبارِ امتیاز کسی سے کم نہیں۔

اُردو نظم کو نکھارنے اور سنوارنے اور کثافتوں سے پاک کرنے کے دشوار فرض کو اپنے ذمے عائد کر لینے کے بعد سے حاؔلی نے اردو نظم کو تخیل اور طرز ادا دونوں اعتبار سے زیادہ بلند اور دلکش بنا دیا۔ اردو نثر میں بھی ان کی یادگار تصنیف ہیں انھوں نے ایسی کتابیں لکھیں جو اردو ادب میں ایک بیش بہا اضافے کا مرتبہ رکھتی ہیں اور مدتوں یادگار رہیں گی۔ ادبی تنقید کے تو وہ مانے ہوئے استاد تھے۔

ان کی ادبی تنقید نے ادبی نشاطِ شعر کے بلند نظر طلب گاروں اور خواہش مندوں کی برابر رہبری کی اور کرتی رہے گی۔

مولانا الطاف حسین ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے اور وہیں ۱۹۱۴ء میں ستتر برس کی عمر میں انتقال فرمایا اور اپنے وطن ہی میں جس سے ان کو بڑی محبت تھی اور جو صدیوں سے ان کے آباء و اجداد کا مولد و مدفن تھا، دفن ہوئے۔

نواب عماد الدین بلگرامی کی فرمائش پر جو ایک مختصر سی کتاب اپنے سوانحِ زندگی پر مشتمل مولانا حالی نے تیار کی تھی اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انصاری خاندان جس سے حضرت حالی کو تعلقِ نسبی تھا پانی پت میں سات سو سال سے آباد ہے۔

خواجہ ملک علی جن کا شمار اپنے عہد کے ممتاز اہلِ علم و فضل میں تھا، حالی کے جدِ اعلیٰ تھے۔ یہ غیاث الدین بلبن کے عہدِ حکومت میں ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ بادشاہ نے پرگنہ پانی پت کے چند زرخیز گاؤں خواجہ صاحب کو بطور جاگیر یا وظیفہ عطا کئے۔ اور ان کو وہاں کا قاضی بھی مقرر کیا۔ باپ کی طرف سے اُن کا سلسلہ خواجہ ملک علی تک پہونچتا ہے اور ماں کی طرف سے ان کا شجرہ ایک شریف سید خاندان سے ملتا ہے۔

مولانا حالی کی ابتدائی عمر آلام و مصائب کے ہجوم میں گزری۔ ولادت کے بعد ہی مولانا کی والدہ[۱] کا دماغ خراب ہوگیا۔ اور یہ ابھی نو ہی برس کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ اور بھائی بہن کے علاوہ اُن کا کوئی پرسانِ حال اور

۱؎ ایک چھوٹی سی کتاب "حیاتِ حالی" میں لکھا ہے کہ حالی کے والد پاگل ہو گئے تھے اور جب اُنکی ماں کا انتقال ہوا تو ان کی عمر دو سال کی تھی لیکن حقیقت اسکے خلاف ہے۔ جیسا اوپر درج ہوا۔

خبر گیر نہ رہ گیا۔ مذہبی گھرانے میں پیدا ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے انھیں قرآن شریف پڑھایا گیا۔ اور پھر فارسی عربی شروع کرائی گئی۔ مگر انکی تعلیم اُس زمانے کے دستور اور رواج کے مطابق بھی مکمل نہ ہو سکی۔ سید جعفر علی فارسی میں ان کے اُستاد اوّل تھے۔ انھوں نے اس زبان کی ابتدائی تعلیم اچھی خاصی دی۔ اس کے بعد مولوی ابراہیم حسین صاحب انصاری سے، جو اس زمانے میں لکھنؤ آگئے تھے انھوں نے عربی پڑھی لیکن ان کی عمر مشکل سے ۱۷ سال کی تھی کہ شادی کے لئے بھائی بہن کا اصرار ہوا۔ مولانا چونکہ اپنے بھائی بہن کا اتنا ہی پاس لحاظ کرتے تھے جتنا اپنے باپ کا احترام کرتے اگر وہ زندہ ہوتے، لہٰذا ان کے اصرار پر اپنی رضامندی تو دے دی۔ مگر ان کی یہ رضامندی بخوشی نہیں گویا بالجبر تھی۔ وہ علم کے والہ وشیدا تھے اور شادی کو حصولِ علم کے لئے ایک بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے بہرحال شادی کے بعد یہ یقین کرکے کہ اُن کی بیوی کے والدین خوش حال ہیں اور اپنی لڑکی کے مصارف سال بھر کے لئے برداشت کر سکتے ہیں وہ پانی پت سے دہلی چل کھڑے ہوئے اور وہاں اپنے عہد کے مشہور مُسلم اور واعظ مولوی نوازش علی صاحب سے تقریباً ڈیڑھ سال تک درس لیتے رہے۔ اس وقت دلّی کالج اپنے عروج کے شباب پر تھا۔ اور حالی کے چند ہونے والے ہم عصر مولوی نذیر احمد اور منشی ذکاءاللہ وہاں تعلیم پا رہے تھے۔ لیکن حالیؔ جانتے تھے کہ اُن کے پانی پتی اعزا قدامت پسند ہیں اور وہ کسی قسم کی مغربی تعلیم کو روا نہ رکھیں گے۔ لہٰذا انھوں نے اس کالج میں داخلہ نہ لیا۔

خود حالیؔ کہتے ہیں کہ اس زمانے کے مسلمان علما انگریزی مدرسوں کو بڑی

حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور ان کو "بجلا" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس طرح علوم مغربی کی تعلیم سے محروم رہ کر وہ اپنا وقت علوم مشرقی میں صرف کر رہے تھے کہ پھر خلل پڑ گیا۔ یعنی ان کے اعزا ان کا پتہ لگانے میں کامیاب ہو گئے اور گھر واپس آنے پر مُصر ہوئے حتیٰ کہ ۱۸۵۵ء میں وہ ان کو پانی پت بلانے میں کامیاب ہو گئے وطن کی یہ پھری بازگشت حالی پر ایک بڑا ظلم تھا پھر بھی انھوں نے سال بھر یا اس سے کچھ زائد مدت تک بطور خود اپنا شغل تحصیل و مطالعہ جاری رکھا۔ اور پھر وہی اعزا کے اصرار سے مجبور ہو ۱۸۵۶ء میں انھوں نے نوکری کر لی اور کلکٹر حصار کے دفتر میں ایک چھوٹی سی اسامی ان کو مل گئی۔ مگر ابھی سال ہی بھر کام کیا تھا کہ غدر ہو گیا اور یہ حصار سے پانی پت چلے گئے یہاں چار سال تک اپنی تعلیم جاری رکھنے کے علاوہ انھوں نے کوئی کام نہیں کیا۔ کوئی اور کام تھا ہی نہیں جو کرتے! ایسے حالات اور ایسے ماحول میں اپنے ذوق و شوق اور حوصلہ و خواہش کے بقدر تو دریائے علم سے سیراب نہ ہو سکے مگر کلیتاً تشنہ بھی نہ رہے اور ان کو عربی فارسی کا اچھا خاصا جاننے والا کہا جا سکتا ہے۔

چونکہ اس زمانے میں شعر کہنا ایک قسم کا امتیاز سمجھا جاتا تھا لہٰذا حالی نے پانی پت کے اپنے قیام کے دوران میں عربی و فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن دہلی جانے اور غالب سے ملنے کے قبل تک خود ان کو اپنی اس استعداد و صلاحیت کا احساس نہ تھا جو بحیثیت شاعری درجہ امتیاز حاصل کرنے کی ان میں تھی۔ دلی کے پہلے قیام میں وہ غالب سے واقف ہوئے تھے

اور جب ان سے ملنے جاتے تھے تو ان سے فارسی اردو زبانوں کے مشکل شعروں کا مطلب اُن سے دریافت کرتے تھے۔ اس طور پر غالب کو محسوس ہوا کہ حالی کو شعر کا اچھا ذوق ہے اور انھوں نے ان کو شعر گوئی کا مشورہ یہ کہہ کے دیا کہ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو یہ ان کے فطری رجحان طبع کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوگی۔ غالب ایسے بلند پایہ شاعر کی توجہ دہانی کے بعد حالی نے ایک آدھ غزلیں دلی میں بھی کہیں مگر دلی میں اُن کی مشق کچھ زیادہ بڑھی نہیں۔ البتہ جب غدر کے بعد پانی پت کی بے کیفی اور جابر زندگی سے تنگ آ کر سات آٹھ سال تک ان کا قیام نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رئیس جہانگیر آباد ضلع بلند شہر کی رفاقت میں ان کے یہاں رہا تو ان کو شعر گوئی کے لئے نہایت موزوں ماحول مل گیا۔

شیفتہ خود ایک مشہور اور ممتاز شاعر تھے اور فارسی میں حسرتی اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے۔ پہلے مومن کے شاگرد تھے ان کے انتقال کے بعد غالب کو اپنا کلام دکھانے اور ان سے اصلاح لینے لگے۔ تو شیفتہ کی رفاقت اور اُن کی خوشگوار صحبت مدام اور فیض بخش صحبت سے متاثر ہو کر حالی کو اپنے خصوصیات کے بروئے کار لانے کا خوب موقع ملا۔ اور ان کی فطری صلاحیتوں کے جوہر کھلے۔ حالی نے اپنی اور شیفتہ کی غزلوں کو غالب کے پاس بھیجنا شروع کیا۔

مگر وہ خود فرماتے ہیں کہ ان کے کلام کا ارتقا غالب کی اصلاح کا اتنا رہین منت نہیں ہے جتنا شیفتہ کی صحبت کا۔ شیفتہ کے فیض صحبت اور ذوقِ سلیم نے حالی کے کلام میں کچھ ایسی خصوصیتیں پیدا کر دی تھیں جو آخر کار

حالی کا طرۂ امتیاز بن گئیں۔ شیفتہ کو مبالغہ آمیز باتیں پسند نہ تھیں اور وہ تحریر میں سچی اور فطری خاکہ کشی کے قائل تھے وہ سچے اور سادہ واقعات کو طرزِ ادا سے دلکش بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن کے خیالات اور رجحانات نے حالی پر گہرا اور دیرپا اثر ڈالا۔ اور آخر کار ان کا مطمعِ نظر بھی یہی ہو گیا حتیٰ کہ انھوں نے شیفتہ کے قول کو عملی جامہ پہنا دیا۔

شیفتہ کے انتقال کے بعد جب حالی نے لاہور میں پنجاب کی سرکاری بک ڈپو (پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو) میں نوکری کر لی اور وہاں سرشتہ تعلیم کیلئے انگریزی کتابوں کے جو ترجمے اردو میں شائع ہوتے تھے ان کی نظر ثانی کی خدمت ان کے سپرد ہوئی تو وہ دلنشین اور سادہ طرز بیان جو جہانگیر آباد کے قیام میں انکے دل و دماغ پر حاوی ہو گیا تھا اور بھی بروئے کار رہا انگریزی تحریروں کے اسلوب بیان کی مسلم سادگی اور دل آویزی کا اثر ان پر اس درجہ پڑا کہ معمولی قسم کی فارسی کتابیں انکی نظروں سے گر گئیں۔ یہ خدمت انھوں نے چار برس تک انجام دی۔ اور یہاں کے تجربے اُن کی آئندہ زندگی میں بہت مفید ثابت ہوئے۔ اس کام نے اُن کو مغرب کے بہترین ادب سے روشناس کرا دیا جس کی ان کو سخت ضرورت تھی۔ اور اسی کام نے تمام وہ انگریزی ادب پڑھ ڈالنے کا شوق ان میں پیدا کر دیا جس کا ترجمے کے ذریعے سے پڑھا جانا ممکن تھا۔ وہ اکثر انگریزی داں نوجوانوں سے انگریزی کتابوں کے ترجمے سُنا کرتے تھے۔ انگریزی ادب سے اُن کا یہ ضمنی لگاؤ ان کی ادبی زندگی میں ایک انقلابی نقطہ تھا جس سے اُن کے خیالات کو ایک نئی راہ مل گئی۔ ان کے لاہور کے قیام کے زمانے میں اردو کے ایک بڑے سرپرست کرنل رو اِنڈ

(COL. HOLROYD) سابق ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیم کی خواہش پر مولانا محمد حسین آزاد نے شاعرانہ اور ادیبانہ مقابلے کے لئے ایک انجمن لاہور میں قائم کی تھی۔ حالی بھی مقابلوں میں شریک ہوتے اور حصہ لیتے تھے۔ ان کی اوائل کی چار نظمیں "برسات" "امید" "رحم و انصاف" اور "حبِ وطن" جن کی بدولت حالی اردو نظم میں ایک نئے طرز کے موجد کی حیثیت سے روشناس اور مشہور ہوئے اسی انجمن کے لئے کہی گئی تھیں۔

گو لاہور میں حالی کا وقت مفید کاموں اور مشغلوں میں صرف ہوتا رہا مگر وہ لاہور میں خوش نہیں رہے۔ وہ شیفتہ کے ساتھ قیام کے دوران میں دلی سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے اور اس کے والہ و شیدا ہی نہ تھے دلی پر جان دیتے تھے۔ اور ادبی ذوق رکھنے والے بزرگوں کا جمگھٹا جو اس وقت دلی میں تھا اس کے مقابلے میں لاہور کی صحبتوں کو بہت حقیر سمجھتے تھے۔ اجنبی اور نوارد ہونے کی وجہ سے لاہور میں ان کا کوئی دوست بھی نہ تھا۔ اس پر طرّہ یہ یہ ہوا کہ ان کے قیام لاہور کے دوران میں ایک وبا پھیلی جس میں یہ بھی بتلا کر دئیے گئے انھوں نے چند شعر لاہور کی مذمت میں کہے جس میں اس شہر کو حقیر اور غیر مہماں نواز کہا ہے۔ یہ شعر دیوان حالی میں موجود ہیں۔ مگر اُن کے نیچے حاشیہ میں ان اشعار کی شان نزول درج ہے۔ یہ حاشیہ میرے نزدیک اعتذار کی حیثیت رکھتا ہے ممکن ہے شاعر کو بعد میں محسوس ہوا ہو کہ لاہور اس تمام بُرائی کا مورد نہیں ہے جو کی گئی تھی۔ آخر کار حالی کی یہ خواہش پوری ہوئی اور وہ اینگلو عربک اسکول کے مدرس کی حیثیت سے دلی پہونچ گئے۔ دلی میں بھی انھوں نے

ایک آدھ نظمیں لاہور کی نظموں کے انداز میں کہیں سرسید احمد خاں کو ان کے طرز بیان میں پرانے غزل گویوں کے اسلوب بیان سے ایک قطعی علیحدگی کا انداز نظر آیا اور انھوں نے اسے قابل قدر ترقی کا پیش خیمہ قرار دیا۔

حالی سے مسلمانوں کی گری ہوئی حالت پر ایک نظم کی فرمائش کی۔ اس فرمائش نے شاعر کے دل و دماغ کیلیے برقی رو کا کام کیا اور حالی نے اس خیال کو مسدس "مد و جزر اسلام" جیسی انقلابی نظم کی شکل میں پیش کر دیا۔ اس نظم سے اردو نظم کے متعلق لوگوں کے خیال بدل گئے۔ اس نے حالی کو اپنے ہم عصروں کے لئے سبب رشک بنا دیا۔ ان کی نظم کے بعد بہتوں نے مسدس کی نقل کی مگر حالی کی تخئیل اور طرز ادا کو کوئی نہ پہونچ سکا۔ اس مسدس نے یوں تو سبھی سے خراج تحسین حاصل کیا مگر جب سرسید احمد خاں کو اس نظم کا ایک مطبوعہ نسخہ ملا تو اس کی جو تعریف انھوں نے کی وہ تمام تعریفوں سے بڑھ چڑھ کے تھی۔ انھوں نے اس کتاب کی رسید میں جو خط حالی کو لکھا تھا اور جس کی ایک نقل خوش قسمتی سے مجھے چند سال ہوئے مل گئی تھی دیکھنے کے قابل ہے۔

اس خط میں انھوں نے مسدس کے متعلق اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے:

"مجھے آپ کا خط مع مسدس کی ایک نقل کے ملا جس وقت میں نے اس کتاب کو پڑھنا شروع کیا برابر پڑھتا ہی رہا اور ختم ہی کر کے رکھا جب ختم ہو گئی مجھے اس کے ختم ہو جانے کا افسوس ہوا۔ یہ کہنا بالکل درست ہو گا کہ اس اب سے ہماری شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ صفائی حسنِ ادا

اور روانی کی (جو اس کتاب کے خصوصیات ہیں) زیادہ تعریف کی ضرورت نہیں مگر یہ امر نہایت حیرت خیز ہے کہ ایسے موضوع پر واقعات کا اتنا خیال کر کے مبالغوں اور ان دور از کار تشبیہوں سے بچ کر جو ہماری شاعری کا سرمایۂ حیات ہیں شعر کہے جائیں اور پھر لطف یہ کہ تمام نظم تاثیر، بلندی اور اثر سے اتنی زیادہ پُر اور لبریز ہو۔

اس کے اکثر بند آنکھوں میں آنسو لائے بغیر پڑھے نہیں جا سکتے۔ بات جو دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ جیسا تم نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے یہ سچ ہے کہ میں نے تم کو اس کتاب کے لکھنے کی طرف متوجہ کیا اور میں اسے ایک کار خیر تصور کرتا ہوں۔ جب میں مروں گا اور فرشتے مجھ سے سوال کریں گے کہ میں نے دنیا میں کیا کیا تو میں اس کارنامے کی طرف اشارہ کر کے کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوانے کے علاوہ میں نے اور کچھ نہیں کیا۔ خدا تم کو اس کام کی جزا دے اور یہ کتاب ہماری قوم کے امداد کا زینہ ہے۔ ہماری مسجدوں کے اماموں کو چاہیئے کہ اس کے حصے اپنے وعظ میں پڑھیں۔

میں خلوص کے ساتھ تمہارے اس ارادے کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ تم اس کے حقوق ایم۔اے۔او کالج علی گڑھ کو دینا چاہتے ہو اور اس کی رجسٹری کرانا چاہتے ہو۔ لیکن میں پسند نہیں کرتا کہ اس کی اشاعت میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالی جائے۔ کیونکہ یہ ہماری قوم کی سچی حالت کا آئینہ دار ہے اور اسکی پستی کا مرثیہ۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر اس کی اشاعت زیادہ سے زیادہ

تعداد میں ہو اور یہ اتنی مقبول ہو جائے کہ لڑکے اسے ڈنڈوں کے ساتھ، طوائفیں باجوں کے ساتھ گائیں۔ اور مرد قوالی فقیروں اور بزرگوں کے مزاروں پر پڑھیں اس طرح کہ اہل دل کو حال آجائے :"

حالی نے مسدس کے بعد اس قسم کی اور بھی نظمیں لکھیں اس میں سے بعض کا درجہ بس مسدس ہی کے بعد ہے۔ مثلاً "شکوہ ہند" "قصیدۂ صفاریہ" جی چاہتا تھا کہ ان کے کچھ اقتباسات پیش کئے جائیں مگر میں ایسا نہ کروں گا کیونکہ یہ نظمیں کافی مشہور ہیں۔ بس اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ مسدس کی اشاعت کے بعد سے حالی کا یہی کام ہو گیا کہ وہ اسلام کے شاندار ماضی کے متعلق نظمیں کہیں اور پڑھیں اور اس طرح مسلمانوں کو اپنے آباء و اجداد کا چلن اختیار کرنے کی ترغیب دیں۔ حکیم محمود خاں دہلوی کا جو مرثیہ حالی نے کہا ہے۔ اس میں انھوں نے اس کام کی طرف بڑے موثر انداز میں اشارہ کیا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد جب حالی نے محسوس کیا کہ ان کی یہ دماغی کاوشیں مسلمانوں کو چونکا دینے کے ساتھ ساتھ ان میں ایک مجہول جذبۂ تفاخر بھی پیدا کر رہی ہیں اور وہ مستقبل پر نظر کرنے کے بجائے ماضی کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگے ہیں تو انھوں نے مسلمانوں کو اُن کے موجودہ فرائض کیطرف نہایت دلکش اور موثر انداز میں متوجہ کرنا شروع کیا اور اچھے اور برے کام کرنے کی ضرورت پر زیادہ زور دینے لگے۔ زندگی کے آخری دور میں اُن کے کلام میں فلسفیانہ رنگ غالب ہو گیا تھا۔ اُن کی بعد کی نظمیں فلسفے اور جذبات دونوں سے پُر ہیں ترکیب بند موسوم بہ "تحفۃ الاخوان" مثال کے طور پر پیش

کی جا سکتی ہے۔

خود حالیؔ کی زبان سے ان کا کلام سننا ایک نعمت اور ایک نادر اور خوشگوار اتفاق تھا۔ پڑھنے میں ترنم پیدا کرنے یا آواز بلند کرنے کی وہ کوئی کوشش نہ کرتے بلکہ اشعار اُن کی زبان پر آہستہ آہستہ بلا تصنع اور موثر انداز میں جاری ہوتے تھے۔ ہر لفظ صاف۔ واضح اور پُر زور الفاظ میں ادا ہوتا تھا۔ ان کے نمایاں خلوص۔ ان کی مخصوص مزاجی کیفیت اور ان کی پاک زندگی، سُننے والوں پر گہرا اثر ڈالتی تھی۔ اور گو ان کی الہامی آواز سُن سکنے کیلئے بڑی کوشش کرنا پڑتی تھی مگر لوگ پھر بھی ان کا کلام توجہ اور خاموشی سے سنتے تھے۔

حالیؔ کی وہ نظمیں جو اُنھوں نے "رحم" اور "اُمید" جیسے عام موضوع پر کہی تھیں اردو ادب کے تمام شائقین پر یکساں اثر انداز ہوتی تھیں لیکن اسلام کے عروج و زوال کے بارے میں جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ محض مسلمانوں کی دلچسپی کی چیز تھی۔ سر سید احمد خاں سے سابقہ ہونے کے بعد سے ان کے شاعرانہ رجحان نے جو پلٹا لیا گو اس سے اُن کی شہرت خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں میں محدود ہو گئی تھی مگر وہ خود اُن فرائض سے جو اُن پر بحیثیت ایک ہندی کے عاید ہوتے تھے کلیتاً غافل اور بے خبر نہ تھے۔ انھوں نے "مناجات بیوہ" لکھ کر اپنے ہندو بھائیوں سے بھی خوب داد تحسین و آفرین حاصل کی۔ اس نظم میں حالیؔ نے بیواؤں کی جیسی وکالت کی ہے اُس سے بہتر ممکن نہیں۔ ان سب کے آخر کی ایک نظم "حُب وطن" ہندو کی عورتوں کے جذبات کی خوب ترجمانی کرتی ہے۔ یہ نظم ۱۹۰۶ء میں علی گڈھ

ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں پڑھی گئی تھی۔ سید محمد فاروق اپنی کتاب "حیاتِ حالی" میں لکھتے ہیں کہ نظام مرحوم کی تخت نشینی کے چالیسویں جشن کے موقع پر حالی سے جو اُس وقت حیدرآباد میں تھے اپنا کلام پڑھنے کی فرمائش کی گئی تھی۔ مہاراجا سرکشن پرشاد صدرِ جلسہ تھے۔ حالی نے یہ نادر نظم اس ممتاز صحبت میں پڑھی جس کو سُن کر سارے مجمع پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی اور بڑا جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ عام طور پر اُن نظموں کے علاوہ جو ہر طبقے اور ہر فرقے کے پڑھنے والوں کے لئے باعث دلچسپی ہیں حالی نے بہت سی رباعیاں اور قطعے بھی کہے ہیں جن میں عقل اور کام کی بہتیری باتیں عمدہ پیرائے میں آ گئی ہیں۔ رباعیاں گو پہلے دیوان میں شامل نہیں ہیں مگر بعد میں ایک الگ کتاب کی صورت میں شایع ہو کر مقبولیتِ عام حاصل کر چکی ہیں۔ اُن کو جی ای وارڈ صاحب ایم۔ اے (آئی۔ سی۔ ایس) نے انگریزی میں منتقل کیا ہے اور اُن کا یہ ترجمہ ولایت میں شائع ہو چکا ہے نثر میں اس کا ایک ترجمہ پہلے ہی ہو چکا تھا سنا ہے کہ اب ایک اور مغربی عالم "ڈاکٹر اسپونر" جنکا تعلق محکمہ آثار قدیمہ ہند سے ہے حالی کی رباعیوں کا ترجمہ کر رہے ہیں رباعیوں کے علاوہ ان کے قطعات کے بعض حصوں کا ترجمہ بھی ڈاکٹر صاحب انگریزی زبان میں کر رہے ہیں جو عنقریب زبان زد رہیں گے۔

ہندوستان کے اردو شعرا میں حالی کا کیا درجہ ہے اس پر بڑی بحثیں ہو چکی ہیں۔ وہ تجدد پسند انگریزی داں طبقہ جس کو حالی کی ساری اچھائی غزل گویوں کی قدیم راہ کو ترک کر دینے ہی میں نظر آتی ہے، حالی کا بے حد

معروف ہے اور انھیں زمانۂ حال کے اردو شاعروں میں صفِ اول میں جگہ دیتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف قدامت پسند طبقہ حالی کی بہتیری جدتوں کو "ادبی بدعت" سے تعبیر کرتا ہے اور ان کے دہلوی یا لکھنوی نہیں بلکہ پانی پتی ہونے کی وجہ سے اُن کی زبان میں بھی عیب نکالتا ہے۔ شاعری کا لکھنوی دبستان (اسکول) تو اُن کی حیات ہی میں ان کا شدید مخالف تھا۔ ایسے نقادوں کے متعلق خود حالی نے اپنے ایک قطعے میں جس میں ان اعتراضات کی طرف اشارے ہیں جو اُن پر کیے گئے ہیں طنزیہ انداز سے فرمایا ہے۔

حالی کو تو بدنام کیا اس کے وطن نے
پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

مگر حالی کے انتقال کے بعد سے یہ تمام بحثیں ختم ہوتی جا رہی ہیں اور مخصوص ادبی حلقوں میں عام طور پر حالی کو اردو ادب کا محسن قرار دیا جاتا ہے۔

اگر حالی کی نثر نگاری کا جائزہ لیا جائے تو گو زبان اور طرز کے اعتبار سے اُن کی تصنیفیں اوسط درجے سے بہتر ہوتے ہوئے بھی نذیر احمد اور آزاد کے بلند معیار تک نہیں پہونچیں لیکن مغز کے لحاظ سے یقیناً وہ بھی قابلِ قدر ہیں۔ اُن کی نثر نگاری کا تجزیہ چونکہ اس مضمون کے حدود سے باہر ہے لہٰذا اس پر کوئی تبصرہ یہاں نہیں کیا گیا۔

رشید حسن خاں

غزلیات حالی کا جائزہ

مسدس مقدمہ شعر و شاعری اور یادگار غالب کے مصنف حالی کو کون نہیں جانتا۔ لیکن اگر کہا جائے کہ حالی اچھے غزل گو بھی تھے تو بہت سے لوگوں کو تعجب ہوگا۔ حالانکہ تغزل کے اعتبار سے حالی کا ایک خاص مرتبہ ہے اس مضمون میں ان کے کلام سے اس کی کچھ جھلکیاں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالی کا مختصر سا دیوان مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے۔ اس چھوٹے سے دیوان میں جو ان کی مدت العمر کی کمائی ہے۔ حصہ غزلیات میں ان کی ذہنی و اصلاحی تبدیلیوں کے مختلف ادوار کے انعکاسات چشمک زن ہیں۔ ان کی غزلیات کی حقیقی قدر و قیمت متعین کرنے پر ان کے کلام کے مختلف عناصر کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس مجموعے کے حصہ غزلیات کا تجزیہ کرکے مختلف اسالیب اور مختلف ذہنی تبدیلیوں کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اس طرح ان کے کلام کے مختلف عناصر اور ان کے اصلاحی حالات کے اثرات کو سمجھنے اور ان کے زیر سایہ حقیقی قدر و قیمت متعین کرنے میں صحیح مدد ملے گی۔

آج اچھے اچھے ناقد مجبور ہو کر اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ غزل میں دروں بینی، داخلیت اور جذبات میں ڈوب کر بات کہنے کی بڑی اہمیت ہے اس میں جذبے کی فوری عکاسی بنیادی چیز ہے۔ ذہن و قلب کی تہ در تہ گہرائیوں میں جذبات کی لہریں اٹھتی رہتی ہیں شاعر میں اتنی قدرت بیان ہونا چاہیئے کہ وہ ان امواج مضطرب کو خیال کے سانچوں میں ڈھال کر جذبات و احساسات کی قدِ آدم تصویریں بنا سکے۔ جب بھی کسی خیال کو تفصیل کے ساتھ ترتیب و تناسب کی حدوں میں لانے کی کوشش کی جائے گی۔ غزل کے شعر میں تلوار کی تیزی نہیں آئے گی۔ شعر میں وزن و وقار بڑھ جائے گا۔ لیکن نشتریت دور رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جن شعرا نے جذبات و واردات سے ہٹ کر غزل میں موضوعاتی شاعری کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ وہ بلند پایہ شاعر ہونے کے باوصف اچھے غزل گو نہیں ہو سکے اور یہی وجہ ہے کہ جو شاعر اقبال یا غالب کے رنگ میں غزل کہنے کی تقلیدی کوشش کرتے ہیں ان کے یہاں دل دوز تاثیر نہیں ملتی۔ بات کو بہت سوچ سمجھ کر بعض خاص تفصیلات کے ساتھ پہلو دار انداز سے کہنا فن کاری ضرور ہے۔ لیکن اس سے غزل کی وہ بے ساختگی ختم ہو جاتی ہے جس کے لئے اب سے بہت پہلے کہا گیا ہے کہ " از دل خیزد و بر دل نہ ریزد "

حالی کے ساتھ بھی یہی المیہ ہوا۔ ان کی شروع کی غزلیں اثر و تاثیر سے لبریز ہیں۔ وہ ساری صفوحیات جو ایک معیاری اور قدرِ اول کے حقیقی غزل گو شاعر کے یہاں ہونا چاہیئے اس دور کی غزلوں میں موجود ہیں

لیکن وہ جس قدر اصلاحی خیالات سے زیادہ متاثر ہوتے گئے۔ اور یہ خیال ان کے دل میں بیٹھتا گیا کہ زندگی کا صحیح مقصد اصلاح و تبلیغ ہے۔ اسی قدر تغزّل ختم ہوتا گیا۔ ان کی دورِ آخر کی غزلیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ کسی دوسرے شاعر کی کاوشیں ہیں۔

مسدس و مقدمہ دونوں بجائے خود غیر فانی کارنامے ہیں لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ حالی کے یہ دونوں کارنامے ان کی غزلیہ شاعری کے لئے "قاطع اعمار" ثابت ہوئے انھوں نے مقدمے میں قدیم شاعری کی بابت جن مصلحانہ خیالات کا اظہار کیا وہ بجائے خود برحق تھے لیکن ستم یہ ہوا کہ اصلاحی خیالات کے دھندلکے کچھ اس طرح فضائے ذہن پر محیط ہو گئے کہ آخر میں وہ بالکل نصیحت فروش ہو کر رہ گئے سرسید کی مصاحبت نے اس آگ کو اور ہوا دی۔ حالی نے کئی جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ جوانی کی بہاریں ختم ہونے کے بعد کاروبار جوانی سے متعلق باتیں کرنا کارِ عبث ہے۔ لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جذبہ اصلاح سے سرشار ہونے بعد انھوں نے مناسب نہیں سمجھا کہ زبان ان باتوں سے آلودہ کی جائے جو صرف دل باختن و دل سپردن سے متعلق ہوں۔ مسدس جس وقت عوام کے ہاتھ میں پہنچا۔ اس وقت کے ملکی حالات کے سبب سے اس کی دھوم مچ گئی۔ مسدس کے بعض مقامات بے ساختگی و برجستگی کے اعتبار سے بے مثل ہیں۔ اور پھر وہ وقت کی آواز تھی۔ ان چیزوں نے مل کر اس کو بے حد موثر بنا دیا۔ عوام نے جب اس قومی نوحے کو پڑھا تو وہ بھول گئے کہ حالی کی غزلیات بھی ایک چیز ہیں اس طرح جہاں مقدمہ کے مصلحانہ

خیالات نے ذہنی طور پر ان کو ناصحانہ رنگ اختیار کرنے کی طرف مائل کیا وہاں مسدس نے اس حصہ غزلیات کو لوگوں کے ذہنوں سے دور کر دیا جو درحقیقت ان کی شاعری کا گراں بہا سرمایہ ہے جس طرح آج شبلی کی چند اُردو نظموں کا ہی ذکر بار بار آتا ہے اور ان کی فارسی غزلوں سے جو ان کے ذوق کی صحیح ترجمان ہیں عموماً لوگ ناآشنا ہیں۔ اس طرح حالی کو مسدس اور مناجات بیوہ کا شاعر سمجھا جاتا ہے اور خاص خاص لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگ اس بات سے بڑی حد تک ناآشنا ہیں کہ ان کی غزلیں ایک خاص مرتبہ رکھتی ہیں۔

میں اس مضمون میں غزلیات حالی کا تفصیلی جائزہ پیش کروں گا۔ تنقید کا یہ انداز بہت کارآمد ہے کہ شاعر کے منتخب اور نمائندہ حصہ کلام پر تفصیلی نظر ڈالی جائے اور محاسن کلام کو واضح کر کے مرتبہ کا تعین کیا جائے۔ لیکن ابتدائی اور بنیادی طور پر یہ بھی لازم ہے کہ کسی کے سارے کلام کا ایک بار تفصیلی جائزہ لے کر اس کو مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ایک بار قاری مجموعی طور پر ذہن میں ایک خاکہ مرتب کر لے۔ اور پھر اس میں ترتیب خیال سے رنگ آمیزی کر سکے۔ اس طرح گو کام مشکل اور تفصیل طلب ضرور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے شاعر کے پورے سرمائے کو سمجھنے اور اس کے بعض اجزا کو پرکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ذہن میں خلط مبحث کا احتمال کم ہو جاتا ہے۔

دیوان حالی میں کل ۱۱۳ غزلیں ہیں۔ جن میں قدیم و جدید کا امتیاز بہ آسانی کیا جا سکتا ہے جدید غزلیں تعداد میں زیادہ ہیں۔ کل غزلوں کو

چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

وہ غزلیں جو صرف حرف وار ترتیب دیوان کی وجہ سے لکھی گئی ہیں۔ دیوان کی ترتیب قدیم رسم کے مطابق ردیف وار ہے۔ حالی نے اس رسم کو ادا کرنے میں بزرگوں کی روایت کو ملحوظ رکھا ہے۔ کوئی حرف ایسا نہیں ہے جس میں غزل موجود نہ ہو۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان میں سے بیش تر غزلیں ترتیب دیوان کے نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ ان غزلوں کی تعداد ۴۲ ہے۔ جن میں تقریباً دو سو اشعار ہیں۔ ان دو سو شعروں میں مشکل سے ۱۵ شعر ایسے جن کو گوارا کیا جا سکے ورنہ سب میں وہی رسمیت نمایاں ہے گویا حصۂ غزلیات کا تقریباً چوتھائی حصہ اس رسم پرستی کی نذر ہو گیا ہے۔

غزلیات کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں تغزل کے بجائے قومی تاثرات غالب ہیں چونکہ یہ دل کی آواز ہے لہذا کسک ضرور ہے۔ حالی جب قدیم رنگ تغزل سے ہٹے تو اس رنگ میں کہنے لگے۔ تاثیر کا رنگ اڑتے اڑتے اڑتا ہے۔ چونکہ اس رنگ اور پہلے رنگ میں زیادہ فصل نہیں تھا اس بنا پر ان غزلوں میں جگہ جگہ وہ شرارے مل جاتے ہیں، جو تغزل کی جان ہیں اس رنگ کی ایک غزل کا اقتباس دیکھئے

ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کئے بغیر	دام اٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کئے بغیر
بگڑی ہوئی بہت ہے کچھ اس باغ کی ہوا	یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کئے بغیر
گو ہے تند و تلخ یہ ساقی ہے دلربا	اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کئے بغیر
تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے دہر کی	چھوڑے گا وقت انھیں نہ مسلماں کئے بغیر

حالیؔ کٹے گا کاٹنے ہی سے یہ بے ستوں
حل ہوں گی مشکلیں نہ یہ آساں کئے بغیر

ایسی غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اصلاحی پہلو کے بجائے مرثیت کا رنگ غالب ہے۔ قوم کو مخاطب کیا گیا ہے۔ لیکن خطیب یا نصیحت گو کی حیثیت سے نہیں بس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص ماضی کی سربلندیوں کو یاد دلا کر دلوں میں گداز پیدا کر رہا ہے۔ اور خود اس کا دل بھی اس گداز سے لبریز ہے حالیؔ درحقیقت داستان ماضی دہرا کر لوگوں کو رلانے کے لئے سب سے زیادہ موزوں تھے مسدس کی کامیابی کا یہی راز ہے۔ ان کا دل نہایت نرم تھا۔ اس میں قوم کی تباہ حالی نے سوز و گداز کی دولت بھر دی تھی۔ اس لئے جب وہ قوم کے حال پر آنسو بہاتے تھے اس وقت ان کے لفظ لفظ سے وہ درد ٹپکتا تھا جو صداقت کی دلیل ہوتا ہے اس حصہ کے کچھ اور شعر دیکھئے ؎

ہے وقت اجل اور وہی عشرت کے ہیں ساماں
آخر ہوئی رات اور ابھی شام ہے گویا

راحت کا جہاں میں یونہی اک نام ہے گویا
راحت کی تلاش اک طمع خام ہے گویا

رستے میں گر نہ ٹھہرے تو تم بھی جا ملو گے
گذرا ابھی ہے یہاں سے خیل و حشم تمہارا

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو ہمیں ہی
کھولیں گے ہم بھی اک دن گر بند پر تمہارا

خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی ان کی نشانیاں ہیں

فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں

معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا　　یہ تو بتائیں حضرت کچھ کرکے بھی دکھایا

ان اشعار میں لہجے کے اعتبار سے سنجیدگی و متانت ہے مضامین میں پند و وعظ کی پختگی ہے ۔ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی نصیحتیں ہیں اور وہ سارے مصلحانہ خیالات ہیں جو ایک قومی ہم درد کا سرمایہ ہوتے ہیں لیکن ایسا کوئی شعر مشکل سے ملے گا جس کو قدیم غزلیات کے ذخیرے میں شامل کیا جا سکے ۔

۳ - تیسرا حصہ کلام وہ ہے جس میں حالی سر تا سر ناصح کا روپ بھر کر سامنے آتے ہیں ۔ یہاں کی شاعری کا تیسرا دور ہے ۔ اس دور تک آتے آتے رنگ تغزل پورے طور پر ختم ہو چکا تھا اور اس دور اور دور اول میں کافی فصل ہو چکا تھا۔ ادھر وہ ملکی و قومی خیالات کے ساتھ ساتھ اصلاحی خیالات میں غرق ہو چکے تھے ۔ لہذا ان غزلوں میں کوئی اثر اور کیف نہیں ہے یہ دل کی آواز ہے ۔ لیکن ایسی آواز جس میں کوئی ارتعاش نہیں ۔ ان غزلوں میں سنی سنائی پر تصنع باتیں نہیں ملتی ۔ لیکن ان کا طرز ادا اور انداز بیان بالکل بے رنگ اور سپاٹ ہے جس سے تاثیر دور کی آواز ہو کر رہ گئی ہے ۔ ایسی دو غزلوں کے اقتباسات دیکھئے ۔

بڑھاؤ نہ آپس میں الفت زیادہ　　مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

تکلف علامت ہے بیگانگی کی　　نہ ڈالو تکلف کی عادت زیادہ

کرو علم سے اکتساب شرافت　　نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ

جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے　　نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم
پر ہر ایک خوبی میں داغ اک عیب کا پاتے ہیں ہم

خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں
گو کہ دل میں متصل خوف خدا پاتے ہیں ہم

کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمائش کے لئے
پر گنہ چھپ چھپ کر کرتے ہیں مزا پاتے ہیں ہم

ہو کے نادم جرم سے پھر جرم کرتے ہیں ہم وہی
جرم سے گو آپ کو نادم سوا پاتے ہیں ہم

گو بھلائی کر کے ہم جنسوں سے خوش ہوتا ہے دل
نہ نشیں اس میں مگر درد ریا پاتے ہیں ہم

ان غزلوں میں انھوں نے اظہار دل سوزی کے ساتھ ساتھ وعظ بھی کیا ہے دور ماضی یاد دلانے کیساتھ مستقبل کے لئے کچھ نصیحتیں بھی کی ہیں اور اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے کہ محض پند و وعظ نے وہ اثر ختم کر دیا ہے جو قسم دوم کی غزلیات میں ہے۔ حالی قوم کا مرثیہ اچھا لکھ سکتے تھے رجز خوانی یا دل میں گرمی پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس بات کا ثبوت ایک اور طرح بھی ملتا ہے مسدس کے آخر میں ایک حصہ ایسا بھی ہے جس سے قوم کے دل میں رجائیت اور ولولہ پیدا کرنا چاہا ہے۔ لیکن اس حصے کو قبول عام حاصل نہیں ہو سکا۔

۴۔ چوتھا حصہ وہ ہے جس میں معیاری تغزل انتہائی لطافت و پاکیزگی

کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اور اس حقیقی غزل سرائی کے فیض سے حالی کا نام صفِ اول
کے متغزلین کی صف میں محفوظ رہے گا۔ یہی حصہ ان کے کمال کی کارگاہ
ہے اس حصے کو پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے ان کو غزل سرائی
کے لئے بنایا تھا۔ لیکن وہ اس رنگ کو چھوڑ کر فطرت کے ساتھ ستیزہ کار
ہوئے۔ غزل کا حقیقی محور حسن و عشق ہے۔ جس میں زمانے کی رفتار کیساتھ
ساتھ دوسرے عناصر بھی شریک ہوتے گئے۔ حالی نے اس دور میں شعر
کہنا شروع کیا جب غالب اور مومن غزل میں دو مختلف راستے متعین
کر چکے تھے۔ یہ راستے اس سے پہلے بھی تھے لیکن ان کو اس تکمیل کے ساتھ
کسی نے پیش نہیں کیا تھا اس دور میں شیفتہ سنجیدہ و نیم متصوفانہ تغزل
کے غزل کے لہجے کو سنجیدگی و متانت بخش رہے تھے۔ اور ذوق و شاہ نصیر
داد زبان دانی دے رہے تھے۔ گویا اس وقت شاہ جہاں آباد کی فضا
میں غزل کے مختلف اسالیب سے معمور تھیں۔ ایسے میں حالی بھی سامنے
آئے وہ روایتاً غالب کے شاگرد تھے لیکن ان کو قربت زیادہ تر شیفتہ
سے رہی مومن سے ان کو اتنی ہی عقیدت تھی جتنی ایک استاد سے دوسروں کو
ہو سکتی ہے۔ مگر یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کو شیفتہ و مومن نے متاثر
کیا ان کے یہاں شیفتہ کے عناصر غزل گوئی (تصوف کو چھوڑ کر) زیادہ
ہیں اور مومن کے کم۔ لیکن غالب سے شاگردی کے باوصف کچھ دور
سے رہے۔ یہ بات بظاہر قابل استعجاب ہے۔ لیکن یہی بات درحقیقت
ان کے مذاق سلیم کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ حالی کے دل میں جو فطری

سوز و گداز اور رقت قلب کے عناصر تھے ان کی نسبت سے شیفتہ و مومن ہی ان کو متاثر کر سکتے تھے۔

ہر چند کہ مومن کی شاعری دل کی آواز نہیں۔ ان کی شاعری میں داخلیت کم اور بہت کم ہے۔ لیکن محبت کے وہ مرتعش احساسات ضرور ہیں جو عشق مجازی کا حاصل ہوتے ہیں۔ حالی کے یہاں صوفیوں سے زیادہ تقدس تھا لیکن اس کے علاوہ اس دور میں انھیں تصوف سے کوئی ذہنی یا عملی تعلق نہیں رہا۔ وہ تو محبت کے ان جذبات کی ترجمانی کرتے تھے جو واقعتاً محبت کے زیر سایہ نشو و نما پاتے ہیں۔ اگر محبت اس عالم آب و گل کے کسی فرد سے ہو تو اس میں ایک بار وہ منزل ضرور آتی ہے جو مومن کی شاعری کا محور ہے۔ اس لئے حالی کے یہاں رنگ مومن کی دل کشی موجود ہے۔

حالی کی قدیم و جدید غزلیات کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اس مجموعے میں حمد و نعت کی تین غزلوں کو چھوڑ کر اور کوئی غزل ایسی نہیں ہے جس میں تصوف کے مدعیانہ بیانات ہوں۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے رسم زمانہ کے مطابق رسمی طور پر بھی ہمہ اوست، یا غیب و شہود کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالی جب ابتدا میں واقعی غزل کہتے تھے اس وقت ان کو اس آفاقی صداقت سے دست کش ہونے کی فرصت نہیں ملی۔ وہ اس زمانے میں ان جذبات سے سرشار تھے جو غزل کے خالق ہیں۔ جب وہ اس منزل سے نکلے تو اصلاح قوم کے لئے کمربستہ

ہو گئے۔ یہ وہ منزل تھی جہاں پہنچ کر آدمی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان کو صوفی بنے یا ایسے شعر کہنے کا موقع نہیں ملا۔ انھوں نے ایک قطعے میں اپنے رنگ شاعری کی نسبت خود تفصیل پیش کی ہے۔

ہوئی ویران جوانی کی بہار آخر حیف — طبع رنگین تھی مئے عشق سے جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں — جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی نہ امنگ — سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی
گر غزل لکھئے تو کیا لکھئے غزل میں آخر — نہ وہی چیز وہ مضمون سمجھانے والی

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غزل کو بنیادی طور پر دل کی باتیں بیان کرنے کا وسیلہ سمجھتے تھے اور جب تک وہ ذہنی طور پر جوان رہے حکایت دل ہی کہتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شاعر کو ماورائے سرحد ادراک کی حقیقتوں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے انھوں نے اس خیال کو ایک شعر میں نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔

ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوق دید بھی — جائے گا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں

ذوق دید کی یہ تمنا اور اس سے پیدا ہونے والی کیفیتیں ہی جان غزل ہیں۔ حالی انھیں سانس لیتی ہوئی حقیقتوں کو پیش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر غالب و شیفتہ کے نیم متصوفانہ انداز سخن کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اسی طرح ان کے یہاں وہ فلسفیانہ دقایق اور بلند تصورات بھی نہیں جو دوسرے بلند مرتبہ شعرا کی شاعری کا سرمایہ ہیں جس طرح ان کے یہاں تصوف نہیں ہے اسی طرح ان کے کلام میں فلسفے کے وہ عام موضوعات بھی شامل نہ ہو سکے جو فارسی و اردو شاعری کے بڑے حصے پر محیط ہیں۔ اور جنھوں نے واقعتاً غزل کے لہجے کو

شائستگی و بلندی عطا کی ہے غرض ان کے یہاں تصوف، فلسفہ، معاملہ بندی خمریات، کے مضامین نہیں ہیں۔ مذکورۂ بالا اجزا وہ ہیں جن پر فارسی و اردو غزل کی بنیاد قائم ہے۔ پڑھنے والے کے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوگا کہ ان بلند موضوعات کے بغیر ان کے یہاں کیا ملے گا؟ ان کے یہاں داستان محبت اور نفسیات محبت کی وہ ساری کیفیات موجود ہیں جن سے داستان دل خود خود مرتب ہو جاتی ہے۔ آسانی کے لحاظ سے ہم اس حصہ کلام کی خصوصیات کو چند حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں تاکہ جائزہ مکمل ہو سکے۔

(۱) حالی کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں طرز ادا میں کوئی پیچیدگی نہیں ملتی وہ نہایت سادگی و صفائی سے بات کہتے ہیں۔ اور غزل زبان کا ہر قدم پر لحاظ رکھتے ہیں جس سے ان کے یہاں بے ساختہ پن اور سوز و گداز کے عناصر چمک اٹھتے ہیں۔ ایسے اشعار کی بڑی خوبی یہ ہے کہ جہاں نفس مضمون فطری ہے وہاں انداز بیان میں سادگی کے سبب سے شعریت کے اجزا محفوظ ہیں طرز ادا کی سادگی، مفہوم کی واقعیت اور بیان میں والہانہ انداز، یہ کیفیات براہ راست دل کو متاثر کرتی ہیں۔ آئندہ مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا۔

(۲) تغزل میں نفسیات محبت کی بڑی اہمیت ہے۔ بات کو اس انداز سے کہنا کہ صداقت و واقعیت کے ساتھ ساتھ ایک ایسا پہلو بھی ہو جو توجہ کو کسی خاص پہلو سے منعطف کرلے۔ اور محسوس ہو کہ کہنے والا دیار محبت کی رسموں اور کاروبار محبت کے نشیب و فراز سے واقف ہے اور کچھ ایسی باتیں بیان کر رہا ہے جن کی سچائی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ تغزل کا صحیح اسلوب ہے۔ حالی کے

یہاں ایسے اشعار کی قابل ذکر تعداد ہے اور ہر طرح اس معصومانہ صداقت اور سلجھی ہوئی واقعیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ پڑھتے ہی کیف طاری ہو جاتا ہے۔

راہ محبت میں اقدام دکھ کر جو شخص مشکلات سے گھبرا جائے وہ کبھی لذت عشق حاصل نہیں کر سکتا۔ محبت ایک کیف مستقل ہے لیکن اس وقت جب دل میں اتنا گداز پیدا ہو جائے کہ زخم جگر نہ رہے۔ دل کا جزو بن جائے۔ اس مفہوم کو جس سادگی آمیز پریقین انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ آپ اپنی مثال ہے ملاحظہ ہو۔

اک عمر چاہیئے کہ گوارا ہو نیش عشق   رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

ابتلائے عشق عاشق کو کسی دوسری طرف متوجہ نہیں ہونے دیتا۔ محبت کرنے والوں کی نظر میں کائنات کے حسین ترین مظاہر ہیچ ہوتے ہیں۔ یہ دنیائے شاعری کا عام خیال ہے۔ لیکن حالیؔ نے سادہ انداز بیان سے ایک بالکل نیا پہلو پیش کیا ہے۔

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور   عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں

قابل غور بات یہ ہے کہ شاعر نے محبوب کو سب سے بہتر کہہ کر ظاہری مبالغے کا اظہار نہیں کیا۔ وہ کہتا ہے ممکن ہے دوسرے حسین تم جیسے ہوں۔ لیکن جو بات تم میں ہے وہ کہاں۔ بات کو مبالغے کے بغیر اس سادگی سے بیان کرنا کہ اس کی تاثیر محفوظ رہے حالیؔ کی عام خصوصیت ہے۔ فن تنقید میں اسی خصوصیت نے ان کو امام کا مرتبہ عطا کیا ہے۔ اور اسی خصوصیت نے

غزلوں میں تاثیر کی بجلیاں بھر دی ہیں۔ شاعر نے محبوب کو سب سے بہتر نہیں کہا وہ تو صرف یہ کہتا ہے کہ جو بات تم میں ہے وہ دوسرے میں نہیں مل سکتی۔ کتنی صداقت ہے۔ اور کتنی معصومیت۔ اسی غزل کا ایک شعر ہے۔

ہوتی نہیں قبول دعا ترکِ عشق کی جی چاہتا نہ ہو تو دعا میں اثر کہاں

دوسرے مصرع کی سادہ پُرکار کیفیت قابل داد ہے۔ کبھی کبھی محب صادق بھی گھبرا کر ترکِ عشق کی دعا مانگنے لگتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ دل کی سچی آواز نہیں ہوتی۔ اس لئے دعا اثر سے محروم رہتی ہے۔ شعر میں کوئی معنی آفرینی نہیں۔ انداز بیان میں کوئی چھل بل نہیں۔ بس ایک سادہ سا پہلو ہے جو تاثیر کی جان ہے اسی غزل کا مطلع ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

بلندیٔ خیال کے ساتھ ساتھ ندرتِ ادا اور شعریت آمیز لہجے نے شعر کو اس منزل پہنچا دیا ہے جہاں قوتِ تنقید و تجزیہ خستگی محسوس کرتی ہے۔

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

دوسرے مصرع میں ایک لفظ بھی نے شعر میں ایک کیفیت پیدا کر دی ہے۔ کھل کر وفا پرستی کا ذکر نہیں کیا گیا۔ لیکن جی چرانے کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ انتہائے وفا پرستی کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔

جب تک انسان کو مسرتوں سے کسی حد تک بھی تعلق رہتا ہے۔ اس وقت تک مصیبتیں زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ اس بات کو کنایہ کے طور پر کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح لگا دے آگ کوئی آشیاں میں

عالم ہجر حیات آفریں ہوتا ہے۔ لیکن یہی اضطراب بے پایاں کچھ دنوں کے بعد کم ہوتے ہوتے یاد ماضی تک محدود ہو جاتا ہے دل اس وقت بھی پرخون ہوتا ہے۔ آنکھیں خون آلود نہیں ہوتیں اس کیفیت خاص میں بے حد سادگی آمیز انداز سے بیان کیا ہے واقعیت کی نزاکت پر حرف نہیں آیا ہے۔

بے قراری تھی سب امید ملاقات کیساتھ اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں

اسی قبیل کے کچھ اور اشعار دیکھئے۔

ٹھہرتے ٹھہرتے دل یوں ہی ٹھہر جائے گا
بات جو آج ہے وہ کل شب ہجراں میں نہیں

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

ذات انکو بات بات پہ سو سو دیئے جواب مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید خود بخود دل میں ہے ایک شخص سمایا جاتا

کوئی دل سوز ہو تو کیجئے بیاں سرسری دل کی واردات نہیں

دل رہا پائے بند الفت دام تھی عبث آرزو رہائی کی

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں — مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

(۳) اب تک جو اشعار نقل کئے گئے ہیں ان میں حالیؔ کی ان خصوصیات کے علاوہ شیفتہ کی جھلک صاف نمایاں ہے حالیؔ کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے پر ایک خاص حصہ ایسے اشعار شمار کا ملتا ہے جس پر براہ راست مومنؔ کا پرتو نظر آتا ہے مومنؔ کی تین خصوصیات مشہور ہیں۔ ابہام لہجے میں ایک خاص بانکپن اور بیان عشق کہ محبوب کے بازاری ہونے کے یا وصف طرز اظہار عامیانہ نہیں۔ ان میں سے اول الذکر خصوصیت حالیؔ کے یہاں موجود ہے اور اس خوبی کے ساتھ اگر کسی کو یہ نہ معلوم ہو کہ حالیؔ غالب کے شاگرد تھے تو وہ ان کو مومن کا عزیز ترین کا شاگرد سمجھے گا۔ ذیل میں ان کے کچھ ایسے اشعار پیش کرتا ہوں۔

سچ ہے کہ پاس خاطر نازک عذاب ہے — تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا
رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے ہوئے نہاں — طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا
تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا — کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا
مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب — چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب
داد فراق و رشک عدو تک گراں نہیں — تنگ آ گئے ہیں اپنے دل شادماں سے ہم
کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے — ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے
تھا یہاں دل میں طعن وصل عدو — عذر ان کی زبان پہ آنے لگے
جان بچتی نظر نہیں آتی — غیر الفت بہت جتانے لگے
کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے — بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

قدر نعمت ہے بہ قدر انتظار | حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری
مانع گل گشت ہے بیم خزاں | موت کرتی ہے نگہبانی مری
کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت | ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے | شکوے کو لے گیا ہے وہ بیداد فن کہاں
عدو سے بات محفل میں نہ کرتی | جو سچ پوچھو تو جائے سوئے ظن ہے

مومن کا رنگ سخن ایک پل صراط ہے جس پر چلتے ہوئے ہر قدم پر ابتذال کے جہنم میں گرنے کا ڈر رہتا ہے حالی نے مومن کے یہاں سے صرف انداز بیان کا اثر قبول کیا ہے ان کے یہاں جو شوخی ہے۔ حالی کا کلام اس سے پاک ہے۔ اور یہ ان کی سنجیدہ مزاجی کا فیض ہے۔ ورنہ مومن سے اتنا قریب ہوتے ہوئے ان کی بے پناہ شوخی سے بچنا بڑا مشکل کام ہے۔

(۴)۔ حالی کے یہاں جام و مینا کی داستان بالکل نہیں ہے۔ غالب کی شاگردی کے باوصف ان کی شاعری اس فیضان سے محروم رہی۔ لیکن اس کے بجائے انھوں نے صوفی و زاہد کو طنزیہ تیروں کا ہدف بنایا ہے۔ یہ رنگ غزلیات کے ایک بڑے حصے پر چھایا ہوا ہے۔ قدیم و جدید دونوں دور اس داستان سے رنگین ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قدیم غزلیات میں ایسے شعر ایک حد تک دل کش ہیں۔ لیکن جدید حصہ غزلیات میں یہ رخ بھی اصلاحی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ جس سے صرف استہزا کا رنگ چمک گیا ہے طنزیہ نشتروں کی تیز دھار مڑ گئی ہے حالی کی قدیم و جدید غزلوں کے تقریباً بیس فیصدی اشعار زاہد و صوفی کے ذکر سے متعلق ہیں اول الذکر انداز میں بے کیفی نمایاں ہے

ایسے اشعار میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جس سے طنز کا اصل مقصد حاصل ہو سکے صرف پھبتی کا حق ادا ہو گیا ہے۔ چند شعر بطور مثال پیش کرتا ہوں

واعظ کی حجتوں سے قائل تو ہو گئے ہم — کوئی جواب شافی پر اس سے بن نہ آیا

عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم — ہم پہ منہ آئے گا منہ کی کھائے گا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ — اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

دیکھئے شیخ مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے — صورت اور آپ ہے بے عیب بشر کی صورت

اس رنگ کے اشعار نسبتاً زیادہ ہیں دوسرے قسم میں وہ اشعار ہیں جن میں ان بزرگوں کا کسی خاص پہلو سے حملہ کیا گیا ہے اور کوئی ایسی بات پیدا کی گئی ہے کہ شعر پڑھ کر ایک لطف آجاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ زاہد و صوفی کی حقیقی کمزوری بھی سامنے آجاتی ہے مثلاً

مان لیجئے شیخ جو دعوی کرے — ایک بزرگ دین ہم کو جھٹلائیں کیا

"بزرگ" کا لفظ طنز کی جان ہے۔

جھگڑوں میں اہل دین کے حالیؔ پڑیں نہ آپ — قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

گو مئے ہے تند و تلخ یہ ساقی ہے دلربا — اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کئے بغیر

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید — جنتی جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں

اس طبقہ کی کم عقلی کا جس لطیف انداز سے خاکا اڑایا ہے وہ دیکھنے ہی کی چیز ہے۔ خصوصاً جنتی کا اصطلاحی لفظ طنز کا بھرپور وار ہے۔

کہیں افطار کا حیلہ تو نہیں یہ حالیؔ — آپ اکثر رمضان میں ہی سفر کرتے ہیں

بلاغت اداد یکھنے کے قابل ہے زاہد کو مخاطب کرنے کے بجائے اپنے آپ کو

اس طرح مخاطب کرنا گویا اپنی سرگذشت بیان کی جا رہی ہے اس انداز میں جو سچائی اور خوبی اظہار ہوتی ہے اور دوسری طرح ممکن نہیں

ہیں فصاحت میں مثل واعظ حالی دو نو — دیکھنا یہ ہے بے لاگ سخن کس کا ہے

ہم بھی آداب شریعت سے تھے آگاہ مگر — نہ ہو یرناؤں میں جو رسم وہ کیا یاد رہے

(۵) دیوان میں بہت غزلیں مسلسل ہیں لیکن ایسی کوئی غزل نہیں ہے جس میں مومن یا شاد کی طرف کسی داستان محبت کو بیان کیا ہو ایسی بیشتر غزلیں اصلاحی رنگ کی ہیں صرف تین غزلیں اس سے مستثنیٰ ہیں ایک تو وہ غزل جس کا مطلع ہے۔

جیتے جی موت کے تم منہ میں جانا ہرگز — دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

یہ غزل درحقیقت دلی کی بربادی کا دردناک مرثیہ ہے۔ چونکہ بات دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے اس لئے اس میں بے حد سوز گداز ہے۔ دوسری دو غزلوں کے مطلع یہ ہیں۔

دل کو درد آشنا کیا تو نے — درد دل کو دوا کیا تو نے

اے بہار زندگانی الوداع — اے شباب اے شادمانی الوداع

پہلی غزل حمد میں ہے اور اصولاً اس کو شروع دیوان میں ہونا چاہیئے تھا۔ غالباً ردیف کی مجبوری سے یہ آخر میں رکھی گئی ہے۔ دوسری غزل جوانی کا مرثیہ ہے۔ وہی جوانی جس کے لئے ایک جگہ حالی ہی نے کہا ہے۔

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت — پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

اور اس میں شک نہیں کہ تاثرات کے اعتبار سے یہ بڑی کامیاب غزل ہے

معلوم ہوتا ہے برسوں کی خوں شدہ تمنائیں دل کی گہرائیوں سے تڑپ کر زبان پر آگئی ہیں ۔

(۶) حالی کے یہاں تشبیہات و تغیرات کا حصہ نہ ہونے کے برابر ہے وہ سیدھے سادے آدمی تھے اس طرح سادی باتیں کہتے تھے لیکن جہاں جہاں انھوں نے اس صورت سے کام لیا ہے ۔ کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پیدا ہو گیا ہے ۔ دیوان میں گنتی کے چند شعر ایسے ملتے ہیں جن میں یہ خوبی ہو لیکن جن چند اشعار میں کوئی تعبیری کیفیت ہے وہ بجائے خود مکمل ہیں ۔ ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر حسن تعبیر کا سلیقہ خاص تھا ۔ لیکن اس کو وہ صرف میں نہیں لائے ۔ اس سلسلے میں حسب ذیل شعر پیش کئے جا سکتے ہیں ۔

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام — گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کاش اک جام بھی سالک کو پلایا جاتا — اک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے — مینھ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ — ایسے الجھاؤ ترے کاکل پیچاں میں نہیں

ہم نے اول سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک — ہم سے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی

مانع گل گشت ہے بیم خزاں — موت کرتی ہے نگہبانی مری

(۷) ۔ حالی کی غزلیں خواہ قدیم ہوں یا جدید ۔ عامیانہ مبتذل اشعار سے پاک ہیں ۔ وہ غالب کے شاگرد تھے ۔ اور شیفتہ کے جلیس ۔ درد سوز جو غزل کی جان ہے ۔ ان کے پاس اس دولت کی فراوانی تھی ۔ اس لئے

وہ جب تک حکایتِ دل بیان کرتے رہے حقیقی غزل گو رہے اور جب ناصح مشفق بنے تو نصیحت آمیز باتیں کہنے لگے۔ اور ان دونوں میں ابتذال کی گنجائش کہاں۔ نیز ان کی فطری متانت و سنجیدگی بھی ایسے مضامین کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ پورے دیوان میں مجھ کو صرف ۴۔۵ شعر ایسے ملے جن کو کسی حد تک مبتذل کہا جا سکتا ہے لیکن اگر کسی دیوان میں ۱۱۳ غزلیں ہوں اور ان میں صرف چار پانچ شعر ایک انداز سے ہٹ کر ملیں تو ان کا شمار ان مستثنیات میں ہوتا ہے جن کو شمار میں نہیں لایا جاتا۔ وہ شعر یہ ہیں۔

بے گانہ وش ہے گر وہ تو ہے ہمارے ڈھب کا — ایسوں سے ہی نبھتا ہے یارانہ اکثر اپنا

عشق اس وقت سے سر پر ترے منڈلاتا تھا — گودیوں میں تجھے تھا جبکہ کھلایا جاتا

شب وعدہ ہے بار عام ان کے در پر — مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت

دلالہ نے امید دلائی تو ہے لیکن — دیتے نہیں اب دل کو تسلی یہ دلاسے

(۸)۔ دیوان میں کہیں کہیں روزمرہ اور محاورات کی بہتات ہے بعض غزلیں مطلع سے مقطع تک اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اگر صرف انھیں کو پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شاعر کے پیش نظر صرف روزمرہ اور محاورے کا صرف ہے۔ لیکن کلام کا بڑا حصہ اس صنعت گری سے پاک ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض غزلیں انھوں نے خاص طور پر اس رنگ کا لحاظ رکھ کر کہیں۔ ان غزلوں میں معنی آفرینی یا دل کشی کے عناصر نہ سہی۔ لیکن زبان کی حد تک وہ دل کش ضرور ہیں۔ ہاں! ایک بات یہ بھی ہے کہ بعض بحریں ایسی ہوتی ہیں کہ شاعر اگر مشاق اور قادر الکلام ہو تو ان میں خود بخود زبان کا

رنگ چمک اٹھتا ہے۔ مثلاً ان کی وہ غزل دیکھیے جس کا مطلع ہے۔

رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی　　بنائی بہت بات پر بن نہ آئی

یہ وزن ایسا ہے کہ مشاقی کے بعد اس میں الفاظ و ترتیب الفاظ کا پہلو غالب رہے گا۔ بطور مثال ایسی ایک غزل درج ذیل ہے۔

بری اور بھلی سب گزر جائے گی　　یہ کشتی یوں ہی پار اتر جائے گی

ملے گا نہ گل چیں کو گل کا پتا　　ہر اک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی

رہیں گے نہ ملاح یہ دن سدا　　کوئی دن میں گنگا اتر جائے گی

ادھر ایک ہم اور زمانہ ادھر　　یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی

بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ　　یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی

نہ پوری ہوئی ہیں امیدیں نہ ہوں　　یوں ہی عمر ساری گزر جائے گی

سنیں گے نہ حالیؔ کی کب تک صدا　　یہی ایک دن کام کر جائے گی

لیکن یہ ان کا حقیقی انداز نہیں ہے۔ ایک رخ ہے جو کہیں کہیں بے احتیاطی نمایاں ہو گیا ہے۔

(۹) غزلیات میں تعقید اور بندش کی سستی عیوب بھی موجود ہیں۔ یہ عیوب یا تو ان غزلوں میں زیادہ ہیں جو دور آخر کی اصلاحی شاعری کا نتیجہ ہیں۔ یا ان غزلوں میں جو غیر مستعمل ردیفوں میں محض ترتیب دیوان کی رعایت سے کہی گئی ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ زبان کے متعلق حالیؔ کے نظریات عام لوگوں سے بلند اور کچھ مختلف تھے۔ وہ غیر ضروری حد بندیوں کے قایل نہیں تھے۔ لیکن تعقید یا الفاظ کا عدم تناسب ان اصولوں سے غیر متعلق اور دوسری

بات ہے یہ اسقام کسی اصول پرستی یا زبان و بیان کے کسی نظریے کی بنا پر شامل کلام نہیں ہوئے ہیں۔ آخر میں ان پر اصلاحی خیالات اتنے غالب آگئے تھے کہ وہ ان محاسن کلام کو خود فراموش کر گئے جن کا انھوں نے متعدد جگہ ذکر کیا ہے۔
ان کی جدید غزلیات میں چند غزلوں کو چھوڑ کر تمام غزلوں کے نصف سے زائد اشعار میں یہ اسقام ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند شعر درج کرتا ہوں۔

مے خانے کی خرابی جی دیکھ کر بھر آیا — مدت کے بعد کل واں جا نکلے تھے قضا را
دل جو کوئی نہیں یاں حیف اے صنم پرستو — دل کش بہت تھا ورنہ بیت الصنم تمھارا
دیں غیر دشمنی کا ہمارے خیال چھوڑ — یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس

خواب راحت میں وہ لذت تیرے اے پیری نہیں
جو جوانی میں مزہ دیتی تھیں شب بیداریاں

اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جدید غزلیات میں زیادہ اور قدیم غزلیات میں کم ایک اور عیب ملتا ہے وہ ہے غزل کے نقطہ نظر سے غیر متحمل یا غیر متناسب الفاظ کا استعمال۔ چند اشعار سے اس کا اندازہ ہو گا۔

شب کو زاہد سے نہ مڈبھیڑ ہوئی خوب ہوا — نشہ زوروں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا
راز دل کی سر بازار خبر کرتے ہیں — آج ہم شہر میں خوں اپنا ہدر کرتے ہیں۔
جلوہ اے صوفی نہ دکھلایا عبث — رات بھر یاروں کو جنجو ایا عبث

نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گل چینا یا ہے قزاقی

غزل طویل ریاضت کا شاہ کار ہے۔ ابتدا میں الفاظ و اسلوب کا وہ سررشتہ

ہاتھ نہیں آتا جس سے شعر میں روانی وہ پختگی کے جوہر چمک اٹھتے ہیں۔ ہاں مشق سخن کے ایک طویل دور کے بعد یہ قدرت حاصل ہو جاتی ہے کہ الفاظ خود بخود سانچے میں ڈھلے ہوئے ذہن میں آجاتے ہیں۔ حالیؔ کے یہاں ابتدا میں ان عیوب کا ملنا تعجب خیز نہیں وہ دور تو دور ابتدائی تھا ہی نہیں۔ دور آخر میں جبکہ ریاضت کا ثمرہ ملتا ہے وہ تبلیغی کام میں مصروف ہو گئے جس میں ان محاسن کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ ترتیب دیوان کے وقت شاعر پچھلے کلام پر نظر ثانی کرتا ہے۔ لیکن حالیؔ کے اس وقت یہ بات بے معنی ہو کر رہ گئی تھی ان وجوہ کی بنا پر ان معائب و اسقام کا وجود کچھ غیر متوقع یا مایوس کن نہیں ہے۔ ایسا ہونا ہی چاہیئے تھا۔

(۱۰) قصائد و غزلیات وغیرہ میں حالیؔ نے زبان کے مروجہ ضوابط کا کچھ زیادہ لحاظ نہیں رکھا ہے۔ ان کے یہاں بہت سے ایسے مقامات ملتے ہیں جہاں عجیب عجیب اجتہادات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ البتہ قصائد وغیرہ کے مقابلے میں غزلیات میں یہ فروگذاشتیں کم ہیں۔ بطور مثال ایسے چند شعر لکھتا ہوں۔ یہ معائب اتنے واضح ہیں کہ کسی تفصیل یا اشارے کی ضرورت نہیں ہے۔

عوام الناس کا ہوگا جنھیں منہ — انھیں خاصوں پہ منہ آنا پڑیگا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی — مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

لگ جائے دل نہ منزل مقصود میں کہیں — ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز

کر دیا خوگر جفا تو نے — خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں   رہ گئی شرم پارسائی کی

غزلیات کے اس حصے کو پڑھ کر جہاں تغزل ساری خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر وہ آخر تک اس رنگ تغزل سے دست کش نہ ہوتے تو ان کی وہ خوبیاں جن کو اوپر لکھا گیا ہے۔ بڑھتے بڑھتے ایک خاص رنگ میں نمایاں ہوتیں۔ اور انفرادیت کے تابناک نقوش ابھر آتے۔ لیکن چونکہ وہ جلد ہی اس رنگ سے ہٹ گئے۔ اس لئے ان کے یہاں ایسے عناصر پیدا نہیں ہو سکے۔ جن سے انفرادیت کا مستقبل وجود قائم ہوتا ہے۔ حالی کے اچھے اشعار پڑھ کر اس دور کی غزل گوئی یاد آجاتی ہے۔ جب جذبات و کیفیات کے اظہار میں صناعی کے بجائے فطری معصومیت موج زن تھی۔ ان کے تغزل سے معمور شعر پڑھکر ذہن کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول کر اس فضا میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں درد و سوز، تاثیر و صداقت، اور ربودگی و سپردگی کا نور چھایا رہتا ہے۔ الفاظ کے بے جان پیکر میں واردات و کیفیات کی روح اس طرح محفوظ ہے کہ شعر پڑھتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ سامنے کچھ تصویریں رقص کر رہی ہیں۔ ان سب خوبیوں کے باوصف ان کا کوئی انفرادی رنگ نہیں ہے اور اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر لکھ چکا ہوں۔ البتہ ادب میں ان کی غزلیات کا مرتبہ اتنا ہی بلند ہے جتنا درجہ اول کی متاع گراں بہا کا ہونا چاہیئے۔ لوگ ان کی نظموں، رباعیوں، قطعوں کو کسی وقت بھول جائیں گے کیونکہ ان میں زندگی کی حرارت اتنی تیز نہیں ہے کہ طویل مدت تک قائم رہے۔

یہ اصناف تاریخ ادب میں ان کے مجاہدانہ کارناموں کو واضح کرنے کے کام آئیں گی۔ اور کہا جائے گا کہ انھیں کے واسطے سے حالی نے نظم میں ایک نیا رخ پیدا کیا ادب میں سماجیت کے عناصر داخل کئے اور اس کو زندگی سے قریب تر کیا۔ لیکن ان کی غزلیں اس وقت تک زندہ رہیں گی جب تک انسانی فطرت میں درد و سوز اور گداختگی و برشتگی کے محرکات موجود رہیں گے۔ ان کا ایک مطلع ہے۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں　　مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

یہ "اپنی زباں" محبت کی زباں ہے۔ اور جب تک اس زبان کے جاننے والے موجود ہیں حالی کے اشعار زندہ رہیں گے۔

شبیہہ الحسن نونہروی

حالی کا نظریہ اور شخصیت

انیسویں صدی کا نصف آخر ہندوستان کی ذہنی تاریخ کا سب سے اہم اور نتیجہ خیز عبوری دور تھا۔ اس دور کے بیشتر مسائل جنگ آزادی کے بعد فوراً ہی نمودار ہو گئے تھے۔ چونکہ عبوری دور میں نظریاتی استحکام موجود نہیں ہوتا ہے لہذا اس عہد کے مسائل سے عہدہ برآ ہوتے آج کوئی لائحہ عمل بھی موجود نہیں ہوتا ہے۔ نظریہ نہ ہونے کی وجہ سے منزل مبہم ہوتی ہے لہذا مختلف مسائل کے طولانی ردعمل کو نہ اچھی طرح محسوس کیا جا سکتا ہے اور نہ ان کے لئے کوئی واضح راہ متعین کی جا سکتی ہے۔ اسی لئے انیسوی صدی کے مخصوص ماحول نے مسائل تو بے شمار پیدا کر دیئے ہیں مگر اپنی عبوریت کی وجہ سے نظریاتی استحکام یا فلسفیانہ بصیرت کے لئے اہل ذہن کو عرصہ تک مبتلائے انتظار رکھا۔

جنگ آزدی تک ناقص اور فرسودہ سہی مگر ایک ذہنی نظام اپنے مخصوص ڈھرے پر لڑکھڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ مگر جنگ آزادی کے بعد ہندستانیوں کا

سب سے بڑا نقصان یہ نہیں تھا کہ ملک چھن گیا بلکہ ایک عرصہ تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ذہن چھن گیا۔ اسی منزل سے اس عبوری دور کا آغاز ہوتا ہے جس نے شدید جد و جہد کے بعد اس نظریاتی آئینہ خانہ کو مرتب کیا جس کی جھلکیاں دور حاضر کے تقریباً سب ہی سیاسی نگار خانوں میں نظر آتی ہیں۔ عبوری دور باوجود نظریاتی عدم استحکام کے جستجو و تحقیق اور تفتیش و تدقیق کا ایک حوصلہ پرور محرک بھی ہوتا ہے وہ مسائل کی مسلسل ضرب کے ذریعہ سے جد و جہد اور غور و فکر کی صلاحیتوں کو بیدار رکھتا ہے۔ عبوری دور کے مفکرین کی ذمہ داریاں ہمیشہ نظریاتی استحکام والے دور کے مفکرین سے زیادہ ہوتی ہیں اس عہد کی کارگزاریاں خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط ہمیشہ دور اس نتائج ذمہ دار ہوتی ہیں بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے جس عبوری دور سے ہندوستانی ذہن کا سابقہ پڑا تھا اگرچہ وہ جلد ہی گزر گیا اور اس عہد کی صالحہ فکری و عملی کارگزاریوں سے ہم اس وقت فائدہ اٹھا رہے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھ لینے کی چیز ہے کہ اس عہد کی بعض معمولی غلطیاں اور فروگذاشتیں جن کی حیثیت اس وقت شاید ایک ذرہ بے مقدار سے زیادہ نہیں تھی آج دیو پیکر ہو کر نظم کارواں کو درہم و برہم کر رہی ہیں۔

جس طرح ابر کا دامن برق سے خالی نہیں ہوتا ہے اسی طرح مسائل اپنے ساتھ حل لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ امراض و اسقام کی جلو میں علاج و تدارک کا ایک شفاخانہ چھپا چھپا ساتھ چلتا ہے عبوری دور کی کشمکشوں اور کٹھن آزمائشوں ہی نے ہندوستانی ذہن کو نظریاتی استحکام کی طرف قدم بڑھانے میں

ایسی مدد دی جس کے زیر اثر اب تک منزلیں طے ہو رہی ہیں۔ جنگ آزادی کے بعد ملک سے محروم ہو جانے والے ہندوستانیوں کیلئے آج اس دور کا سب سے بڑا تحفہ وہ ذہن تھا جس سے ملک رانی کے دور میں زوال انگیز قوتوں نے ہندوستان کو محروم کر دیا تھا اب نصف صدی سے زیادہ گزر جانے کے بعد یہ بات مکمل وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ملک کے عوض میں ذہن کا مل جانا نفع بخش سودا رہا۔

ہندوستان کا یہ عبوری دور ایک محیط ابر کی حیثیت رکھتا تھا جس نے ہندوستانی زندگی کے ہر خشک و تر کو گھیر رکھا تھا ہندوستان کی سیاست معاشیات، مذہبی زندگی، اخلاقی قدریں، تہذیبی ورثہ، ادب اور تعلیمی وسماجی مسائل سب ہی کچھ اس عبوری دور کے ابہام و تشکیک میں غلطاں وپیچاں تھے اسی لئے اس عہد کی کشمکش نے مختلف مفکرین کو مختلف سمتوں کی طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر موڑ دیا تاکہ ہندوستانی زندگی کے مختلف گوشے اس نشاۃ ثانیہ سے فیض اٹھا سکیں۔ اب جسے نیا ہندوستانی ذہن اپنے جلو میں لے کر چلنا چاہتا تھا۔ اس عبوری دور میں بیشمار قسم کے محرکات برسرِ عمل بنے جن کی ہنگامہ خیزیوں اور آپس کے ٹکراؤ نے ایک مہیب نشوری کیفیت اختیار کر لی تھی رفتہ رفتہ ہم جنس محرکات مسلسل ٹکرانے اور الجھنے کے بعد اپنے اپنے مرکز کے قریب جمع ہونے لگے اور پھر معین تحریکات کی شکل میں وضاحت کے ساتھ نمایاں ہو گئے۔ اس دور کے بعض مخصوص محرکات اور عوامل کی یکجائی نے انڈین نیشنل کانگریس کی شکل اختیار کی۔ اسی عہد کے دوسرے

ہم جنس عوامل نے سرسید تحریک کی شکل اختیار کی کچھ نے صنعتی دور کا آغاز کیا کچھ عوامل کج ذہنوں میں اُلجھ کر فرقہ وارانہ تحریکوں کی شکل میں نمودار ہو گئے اور اسی عبوری دور کے محرکات نے ادیبوں کو متاثر کر کے تنقیدی شعور کیلئے راستہ ہموار کیا اور ادبی اقدار میں یکسر انقلاب پیدا کر دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اس عبوری دور کے دھندلکوں سے صرف ایک آفتاب نہیں بلکہ ایک پورا نظام شمسی ہندوستانی کے زندگی کے افق پر اُبھرا اور جس طرح کہا جاتا ہے کہ نظام شمسی میں بعض ستارے نحس اور بعض سعد ہیں اسی طرح اس نظام شمسی میں بھی جو مختلف تحریکات اور نظریات کی شکل میں پیدا ہوا تھا بعض ستارے سعد تھے جن کی سعادت سے مسائل کو حل کرنے میں کافی مدد ملی اور بعض نحس تھے جن کی نحوست نے ہندوستان کی پاکیزہ تاریخ کو جابجا داغدار بنایا۔ اور آج بھی ان کی نحوست وطن، سیاست، زبان اور ادب کے مسائل کو اسی طرح مسخ کرنے کی کوشش کرتی ہے جیسے کثیف دھواں کسی بلوریں نگارخانہ کو دھندلا کرتا ہے۔

حالی اسی عبوری دور کی پیداوار تھے وہ اسی ادبی ستارہ کی ایک سنجیدہ اور خاراشگاف کرن تھے جسے عبوری دور کی کشمکش نے ایک بڑے نظام شمسی کے جز کی حیثیت سے پیدا کیا تھا۔ عبوری دور کے پیدا شدہ جوہر کی حیثیت رکھتے تھے جو قیمتی ہونے کے باوجود دیدہ زیب نہیں ہوتے ہیں جس طرح ایک ہیرا معدن سے نکلنے کے بعد ہنرمندوں کی زیر نگرانی مختلف زاویوں سے تراشا جاتا ہے اسی طرح نظریاتی ابتداء میں

ناتراشیدہ ہوتے ہیں پھر رفتہ رفتہ نئے مسائل اور نئے اطلاقات کے مرحلے جیسے جیسے سامنے آتے جاتے ہیں اسی اعتبار سے نظریہ کی تراش خراش کا کام بھی جاری رہتا ہے اس وقت ادب کے متعلق بہت سے نظریات تنقید نگار کے سامنے ترشی ہوئی شکل میں موجود ہیں جن کی آب وتاب اور پہلوداری بہرحال نظر کو متاثر کرتی ہے مگر یہ نظریات ابتدا ہی سے اس شکل میں موجود نہ تھے ابتدا میں وہ اسی طرح بھدے اور بے ہنگم تھے جیسے ایک ناتراشیدہ جوہر ہوتا ہے مسائل رفتہ رفتہ ابھرتے گئے اور نظریات کی پہلوداری میں اضافہ ہوتا گیا۔ حالی کے تنقیدی نظریات بھی اپنے اندر قیمت اور افادیت رکھتے ہیں مگر وہ اسی طرح ناتراشیدہ ہیں جیسے ہر نظریہ اپنی ابتدائی شکل میں ہوتا ہے حالی کے یہاں ہمیں وہ بناؤ چناؤ دیدہ زیبی اور بلوریت نہیں ملتی ہے جس کی توقع عہد جدید کے نقادسے کی جا سکتی ہے مگر وہ اپنی جوہریت کے اعتبار سے اردو ادب کے کسی بھی بڑے نقاد سے نہ صرف بڑے ہیں بلکہ زیادہ قابل ستائش بھی ہیں۔ حالی کے فن کا جائزہ اور ان کے مرتبہ کا تعین کرنا ان کے عہد اور اس کے مخصوص حالات اور مسائل و وسائل کو نظرانداز کر کے ممکن نہیں ہے۔ ان کے نظریات کو اسی عبوری دور کے پس منظر میں سمجھنا زیادہ صحیح اور نتیجہ خیز ہو سکتا ہے جس کی آغوش میں پرورش پانے والے مفکرین رجعت و ترقی کی ردوبدل میں ڈانوانڈول ہو رہے تھے ان کی مثال اس شخص میں تھی جو کسی ایسے جھولے پر بیٹھ گیا ہو جسے دونوں طرف سے تیز پینگ دئے جا رہے ہوں۔ ان حالات میں توازن کا قائم

رکھنا بڑی مہارت اور سوجھ بوجھ کو چاہتا ہے۔ اگرچہ سچا توازن حالی بھی قائم نہ رکھ سکے ان کے مقدمہ میں توازن کی کمی نظریہ کی صحت مندی کے باوجود قدم قدم پر کھٹکتی ہے پھر بھی ان کے یہاں وزن و وضع کی جو نوعیت ہے وہ آئندہ آنے والی نسلوں کو توازن قائم رکھنے میں کافی مدد دے سکتی ہے عہد جدید کے بیشتر نقادوں کو حالی کے یہاں توازن کی کمی محسوس ہوتی ہے یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ مگر اس سلسلہ میں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ حالی نے اپنا مقدمہ ایک تیز جھولے پر بیٹھکر لکھا ہے جبکہ عدم توازن کا احساس عہد جدید کے بعض ان نقادو کے متعلق بھی ہوتا ہے جو لکھنے کے لئے "کرسی اور دسک" استعمال کرتے ہیں۔

ان باتوں کا مقصد حالی کی طرف سے معذرت پیش کرنا نہیں ہے۔ پھر بھی اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ تنقید کے عہد جدید پر حالی کے عبوری دور کا قیاس درست نہیں ہے موجودہ عہد میں تنقیدی مسائل زیادہ نکھر چکے ہیں مختلف زاویے علوم کی عقبی روشنیوں سے منور ہو چکے ہیں پگڈنڈیاں شاہراہ بن چکی ہیں راستے صاف ہو چکے سنگ میل بڑی حد تک نصب ہو چکے ہیں۔ دوسرے ملک و زبان کے ادب اور اس کے تنقیدی مسائل تک پہونچ روز بروز بڑھ رہی ہے ادب اور سماج کے رشتے مختلف زاویوں سے متعین ہو چکے ہیں پھر بھی اس وقت جو تنقیدی سرمایہ اردو زبان میں پیدا ہو رہا ہے اس میں نظریاتی بالیدگی اور تجدد کا سراغ کم ملتا ہے بیشتر نقاد نظریہ ضرور رکھتے ہیں مگر وہ ان کی ذاتی کاوش و فکر و تجربات کا پیدا کردہ نہیں ہوتا۔ زیادہ تر نقاد مستعار نظریوں کے ذریعہ جنھیں وہ غور و فکر کے بعد قبول کر لیتے ہیں ادب کی ساخت و پرداخت اور افہام و تفہیم کا

فرض ادا کر رہے ہیں۔ بیشتر نقاد بنی بنائی کسوٹیاں استعمال کر رہے ہیں اسی لئے بیشتر تنقیدی سرمایہ نفس الامر میں نظریاتی ارتقا کی اتنی نمائندگی نہیں کرتا ہے جتنی نظریہ کو عائد کرنے اور اس کے مطابق ادب کو جانچنے اور سمجھنے کی۔ اطلاق (APPLICATION) کا کام اہم ہونے کے باوجود ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ اور نظریات کی آفرینش خواہ وہ ابتدائی شکل کے کیوں نہ ہوں بنیادی حیثیت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ حالی کی زیادہ اہمیت ایک صالح اور صحت مند نظریہ کی آفرینش اور ساخت و پرداخت کی وجہ سے ہے اس اطلاق کی وجہ سے نہیں ہے جس کے نمونے ہیں مقدمہ کے بیشتر صفحات بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ نظریہ کو عائد کرنا بڑے وسیع تجربہ اور صبر آزمائی کو چاہتا ہے اس کے لئے مواد کو ہزار پہلو سے الٹنا پلٹنا پڑتا ہے۔ حالی نے ایک اچھا نظریہ پیدا کرنے کے باوجود اس کے اطلاق میں اور ادب کو اس کے مطابق جانچنے میں شدید عجلت ہی سے کام لیا ہے جس کی وجہ صرف یہی تھی کہ انھوں نے جس نظریہ کو پیدا کیا تھا اسے تجربات کی وسیع منزلوں سے گذرنا ابھی نصیب نہیں ہوا تھا اور نہ اس کے گوناگوں پہلو خود حالی کے ذہن میں اچھی طرح روشن ہوئے تھے۔ مگر اطلاقات کی ان ساری غلطیوں کے باوجود حالی کی عظمت بحیثیت ایک نقاد کے اس لئے برقرار رہتی ہے کہ انھوں نے "وضع نظریہ" جیسے بنیادی کام کو انجام دیا انھیں اپنے دوستوں پیشروؤں یا استادوں سے بنی بنائی ہوئی کسوٹی نہیں ملی تھی یہ بات صحیح ہے کہ حالی کے نظریہ میں بھی استفادی عنصر کافی موجود ہے۔ مگر یہ عنصر مقدار کے اعتبار سے عہد جدید کے حاوی تنقیدی نظریات کے استفادی عنصر سے کہیں کم ہے

نظریات بنی بنائی شکل میں خلا سے اتر کر کسی فرد کے ذہن میں قیام پذیر نہیں ہوتے ہیں دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا مفکر کسی ایسے نظریہ کو اب تک پیش نہیں کر سکا ہے جس میں استفادی عنصر کافی مقدار میں موجود نہ ہو۔ حالی بھی استفادہ کرنے کے باوجود مجدد ہیں اور فن تنقید کے ثانوی اعمال میں شدید غلطیاں کرنے کے باوجود تنقید کے نظریاتی طرہ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکالنے والوں کے محض پیشرو نہیں بلکہ منزل نما ہیں۔

حالی کے تنقیدی شعور میں بعض لوگوں کو خاصی خامی محسوس ہوتی ہے۔ دراصل ایسے لوگ تاریخی اور ارتقائی روابط و تسلسل کو نظر انداز کر کے چیزوں کو پرکھتے ہیں۔ وہ سجی ہوئی دو کانوں کو ذہن میں رکھکر پیداوار کے مرکزوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ حالی ہی کے الفاظ میں ابالی کھچڑی میں آب و نمک کا توازن تلاش کرتے ہیں۔ حالی فنی اور بنیادی اعتبار سے اپنی تنقید و شاعری دونوں میں 'نیاریے' ہیں مرصع کار نہیں ہیں۔ وہ خاک کے ذروں سے سونا نکالنے کا فن جانتے ہیں، ان کو سونے کے زیورات بنانا نہیں آتے ہیں وہ غواصی کر کے موتی نکال سکتے ہیں۔ مگر دلالی کے لئے جس چرب زبانی اور ہیرے بازی کی ضرورت ہے اس سے وہ محروم ہیں۔

شاعری اور دربار کا ربط ہمارے پرانے شعراء ناقدین اور سامعین پر قدیم الایام سے منکشف تھا حالی نے پہلی مرتبہ ادب اور سماج کے رشتہ کو دریافت کیا یہ دریافت اردو ادب کیلیے انقلابی حیثیت رکھتی ہے مگر حالی سوسائٹی کے معنی اور اسکے بنیادی محرکات سے واقف نہیں تھے ان چیزوں کو سمجھنے کیلئے۔ انھیں کوئی ورثہ ملا تھا

اور نہ ان کی ذاتی استعداد اور گرد و پیش کے محرکات ان کی واضح راہ نمائی کرسکتے تھے ہر سماج اپنے عہد کے مفکرین سے باتیں کرنا چاہتا ہے خود انھیں اور ان کے ذریعہ سے دوسروں کو کچھ سمجھانا چاہتا ہے مگر سماج کے پاس زبان نہیں ہوتی ہے وہ آوازوں کے ذریعہ سے اپنا پیغام نہیں ادا کرسکتا ہے۔ اسی لئے ادیبوں کو اپنی زبان کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے۔ سماج ساری گفتگو اشاروں جیسے جبیں گردش چشم۔ اور چہرے کے اتار چڑھاؤ کے ذریعہ سے کرتا ہے۔ اسی لئے عام لوگ سماج کے تقاضوں کو نہیں سمجھ پاتے ہیں مگر ایک پختہ ذہن اور گداختہ دل شاعر و ادیب ان اشاروں سے معنی نکال لیتا ہے۔ سماجی اشارات کو سمجھنا کافی مشکل کام ہے۔ تحقیق و تفتیش کے بڑے بڑے معرکے اگرچہ اس وقت تک سر ہو چکے ہیں مگر ان اشارات کو واضح خیالات و الفاظ میں منتقل کرنا اب بھی ممکن نہیں ہو سکا ہے حالی سے پہلے کسی کو اس کا احساس بھی نہیں تھا کہ سماج کچھ اشارے کر رہا ہے۔ کچھ کہنے کے لئے بے چین ہے حالی نے پہلی مرتبہ ان اشاروں کو محسوس کیا اور سماج سے گفتگو کرنے کی کوشش کی مگر ان کے عہد تک ان اشارات کے لئے کوئی کلید وضع نہیں ہوئی تھی حالی کے لئے ان اشارات کو مفصل طرح سمجھنا دشوار نہیں بلکہ محال تھا مگر وہ سمجھ گئے کہ ادیب اور سماج میں گونگا سہی مگر کوئی نہ کوئی گہرا رشتہ موجود ہے۔ حالی کا مقدمہ بنیادی حیثیت سے اسی انکشاف کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور اسی لئے ہمیں حالی کے نقطہ نظر میں کوئی تراش خراش زاویے یا تفصیل تعین کی خوبیاں نہیں ملتی ہیں۔ انھیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ادب اور سماج میں رشتہ موجود ہے

مگر سماجی اشاروں کو مکمل طرح نہ سمجھنے کی وجہ سے وہ ان کے لئے رشتہ کی
نوعیت اچھی طرح معین کرنا ممکن نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کے نقطۂ نظر
میں بھی ایک طرح کا گونگا پن موجود ہے۔ اسی لئے وہ ادبی راہ نمائی کرتا ہے
مگر بولتا نہیں ہے کسی مخصوص راستہ پر قدم بڑھاتے وقت شدت سے
درمیان میں حائل ہو جانا چاہتا ہے مگر قابل قبول وجہ نہیں بتایا جاتا ہے
اگرچہ اب اردو ادب میں بلکہ عالمی ادب میں نظریوں کی ایک بھرمار سی
نظر آتی ہے پھر بھی اب تک ادب کو کوئی بولتا ہوا نظریہ میسر نہیں آسکا ہے
اب بھی زیادہ سے زیادہ تتلاتے ہوئے نظریوں سے کام چل رہا ہے۔
حالی کے نظریات اور بزور مبہم ہوتے جا رہے ہیں غالباً ہر نیا آنے والا
سال ان کے نظریات پر اجمال و ابہام کی ایک نئی تہہ چڑھاتا جا رہا ہے اس کی
وجہ صرف یہی ہے کہ عہد جدید کا نقاد نسل در نسل منتقل ہونے والے فراوان
علمی اور تفتیشی ورثہ اور نیز اپنی بہتر ذاتی استعداد کی وجہ سے سماجی اشاروں
کے مطلب اور سماجی محرکات کی حقیقت زیادہ بہتر عنوان سے سمجھ رہا ہے۔
حالی کے دور میں ادب اور سماج کا رشتہ پھر بھی ایک نظری اور مجادلاتی
حقیقت تھا جب جدید یہ رشتہ بدیہی اور بحث سے بالاتر بن چکا ہے۔ اب
ساری بحث رشتہ کے وجود پر نہیں بلکہ نوعیت پر ہے جبکہ حالی کے یہاں زیادہ
بحث اس رشتے کے وجود پر ہے۔ اسی لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ حالی نے شاہراہ
دریافت کی اور اب زیادہ تر گلیاں دریافت کی جا رہی ہیں۔

حالی کا مقدمہ ہمیں گھنے جنگلوں اور بے تکے نشیب و فراز سے نکال کر

محض ایک چوراہے تک پہونچاتا ہے وہ کسی مخصوص سمت کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے عہد جدید کا نقاد خواہ وہ کسی مکتبہ خیال سے بھی تعلق رکھتا ہو اور کسی سمت میں بھی سفر کر رہا ہو پیچھے مڑ کر جب بھی دیکھے گا تو اسے حالی کا نشان جادہ چوراہا ہی نظر آئے گا۔ موجودہ عہد میں تنقیدی نظریات کے ارتقا کی وجہ سے مختلف اسکول الگ الگ ہو گئے ہیں ایک اسکول دوسرے اسکول سے صرف علیحدہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کی شدت کے ساتھ نفی بھی کرتا ہے کیا یہ بات حالی کی عظمت کا بین ثبوت نہیں ہے کہ موجودہ دور کے مختلف نظریات کے آپس میں شدید اختلاف اور تضاد کے باوجود حالی سب کا مشترک سرمایہ ہیں اب تک کوئی ایسا تنقیدی اسکول پیدا نہیں ہوا ہے جو حالی کی بنیادی باتوں کی نفی کر سکے حالی کے نظریات باوجود اپنی خامیوں کے حسن اور جس قدر آفاقی صداقت کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں وہ حالی کے بعد اردو زبان کے کسی نقاد کے یہاں نظر نہیں آتی ہے۔ حالی کی عظمت ذہن میں لانے کے لئے صرف اتنا ہی خیال کر لینا کافی ہے کہ حالی عہد جدید کے تمام نقادوں کے مشترک ماضی ہیں۔

حالی کی سماجی بصیرت ان کے بیشتر کارناموں سے عیاں ہوتی ہے۔ انکا مقدمہ ادب اور سماج کے مقدس روابطہ کی تفسیر ہے خود ان کی شاعری سماج کی تنقید ہے ان کے مقالات سماجی اشاروں کی کلید ہیں حیات جاوید سماجی کارکنوں کا تعارف و تحسین ہے یہ کارنامے سماج کی مثبت قدروں کو سامنے لاتے ہیں یادگار غالب اور حیات سعدی ایسے کارنامے درحقیقت سماج کے منفیات کی تشریح و محاکمہ ہیں۔

سماجی کلیات کو اپنا محور قرار دے لینے کی وجہ سے حالی کی ذات اس ایسے کائناتی حقائق تک ہو گئی تھی جنھوں نے حالی کو نظریاتی اعتبار سے نہ صرف حیات جاوید بخش دی بلکہ انھیں ادوار و اعصار کے تعینات سے بھی کافی بلند کر دیا اسی لئے حالی کسی دور یا عہد کے نقاد نہیں وہ ایک ایسے عصر کے مفکر ہیں جو کبھی فرسودہ نہیں ہو گا۔ تاریخی اعتبار سے وہ جدید نقادوں کے مشترک ماضی ہیں مگر بذات خود وہ 'حال' ہیں اسی لئے کم و بیش نصف صدی گزر جانے کے باوجود وہ کہنہ نہیں ہوئے وہ کی طرح محفوظ نہیں ہیں بلکہ آثار حیات سمت زندہ ہیں مستقبل ہمیشہ حال بن بن کر حالی کے لئے فرش راہ بنتا رہے گا اور حالی نہ کبھی غلط ہوں گے اور نہ ماضی زدہ۔ ان کے فنی اور نظریاتی پس منظر کے اعتبار سے ان کا تخلص حالی کافی معنی خیز اور خیال آفرین (Suggestive) ہے وہ ماضی کے بجائے 'دائمی حال' کے مفکر ہیں اور اپنے کردار و گفتار کے اعتبار سے قال کے بجائے حال کے انسان ہیں۔ انکی شاعری اور ان کے مقدمہ نے اس عہد کے ادبی حلقوں نے ان کی عادتوں اور روایتوں کے علی الرغم ایک نئی صورت حال سامنے کھڑی کر دی تھی جس کی اجنبیت اس کی افادیت کا حجاب بن گئی تھی۔ ہندوستان کے طول و عرض میں ایک ادبی دار و گیر کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ جس کی لپیٹ میں بہت ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے جنھیں جلد ہی پلٹ کر پھر حالی کی طرف آنا پڑا جسکی سب سے اچھی مثال مولانا حسرت موہانی ہیں۔ ادھر پنج کا گروپ اگرچہ احمد علی شوق قدوائی تمیت اگرچہ حالی کے خلاف صف آرا رہا اور پانی پت کے میدان کو

خالی ڈھول پیٹ پیٹ کر جیت لینے کے لئے مبارز طلبی کرتا رہا۔ مگر تابہ کے قال کی گونج گونج حال کی سنجیدگی نے آخر کار دبا ہی لیا اور ماضی بعید کی بلند آوازیں آخر کو حال کے غلغلوں میں بکھر کے منتشر ہو گئیں۔ یہ ساری ہما ہمی اور دار و گیر در حقیقت قدیم اور جدید کے درمیان میں ایک آخری رد و بدل تھی جس کی کشمکش نے دورِ جدید کا آغاز کیا حالیؔ دورِ جدید کے آغاز کا کوئی بھی ادبی یا سماجی دور دفعتہً نہیں شروع ہوتا ہے۔ عالمِ خلق کی تدریج صرف اجسام کے ارتقا و آفرینش میں نہیں بلکہ نظریات و افطار کی آفرینش و ارتقا میں بھی نظر آتی ہے۔ حالیؔ اردو ادب اور تنقید کے دورِ جدید کے بانی ضرور ہیں مگر دورِ جدید کا خمیرہ بہت پہلے سے تیار ہو رہا تھا جسے تیار کرنے میں سر سید مولوی نذیر احمد، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، مولانا محمد حسین آزاد اسمٰعیل میرٹھی اور خود حالیؔ کے علاوہ غالبؔ کے خطوط اور آخری دور کی شاعری کا بھی بڑا حصّہ ہے۔ ایک عرصہ تک سماجی اور تاریخی قوتوں میں رد و بدل ہوتی رہی۔ خط و خال بنتے اور بگڑتے رہے زلفیں الجھتی اور سنورتی رہیں اور آخر طویل کشمکش کے بعد وہ خلا نمودار ہوا جسے پھاند کر ادب اور تنقید کی انقلاب آمادہ قوتیں ایک نئے دور میں داخل ہو گئیں۔ اس موقع پر نہ اس کشمکش کا مفصل جائزہ لینا ہے اور نہ اس حصہ کارگزاری کا جسے حالیؔ نے ایسے اہم موڑ پر انجام دیا تھا۔ مختصراً یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح انواع کے ارتقاء میں وہ منزل آتی ہے جبکہ ایک نوع ترقی کرتے کرتے اس مرحلہ پر پہونچ جاتی ہے جس سے قریب ہی دوسری نوع کا سرا ہوتا ہے اور پھر اسی

نچلی نوع کے مادی خصائص کی بنیاد پر ایک نئی اور بہتر نوع کا آغاز ہو جاتا ہے اسی طرح جب ادبی قوتیں انحطاط پذیر ہوتی ہیں تو ان کے انحطاط اور سماجی قوتوں کے عمل کی وجہ سے اس مثبت و منفی کا وجود ہوتا ہے جو نئے دور اور نئے نظریات کا ہیولیٰ تیار کرتے ہیں اور اس طرح پرانا نئے کے لئے جگہ بنا کر الگ ہو جاتا ہے۔ مگر نیا مکمل طور پر نیا کبھی نہیں ہوتا ہے اس میں پرانے عناصر بہر حال موجود ہوتے ہیں جن کے بغیر نئے کا وجود ممکن ہی نہیں ہے اردو ادب و تنقید کے دور جدید کا آغاز بھی اسی اسلوب پر ہوا ہے اگر حیاتیاتی ارتقاء اور اس کے کوائف کو پیش نظر رکھ کر جائزہ لیا جائے تو حالی کے متعلق یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ ادبی ارتقاء میں اس محل کی نمائندگی کرتے ہیں جہاں ایک انقلاب آمادہ نوع ترقی کر کے دوسری نوع بنتی ہے حالی قدیم اور جدید کا ایک درمیانی خط ہیں وہ جدید کے آغاز سے ان کا تعلق تقریباً ویسا ہی ہے جیسا دور قدیم کے اختتام سے اسی لئے حالی کے اندر خالص قدیم کلاسکیت بھی ملتی ہے اور آغاز کی ناتراشیدگی بھی۔

حالی کے مقدمہ میں تمہیدیں اور مواد کی ترتیب و تدوین عام طور سے درست ہے مگر بیشتر اصناف سخن کے متعلق ان کے نکالے ہوئے نتیجے اور اس ضمن میں بہت سے دیئے ہوئے مشورے اعتدال سے منحرف ہونے کی بنا پر درست نہیں ہیں ادب اور سوسائٹی کے باہمی ربط کو اپنے نظریہ کی بنیاد بنانے کے باوجود وہ مختلف اصناف کا اس عہد کے سماجی رجحانات اور عوامل کے زیر اثر جائزہ لینے سے خود قاصر رہے وہ ہمارے غزل کے

ذخیرہ سے اس طرح خفا تھے کہ جیسے یہ ذخیرہ انھیں کے عہد میں پیدا ہو رہا تھا وہ مثنویوں پر اس طرح برہم تھے کہ جیسے اردو کی تمام مثنویاں ان کے معاصرین کی لکھی ہوئی تھیں تاریخی ارتقا اور اس کے بدلتے ہوئے عوامل کا وہ شعور رکھتے تھے مگر عملی تنقید کے وقت انھوں نے اس شعور سے پورا کام نہیں لیا ان کے مقدمہ کا نظریاتی حصہ راہ نما ہے مگر عملی تنقید کے حصے راہ زن ہیں بالخصوص غزل کے متعلق انھوں نے مقدمہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ خاصا انتہا پسندی پر مبنی ہے ان کی یہ ساری تحریر خالص ادبی نقطۂ نظر سے اردو ادب کے مختصر سے خزانہ میں ایک بے بہا اضافہ ہے مگر معنوی نقطہ نظر سے اس کی بیشتر باتیں ناقابل قبول ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس جذباتی آہنگ سے عملاً بالکل ناآشنا تھے جس کے بغیر غزل میں رعنائی ودلبری پیدا نہیں ہوسکتی ہے ان کا یہ کہنا کہ "دنیا میں ایک انقلاب عظیم ہو رہا ہے اور ہوتا چلا جاتا ہے آجکل دنیا کا حال صاف اس درخت کا سا نظر آتا ہے جس میں برابر نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں اور پرانی ٹھنیاں جھڑتی چلی جاتی ہیں...... پرانی قومیں جگہ خالی کرتی جاتی ہیں اور نئی قومیں ان کی جگہ لیتی جاتی ہیں یہ کوئی گنگا جمنا کی طغیانی نہیں ہے جو آس پاس کے دیہات کو دریا برد کر کے رہ جائے بلکہ یہ سمندر کی طغیانی ہے جس سے تمام کرۂ زمین پر پانی بھرتا نظر آتا ہے اگر کوئی دیکھے اور سمجھے تو صدہا تماشے صبح سے شام تک ایسے عبرت خیز نظر آتے ہیں کہ شاعر کی تمام عمر اس کی جزئیات کے بیان کرنے کے لئے کافی نہیں ہوسکتی۔ کسی موقعہ کو دیکھکر تعجب ہوتا ہے کہ یہ کیا ہوا کسی کو دیکھکر افسوس ہوتا ہے کہ یہ کیوں ہوا کبھی خوف

معلوم ہوتا ہے کہ کیا ہوگا اور کبھی یاس دل پر چھا جاتی ہے کہ نہیں اب کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ دلچسپ میٹیریل غزل کے لئے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر بات کا ایک محل اور ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے عشق و عاشقی کی ترنگیں اقبال مندی کے زمانے میں زیبا تھیں اب وہ وقت گیا عیش و عشرت کی رات گذر گئی اور صبح نمودار ہوئی اب کالنگڑے اور بھاگ کا وقت نہیں رہا اب جوگئے کی الاپ کا وقت ہے۔"

نہ صرف ان کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتا ہے بلکہ ان کی ذہنی کارکردگی کے طریقوں پر بھی روشنی ڈالتا ہے ان کا یہ اقتباس ان کے مقدمہ کے بنیادی صفات کا آئینہ دار ہے اس اوسط درجہ کے اقتباس میں بھی تمہید اور مواد کی تدوین بالکل درست ہے مگر نتائج غلط ہیں اس لئے کہ ان ساری باتوں کے باوجود اور ان کی صحت پر مکمل یقین کر لینے کے بعد بھی غزل کو بنیادی حیثیت سے تبدیل کر دینے کا جواز نہیں پیدا ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ نئے مسائل کی آمد نے ابلاغ و اظہار کی دشواریاں پیدا کر دی تھیں مگر ان کا درست حل یہ نہیں ہے کہ کسی موجود اور پختگی پر پہونچی ہوئی صنف سخن ہی کو تبدیل کر دیا جائے بلکہ کسی نئی صنف سخن کا پیدا کرنا زیادہ بہتر ہے۔ اردو ادیبوں نے حالی کے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور عہد جدید کے مسائل پر غزل کو قربان کرنے کے بجائے نظم کی ایک مستقل صنف کو فروغ دیا جو غزل کے ہمدوش اب بھی ترقی کرتی جا رہی ہے حالی بھی نظموں کا راستہ دیکھ چکے تھے مگر ہیئت کی یکسانیت کی وجہ سے وہ غزل اور نظم کو ایک دوسرے میں الجھاتے رہے اور پھر جذباتی بلکہ

عشقی آہنگ کی کمی کی وجہ سے غزل کے خون سے نظم کی پرورش کا مشورہ دیتے رہے ان باتوں کا مقصود غزل کو اصلاح سے بلند رکھنا نہیں ہے مگر حالی اپنے جن مشوروں کا نام اصلاح رکھتے ہیں وہ درحقیقت اصلاحی نوعیت نہیں رکھتے ہیں بلکہ عملاً غزل کو ختم کرتے ہیں۔ حالی نے شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ رائے قائم کر لی تھی کہ اردو غزل کا سماجی قوتوں سے رشتہ ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے اس میں وسیع تبدیلی کر دینا ضروری ہے مگر حقیقت اس کی برخلاف تھی غزل ظاہری اعتبار سے مسخ ہو جانے کے باوجود اپنے اندر سماجی روح رکھتی تھی۔ اس لئے وہ حالی کے کھلے ہوئے دشنہ و خنجر کی آزمائش جھیل کر بھی زندہ رہی۔ غزل کے متعلق حالی کی کہی ہوئی بیشتر باتیں صرف ایک صحیح نظریہ کے غلط اطلاق کو ظاہر کرتی ہیں اور بس۔ حالی اس بنیادی نکتہ کو نہیں سمجھ سکے کہ غزل کا کوئی مخصوص وقت نہیں ہوتا ہے نہ وہ اقبال مندی کے عہد سے مخصوص ہے اور نہ ادبار و زوال کے دور سے غزل کے سحر و شام عرف عام والے سحر و شام سے مختلف ہیں۔ غزل اپنی معنوی استقبالیت اور موج در موج کا عنوان رکھنے کی بنا پر صرف عیش و عشرت کی رات ہی کو منور نہیں کرتی ہے بلکہ اس صبح کی ترجمانی بھی کرتی ہے جو سوز و ساز و نا و نوش کے ہنگاموں سے محروم ہو کر داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع پر باسی پھول نچھاور کرتی ہے اور اپنے چاک گریباں سے آفتاب تازہ بھی پیدا کرتی ہے۔

حالی نے اردو ادب کے مختلف اصناف کی تنقید میں خاصی خطابت سے کام لیا ہے بیشتر مقامات پر وہ رواں اور پر شکوہ طرز تحریر کے ذریعہ سے

پڑھنے والے کے ذہن کو بڑی جلدی متاثر کر لیتے ہیں۔ نہ صرف ان کے مقدمہ کو پڑھ کر اردو شاعری کے متعلق رائے قائم کرنے والا یقیناً گمراہی میں مبتلا ہوجائیگا ان کے مقدمہ میں جابجا ایک مسحور کن سماں بندی ملتی ہے جس کی شدید مقناطیسیت کی طرف پڑھنے والا زبردستی کھینچتا ہے مگر ظاہر ہے کہ اس کا اثر دیرپا نہیں ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ مناسب ذہانت رکھنے والا قاری پیچ وخم سے باہر نکل آتا ہے غزل کے پھیلاؤ اور گہرائی کی وجہ سے حالی نے اس قسم کی سماں بندیاں اسی صنف سخن کے سلسلہ میں زیادہ کی ہیں۔ وہ عشقیہ شاعری کی معنوی اور لفظی کوتاہیوں کو بڑے دل پذیر انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ غزل کے مضامین کی ایک موٹی فہرست بیان کر کے بادی النظر میں غزل کو بالکل محدود اور تنگ دامن صنف سخن ثابت کرتے ہیں مگر وہ ان طویل اور بے کراں سماجی رشتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جو غزل کے ہر انفرادی مضمون سے وابستہ ہیں۔ اصطلاحات غزل کے متعلق وہ یہ ضرور کہتے ہیں "غزل کے ساتھ جو الفاظ مخصوص ہیں وہ بھی ایک نہایت تنگ دائرہ میں محدود ہیں" اور پھر وہ کہ رمزیات کی ایک فہرست لکھ کر قصہ ختم کر دیتے ہیں۔ مگر انھیں اس کی خبر نہیں ہے کہ ایک علامت باوجود ایک اکائی ہونے کے اپنے اندر کتنی وسعت رکھتی ہے حالی علامتوں (SYMBOLS) کی اہمیت سے قطعاً واقف نہیں ہیں۔ وہ علامتوں کو شاید ان کے لغوی معنوں میں محدود سمجھتے ہیں انھیں اس بات کی خبر نہ ہونا کچھ زیادہ تعجب خیز بھی نہیں ہے کہ ایک علامت اپنی جگہ پر ایک دنیا ہوتی ہے وہ بظاہر مختصر ہونے کے باوجود بے شمار پہلو رکھتی ہے جن سے بے شمار ایسے جذبات و

احساسات وابستہ رہتے ہیں جنھیں الفاظ اور تعبیرات کے ذریعہ سے ظاہر کرنا ممکن نہیں ہو سکتا ہے شاعر انھیں علامتوں کا رمزی پیراہن پہنا کر ابلاغ کی راہوں پر ڈالتا دیتا ہے اور انھیں کچھ نہ کچھ ظہور کا موقع مل جاتا ہے۔ حالی شمع و پروانہ اور آشیاں و قفس ایسے الفاظ کو محض سخن آرائی سمجھتے ہیں انھیں یہ خبر نہیں کہ غزل کی ساری وسعت اس کی رمزیت ہی میں پنہاں ہیں۔ ہر وہ نقاد جو رموز (SYMBOLS) کی اہمیت سے واقف نہیں ہوگا غزل کو نہایت محدود صنعت سخن قرار دے گا حالی بھی رموز کی حقیقت اور ایجازیت سے واقف نہیں ہیں اسی لئے انھوں نے غزل کو بھی محدود اور تنگ سمجھا۔

یہ تمام سب باتیں حالی کے اندر ایک مخصوص قسم کی خشونت کا پتہ دیتی ہیں۔ حالی کی شخصیت میں ایک ایسی کمی تھی جس پر بڑا افسوس ہوتا ہے یہ کمی احساس جمال کی تھی۔ احساس جمال کی کمی ان کے تمام کارناموں سے عیاں ہوتی ہے انھوں نے سوسائٹی کے جلال کو بڑی خوبی کے ساتھ سمجھا وہ آئینہ سے محروم تھے اس لئے سوسائٹی کے جمال کا نظارہ نہ کر سکے۔ ان کے تنقیدی نظریات میں بھی جمال سے زیادہ جلال کارفرما ہے اور یہی بات ان کی شاعری کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ ان کی شاعری لفظاً و معناً احساس جمال کی فریادی ہے انھیں ان میں احساس جمال اسی طرح کم تھا جیسے کسی محتسب میں کم ہوتا ہے اسی لئے ان کی تنقید نگاری اور شاعری دونوں میں احتسابی عنصر زیادہ ملتا ہے احساس جمال کی کمی ان کی تنقیدوں میں تو پھر بھی جا بجا ابھرنے کے باوجود کسی نہ کسی حد تک ڈھکی چھپی رہی مگر شاعری کی رنگین دنیا میں کسی طرح چھپائے نہ چھپی خصوصیت کے ساتھ ان کی نظموں اور مسدس میں باوجود ہر طرح کی

اخلاقی اور عرفانی خوبیوں کے شاعری اسی سے عنصر کی کمی محسوس ہوتی ہے یہ کمی ان کے ناقص احساس جمال کا نتیجہ ہے۔

مہدی افادی نے حالیؔ کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ چھوٹے کپڑوں سے ڈرتے تھے" یہ بات صحیح ہے۔ مگر اس میں اتنا اضافہ اور کر لینا چاہیئے کہ وہ رنگین کپڑوں سے بھی ڈرتے تھے۔

شجاعت علی سندیلوی

حالی اور غالب

باکمال اُستاد کا باکمال شاگرد

اردو ادب کی یہ انتہائی خوش بختی تھی کہ غالب جیسے باکمال استاد کو حالی جیسا ہونہار شاگرد مل گیا، جس نے اردو شعر و ادب کے دھارے کو سیدھے راستے کی طرف موڑ کر نئی زندگی بخشی۔ یہ محض حسن اتفاق تھا کہ حالی کی ملاقات غالب سے ہوئی، اگر حالی گھر سے روپوش ہو کر، طلب علم میں دلی بھاگ کر نہ جاتے اور نہ وہاں درس و تدریس کے لئے قیام نہ کرتے، اور ان کی ملاقات غالب سے نہ ہوتی تو شاید اردو شعر و ادب کے چمنستان میں مرجھائے ہوئے پھولوں کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا، دنیا میں بہت سے نیک اور اچھے کام اتفاقات کی بدولت ظہور میں آتے ہیں۔ سائنس کی حیرت انگیز ایجادیں، بہت کچھ انھیں 'اتفاقات' کی مرہون منت ہیں۔ اسی طرح حالی اور غالب کی ملاقات ایک اتفاق تھا

بہر حال حالی جب پہلی مرتبہ ۱۸۵۳ء میں دلی آئے اور انھوں نے مولانا نوازش علی سے جو مشہور عالم اور واعظ تھے اور مولوی حسین بخش کے مدرسہ میں درس دیا کرتے تھے، عربی پڑھنا شروع کی۔ مولوی صاحب کے علاوہ دیگر مشاہیر ادب اور علماء سے بھی فیض حاصل کیا، دلی میں اس وقت بڑے بڑے صاحب کمال موجود تھے۔ بہادر شاہ ظفر، استاد ذوق، مرزا غالب، آزردہ، صہبائی، شیفتہ جیسے یکتائے روزگار باکمالوں کی وجہ سے دلی عروس ادب بنی ہوئی تھی، شعر و ادب کی محفلیں گرم رہتی تھیں، اگرچہ اس کے گلی کوچے اب اوراق مصور نہیں رہے تھے۔ اور ان میں وہ رعنائی دکشش، باقی نہیں رہی تھی، تاہم اس کے مٹے ہوئے نقوش میں بھی وہ حسن اور رنگ باقی تھا کہ جس پر سب لوگ فریفتہ تھے؛ چمنستان سخن کی بہار خزاں آلودہ ہوچکی تھی ایک ایک کرکے سارے پھول مرجھائے جا رہے تھے۔ مومن مرحوم ۱۸۵۲ء میں سدھار چکے تھے۔ ذوق مرحوم چراغ سحری تھے۔ غالب بھی بوڑھے ہوچکے تھے لیکن ان سب کے نام لیواؤں کی کمی نہ تھی اور کسی نہ کسی طرح وہ ادبی شان کو قائم رکھے ہوئے تھے، مشاعرے ہوتے، شعر و سخن کی محفلیں جمتیں۔ حالی ان میں شریک ہوتے، دن میں حدیث و فقہ پڑھنے والا طالب علم رات میں بزم رندان ادب میں شریک ہوتا اور جی بھر کر میخانہ ادب کے چھلکتے ہوئے جام پیتا، یہی شوق ان کا رہنما بنا اور ایسے پیر مغاں کے پاس لے گیا جس نے حالی کو خستہ[1] سے حالی بنا دیا۔

---

[1] حالی کا تخلص خستہ تھا

پیر مغاں کے انتخاب میں حالی نے اپنے فطری ادبی شعور سے کام لیا اور ایسے رند نما شیخ کے ہاتھ پر بیعت کی جو مرجع کرام و ثقات تھا۔ اپنی اور اس شیخ بذلہ سنج (مرزا غالب) کی ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"جس زمانہ میں میرا دلی جانا ہوا تھا، تو مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی کے قصیدے اپنے دیوان سے انھوں نے مجھے پڑھائے بھی تھے[۱]"

اس تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حالی انقلاب ۱۸۵۷ء سے پہلے غالب سے مل چکے تھے اور انھوں نے غالب کے فارسی قصید سے سبقاً سبقاً پڑھے تھے نیز حالی کو غالب کے کلام سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ اگرچہ یہ زمانہ وہ تھا جب غالب مہمل گو، مشہور ہو چکے تھے اور

کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

زباں زد خاص و عام تھا۔ خود مرزا کو بھی اس کا احساس تھا۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا — نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی
یارب وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

---

۱ مقالات حالی جلد اول صفحہ ۲۲۵

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

لیکن اٹھارہ سالہ نوجوان حالی اوران کے تمام سخنوران کامل سے بازی لے گیا، اسے غالب کے کلام میں اک جہان رنگ و بو، اک آفتاب تازہ نظر آیا جدت وندرت کی فراوانی اور تخیل کی بلندی نظر آئی۔ دشنہ وخنجر میں تازہ غمزہ اور بادۂ وساغر میں جلوۂ حق کو سب سے پہلے اسی نے دیکھا اور جس چیز کو وہ اچھی طرح نہ سمجھ سکا اسے خود غالب سے سمجھنے کے لئے گیا کہ ؎

"التصنیف رامصنف نیکو کند بیاں"

مرزا غالب کو یہ ادائے خاص پسند آئی۔ انھوں نے نوجوان حالی کو آبروئے شیوہ اہل نظر کا امین پایا۔ حالی نے مطلب سمجھتے سمجھتے خود اپنے اشعار بھی اصلاح کے لئے پیش کرنے کی جرأت کی، غالب جیسا نکتہ شناس سخنور شعر وشاعری کی صلاح دوسروں کو بہت کم دیا کرتا تھا، وہ شمع ادب کے فروغ حسن کے لئے دل گداختہ پیدا کرنا ضروری سمجھتا تھا۔

حسن فروغ شمع سخن دور ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

لیکن شاید حالی کو دل گداختہ پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور شمع سخن کے فروغ حسن کے لئے ان کے پاس وہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں جو ضروری ہیں اسی لئے غالب نے انھیں منع نہیں کیا بلکہ ان الفاظ کے ساتھ انکی

ہمت افزائی کی

"اگرچہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔"

مرزا غالب کے ان مفید ہمت افزا کلمات نے حالی کے سمند شاعری پر تازیانہ کا کام کیا اور شاعری کا وہ پاکیزہ چشمہ جو زمانہ کے حادثات کی وجہ سے کبھی کبھی ابلتا رہتا تھا اب ابلنے کے لیے بیتاب ہو گیا۔ لیکن حالی کو اس وقت طلب علم کی دھن تھی اور وہ اسی میں زیادہ وقت صرف کرتے تھے اس لیے وہ شعر کہنے کی طرف بہت کم توجہ دیتے تھے، اس زمانہ میں دو ایک غزل سے زیادہ نہیں کہہ سکے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حالی نے غالب ہی سے کیوں مشورہ سخن کیا اور انھیں کو شعر سمجھنے کے لئے کیوں منتخب کیا؟ جبکہ دلی میں دوسرے باکمال حضرات موجود تھے اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ ان کا فطری ذوق ان کا رہنما بنا لیکن دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ غالب کو وہ فارسی میں سب سے بہتر سمجھتے تھے اور وہ ہر زبان یا ہر فن ایسے شخص سے پڑھنا چاہتے تھے جو اس فن یا زبان کا ماہر ہو۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے دلی میں مومن، ذوق اور غالب ہی زیادہ مشہور تھے۔ مومن کا انتقال دلی میں حالی کی آمد سے پہلے ہو چکا تھا۔ ذوق بہت بوڑھے اور گوشہ نشیں تھے۔ اب لے دے مرزا غالب کو ان کی شاعری ابھی مابہ النزاع تھی اچھے شاعر ہونے پر بھی وہ بدنام زیادہ تھے۔"

"شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے۔"

مگر حالی نے ان کا کلام پڑھا ان کی فارسی دانی کے قائل ہوئے، ان کے کلام میں جان پائی اور ان کے اندر وہ تمام خوبیاں دیکھیں جو ان کے ادبی ذوق کو تسکین دے سکتی تھیں اور جب حالی، غالب سے پڑھنے لگے تو ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کے معتقد ہو گئے۔

حالی جب تک دلی میں رہے مرزا غالب کی خدمت میں وقتاً فوقتاً حاضر ہوتے رہے تقریباً ڈیڑھ برس تک قیام رہا اس کے بعد گھر والوں (بڑے بھائی) کے مجبور کرنے پر پانی پت ۱۸۵۵ء میں واپس چلے آئے اور بظاہر یہ سلسلہ ختم ہو گیا لیکن تعلق خاطر قائم رہا

بعض حضرات غالب سے حالی کی ملاقات ۱۸۵۷ء کے بعد تحریر فرماتے ہیں جو صحیح نہیں ہے مثلاً حالی کے متعلق امین زبیری لکھتے ہیں:

"قلعہ معلی کے مشاعروں میں فارسی اور اردو غزلیں پڑھنے سنا تھا"[۱] قلعہ معلی میں حالی کی شرکت مشکوک ہے اس سلسلہ میں صاحب نادرات غالب کو بھی سہو ہوا وہ لکھتے ہیں

"قلعہ معلی میں حالی کی موجودگی میں زیادہ سے زیادہ آخری مشاعرہ پنجم جولائی ۱۸۵۳ء میں ہوا تھا جس میں غالب شریک ہوئے تھے"[۲]

لیکن اس آخری مشاعرہ میں حالی شریک ہی نہیں ہوئے۔ حالی کی شادی سترہ برس کی عمر (آخر ۱۸۵۳ء) میں ہوئی تھی شادی کے بعد کچھ

---

[۱] تذکرہ حالی امین زبیری صفحہ ۳

[۲] نادرات غالب (آفاق حسین آفاق صفحہ ۱۰۰

دنوں تک وہ پانی پت میں رہے اور جب موقع ملا تو چھپ کر دلی گئے اس لئے جولائی ۱۸۵۳ء میں وہ پانی پت ہی میں تھے پھر دلی میں ہونا اور مشاعرہ سننا محض قیاس ہے واقعہ نہیں، مالک رام نے تو ۱۸۵۴ء میں گھر سے نکلنا اور دلی پہنچنا بیان کیا ہے

غرض حالی کی ملاقات مشاعرہ میں نہیں ہوئی نہ انھوں نے قلعہ معلی کے مشاعروں میں غالب کو پڑھتے سنا بلکہ وہ مرزا غالب کے دولتکدہ پر حاضر ہوتے تھے اور وہیں ان سے سبق لیتے تھے۔ اور ان کے اشعار کا مطلب سمجھتے تھے۔

پانی پت واپس آنے کے بعد غالب سے ظاہری تعلق ختم ہوگیا۔ حالی فکر معاش میں پڑ گئے۔ حصار میں ملازمت کی پھر ۱۸۵۷ء میں خونی انقلاب آیا، ملازمت ترک کر کے، لٹ پٹ کر وطن پہنچے، چار برس تک قیام کیا، تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور جب امن و امان ہوگیا تو پھر تلاش معاش میں دلی پہنچے اور تقریباً دو سال تک تلاش معاش میں حیران و سرگرداں رہے لیکن واہ رے طالب علم اور ذوق ادب کہ اس پراگندہ روزی کے زمانہ میں بھی وہ پراگندہ دل نہیں ہوئے اور شعر و سخن کی محفلوں میں برابر شریک ہوتے رہے اسی عرصہ میں ان کی ملاقات حسن اتفاق سے شیفتہ سے ہو جاتی ہے اور شیفتہ اس جوہر قابل کو اپنا ادبی مصاحب اور اپنے بچوں کا اتالیق بنا لیتے ہیں اور جہانگیر آباد لے آتے ہیں۔ اور سات آٹھ برس تک ان کا ساتھ رہتا ہے شیفتہ مومن

شاگرد تھے۔ مومن کے بعد غالب کے شاگرد ہوئے۔ غالب شیفتہ کی سخن فہمی و سخن سنجی کے قائل تھے۔ حالی بھی شیفتہ کے مذاق شاعری کو بلند اور اعلیٰ سمجھتے تھے۔[۱] حالی کا میلان طبعی شیفتہ کی صحبت سے چمک اٹھا۔ اور وہ بھی شیفتہ کے ساتھ اپنا کلام مرزا غالب کی خدمت میں اصلاح کیلئے بھیجنے لگے۔ لیکن حالی کی حق پسند طبعیت کا اعتراف دیکھئے کہ وہ صاف صاف لکھتے ہیں کہ

"درحقیقت مرزا کے مشورہ اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا بلکہ جو کچھ فائدہ ہوا وہ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔"[۲]

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفیض ہوں
شاگرد میرزا کا مقلد ہوں میر کا

حالی جیسے "مقلد" اور عزیز شاگرد کا اعتراف، ان کی حق پسند طبعیت کا شاہد ہے

حالی مستقل طور پر جہانگیر آباد میں رہتے تھے لیکن کبھی کبھی شیفتہ کے ساتھ دلی بھی جاتے تھے اور قیام کرتے تھے۔ غالب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے ان کو غالب سے بے پناہ محبت و عقیدت تھی۔ وہ غالب کو صفات و خصائص انسانی کا مجموعہ سمجھتے تھے۔ انھیں غالب کے اندر وہ ادبی شان نظر آتی تھی جس سے دوسرے ارباب کمال

---

[۱] مقالات حالی حصہ اول صفحہ ۲۶۷

[۲] " " " " " "

محروم تھے، اس پیکر علم و ادب اور مجسمہ انسانیت میں انھیں ایک چیز جو شدت کے ساتھ کھٹکتی تھی، وہ تھی مذہب سے غالب کی بے تعلقی۔ حالی نے مذہبی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں ان کی تعلیم و تربیت، مذہبی انداز سے ہوئی تھی، شیفتہ مرحوم بھی مذہبی انسان تھے ان کی صحبت نے حالی کے مذہبی رنگ کو بھی نکھارا۔ حالی کو اپنے شفیق استاد کی یہ بے راہ روی پسند نہ آئی۔ انھیں اس بات کا سخت صدمہ تھا کہ ان کا محترم استاد عقبیٰ سے غافل ہے اور اپنی کبر سنی اور بزرگی کے باوجود راہِ جنت سے دور ہے

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی!

آخر پیمانہ صبر چھلک جاتا ہے، محبت، عقیدت اور خلوص کے قلم سے لکھتے ہیں

"ایک روز مرزا کی بزرگی و استادی اور کبر سنی کے ادب اور تنظیم کو بالائے طاق رکھ کر خشک مغز واعظوں کی طرح ان کو نصیحت کرنی شروع کی ... نماز پنجگانہ کی فرضیت اور تاکید پر ایک لمبا چوڑا مضمون لکھ کر ان کے سامنے پیش کیا"[1]

یہ مخلصانہ و مودبانہ نصیحت جب غالب نے پڑھی تو ان کے بے ریا دل پر سخت چوٹ لگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کے پاس مخالفین خطوں میں فحش و دشنام لکھ کر بھیجتے رہتے تھے غالب کو حالی کے اس لکچر سے بید صدمہ ہوا، انھوں نے

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۷۸

اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور لکھا

"اس میں شک نہیں کہ میں موحد ہوں، ہمیشہ تنہائی اور سکوت کے عالم میں یہ کلمات میری زبان پر جاری رہتے ہیں۔

"لا الہ الا اللہ، لا موجود الا اللہ، لا موثر فی الوجود الا اللہ"[1]

مولانا حالی واپس چلے گئے، دوسرے دن مرزا غالب نے ایک غزل لکھ کر حالی کے پاس بھیجی جس کا مطلع یہ ہے

مقصدے کہ مرآں را رہ خدا گویند
بردبرد کہ ازاں سو بیا بیا گویند

حالی خاموش نہیں رہے انھوں نے بھی جواب الغزل میں قطعہ لکھکر بھیجا جس میں شکر و شکایت دونوں کے پہلو تھے۔

تو اے کہ رونق بیش بیاں بہم بشکست
زنظم و نثر تو کاندر زمانِ ماگفتی

مرزا غالب نے اس قطعہ کا جواب حالی کو براہ راست نہیں دیا بلکہ اپنے دوست اور شاگرد نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو مخاطب کرکے نہایت لطیف پیرایہ میں ایک چار بیتی قطعہ لکھکر بھیجا جس میں حالی کی نصیحت پر لطیف و بلیغ طنز ہے

تو اے کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری — ہمی بہ لطف تو خود را امید دار کنم
چو حالی از من آشفتہ بے سبب رنجید — تو گر شفیع نہ گردی بگو چہ کار کنم

---

[1] یادگار غالب صفحہ ۷۹

دوبارہ عمر دہندم اگر بفرضِ محال — بر آں سرم کہ در آں ایں دو کار کنم
یکے ادائے عباداتِ عمرِ پیشینہ — دگر بہ پیشِ کہ حالی اعتذار کنم

اداشناس شاگرد سمجھ گیا کہ اس کی نصیحت سے غالب کو کتنی تکلیف ہوئی جذباتِ ندامت نے پیراہنِ الفاظ پہن کر معذرت کی۔

تو اے کہ عذر فرستادہ سوئے رہی — سزد کہ جاں گرامی بر آں نثار کنم
چہ شکوہ جز بہ تقاضائے دوستی نہ بود — ز غیرِ شکر و شکایت ز دوستدار کنم
بر آں سرم کہ اگر مرگ اماں دہد زیں پس — ز کارہائے جہاں خاصہ ایں سہ کار کنم
ز کردہ توبہ نمایم، ز گفتہ استغفار — دگر سپاسِ تو پنہاں و آشکار کنم[1]

شفیق استاد، اپنے عزیز شاگرد کی محبت و خدمت کی قدر کرتا تھا۔ اس نے یہ سلسلہ بیت بختی ختم کرنے کا حکم لکھدیا " بس اب بیت بختی موقوف" اور اطاعت گذار شاگرد نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ غالب کے دل میں حالی کی جو قدر و منزلت تھی اس کا سبب یہی تھا کہ حالی جیسا فرمانبردار، نیک، ذہین اور باشعور شاگرد ان کو مشکل سے ملا تھا۔ حالی نوجوانی کی اس نصیحت کو عمر بھر بے ادبی سے تعبیر کرتے رہے اور ہمیشہ افسوس کرتے رہے

اس واقعہ کے بعد مولانا حالی جہانگیر آباد واپس چلے گئے، لیکن دل استاد کے پاس لگا رہا اس لئے وہ اور نواب شیفتہ دونوں جلد واپس آگئے۔ کیونکہ غالب اپنی مسلسل علالت اور پیرانہ سالی کی وجہ سے مرنے کی راہ دیکھ رہے تھے کہ اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے؟

---

[1] یادگارِ غالب۔ صفحہ ۴۹

بالآخر وہ وقت موعود آپہنچا جس کا وہ بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے تھے۔

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

یکشنبہ، ۲ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو مرزا غالب کا انتقال ہو گیا۔ حالی اس وقت دلی میں موجود تھے۔ جنازے میں شریک ہوئے اور استاد کے غم میں اس طرح روئے کہ سارا جہاں اشکبار ہو گیا۔ یہ صدمہ حالی کے لئے ناقابلِ برداشت تھا۔ ان کے لئے دنیائے ادب سونی ہو گئی کہ

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں ایک چراغ تھا نہ رہا

یہ مرثیہ نہیں، جگر کے ٹکڑے ہیں جو آنسوؤں میں مل کے بہہ نکلے۔ یہ مرثیہ "غم سیاں" ہے جس کا ایک ایک لفظ پیکرِ حزن و ملال ہے۔ سوگوار و غمزدہ حالی نے کیسے بھولے پن اور سیدھے سادے انداز میں اپنے غم انگیز جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

دلِ مضطر کو کون دے تسکین؟ ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج!
کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج!

قبر کو منتظر دیکھ کر حالی بے قرار ہو جاتے ہیں اور وارثانِ میت سے کہتے ہیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں اہلِ میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں

یہ بات قابلِ قبول کہاں ہوسکتی تھی، غالب کے لئے آئین شریعت سے کیسے انحراف کیا جاتا؟ اس لئے آخری دیدار کے لئے درخواست کی

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے غالب بے مثال کی صورت
اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

لیکن حالی کا کیا ہوگا؟ کیونکہ ابھی تک

شعر میں ناتمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا کون؟

غرض مولانا حالی نے اپنے استاد کا مرثیہ اس سوز و گداز کے ساتھ لکھا کہ اردو شاعری اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے۔

غالب سے حالی کو جو مخلصانہ تعلق تھا، جو قلبی محبت تھی جو گہری عقیدت تھی، اور ان کے دل میں اپنے استاد کا جو ادب و احترام تھا۔ یہ مرثیہ ان سب پر روشنی ڈالتا ہے۔

مرثیہ کے علاوہ حالی نے ایک قطعہ تاریخ بھی لکھا اور اس شعر سے اپنے استاد کی تاریخ وفات نکالی۔

تاریخ ہم نکال چکے پڑھ بغیر فکر حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
۱۲۶۱ ۳۰۰ ۲۷۹۶ ۱۲۸۵ھ

حالی سے غالب کا تعلق زیادہ سے زیادہ دس بارہ سال رہا۔ وہ بھی مسلسل نہیں اس قلیل عرصہ میں انھوں نے جس طرح غالب سے استفادہ کیا اور ان کے فن اور ادبی کمالات کو پہچاننے کی کوشش کی۔

اس سے حالی کی ادبی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالب کے بہت سے باکمال احباب اور شاگرد تھے جن کی ادبی شہرت اور سخن سنجی حالی سے کہیں زیادہ تھی، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ ان کے بعض شاگرد حالی سے زیادہ عزیز اور محبوب تھے جن میں مرزا ہرگوپال تفتہ اور میر مہدی حسن مجروح خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن غالب کے کمال فن کو جس طرح حالی نے پرکھا اور اس کی اشاعت کی وہ کسی اور کے بس کی بات نہ تھی۔ غالب کی شہرت و مقبولیت میں یادگار غالب، کا معتدبہ حصہ ہے۔ یادگار غالب لکھ کر حالی نے غالب کی نثر و نظم کو ادبی حلقوں میں روشناس کیا، ان کے کلام کی تشریح کر کے ان کی قدر و منزلت میں اضافہ کیا، صفی مرحوم نے سچ کہا ہے۔

مرحوم تھے یادگار غالب　　　تلمیذ و فاشعار غالب
دم سے ان کے بہار غالب　　　روشن شمع مزار غالب

حالی کے دم سے صرف غالب کے مزار ہی کی نہیں بلکہ کاشانۂ ادب کی شمع بھی ہمیشہ روشن رہے گی۔

مہدی رضوی

حالی اور نذیر احمد

حالی کے عہد میں بلند پایہ اور طاقتور ادیبوں کی کمی نہ تھی۔ علی گڈھ تحریک کے عناصر اربعہ ہوں یا اردو ادب کے شموس ستہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ پر بے نظیر تھا اور ایسا کہ ہندوستان آج تک ان میں سے کسی کا بھی جواب پیدا نہ کر سکا۔ مگر یہ حالی ہی کی قسمت تھی کہ ہر صنف ادب میں یہی سبھوں پر بھاری رہے باستثنا ناول نگاری کہ اس صنف میں انھیں نذیر احمد سے مات کھانی پڑی۔

حالی نے "مجالس النسا" لکھ کر ایک غلطی کی۔ اگر وہ اس فن میں ٹانگ نہ اڑاتے تو اچھا کرتے۔ یہ میدان تو نذیر احمد کے ہاتھ رہا۔ "مجالس النسا" کو دیکھکر نذیر احمد کی شاعری یاد آجاتی ہے۔ غالباً ان دونوں بزرگوں کو اپنی کمزوریوں کا پورا احساس ہو گیا تھا۔ حالی نے "مجالس النسا" کے بعد پھر ناول لکھنے کی ہمت نہ کی اور ہوشمندی کے ساتھ اس راہ کو ترک کر دیا۔ نذیر احمد بھی سمجھتے تھے کہ شاعری ان کے بس کا روگ نہیں۔ "مجموعہ بے نظیر" سے ان کی شہرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا نقصان البتہ کچھ ہو گیا۔

حالی پر اگرچہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن حالی اور ان کے ہمعصر نذیر احمد کی باہم مماثلت اور مغائرت کے پہلوؤں پر لکھنے والوں نے بہت کم توجہ کی ہے کم از کم میری نظر سے اس موضوع پر کوئی مضمون نہیں گذرا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ذکر حالی میں اس تذکرہ کے بغیر ایک کمی ضرور رہ جاتی ہے۔ میں "فروغ اردو" کے حالی نمبر کے مہتمم حضرات کو مبارک باد کا مستحق سمجھتا ہوں کہ کہ انھوں نے مضمون کی فرمائش کے ساتھ ساتھ عنوان بھی معین کر دیا۔

حالی ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے اور نذیر احمد ۱۸۳۱ء میں موضع راہر ضلع بجنور میں۔ حالی نذیر احمد سے چھ سال چھوٹے تھے دونوں ایک ہی زمانے میں دلی کالج میں پڑھتے تھے۔ دونوں علوم مشرقی کے عالم ہوئے۔ حالی زیادہ تر دہلی ہی کی فضا میں سانس لیتے رہے۔ لیکن انھوں نے دلی کو اپنا وطن نہیں بنایا۔ نذیر احمد نے تو وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ دہلوی کہلائے اور وہیں آخری سانس بھی لی۔ نذیر احمد نے حالی کی وفات سے صرف دو سال پہلے انتقال کیا۔ دونوں نے ایک زمانہ پایا اور ایک ماحول دونوں نے اپنی آنکھوں سے غدر کے ہنگامے دیکھے اور غدر کے بعد مسلمانوں کے لئے جو صورت حال پیدا ہوئی اس نے دونوں کو متاثر کیا۔ دونوں بیدار ذہن اور حساس دل رکھتے تھے۔ ان تمام مشابہتوں کے باوجود دونوں کی شخصیتیں کافی مختلف ہیں۔ حالی کی ذہنی تربیت میں شیفتہ اور غالب کا ہاتھ ہے اور نذیر احمد کا ذہن ملایان مسجدی کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھا۔ حالی ایک غریب خاندان کے چشم و چراغ تھے لیکن وہ خاندان کبھی جاہ و

ثروت والا تھا اور حالی کو بچپن میں طلب علم کے لئے وہ پاپڑ نہیں بیلنے پڑے جو نذیر احمد کے لئے مقدر تھے۔ نذیر احمد کو صرف مولویوں کی چلمیں ہی نہیں بھرنی پڑیں بلکہ اپنے آذوقہ کے لئے در در کے ٹکڑے سمیٹنے پڑے۔ وہ اپنے شاگرد فرحت اللہ بیگ سے خود کہتے ہیں "بھئی ہم بہت غریب لوگ تھے۔ نہ کھانے کو روٹی نہ پہننے کو کپڑا۔ تعلیم کا شوق تھا اس لئے پھرتا پھراتا پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں ٹھہر گیا۔ یہاں کے مولوی صاحب بڑے عالم تھے ان سے پڑھتا توکل پر گذارہ کرتا"

پھر کہتے ہیں "پڑھنے کے علاوہ میرا کام روٹیاں سمیٹنا بھی تھا۔ صبح ہوئی اور میں چھڑی ہاتھ میں لے کر گھر گھر روٹیاں جمع کرنے نکلا۔ کسی نے رات کی بچی ہوئی دال ہی دیدی کسی نے قیمہ کی لگدی ہی رکھدی۔ کسی نے دو تین سوکھی روٹیوں پر ہی ٹرخایا۔ غرض رنگ برنگ کا کھانا جمع ہو جاتا"۔

اس مصیبت کا ذکر کرتے ہوئے نذیر احمد کہیں بھی اس تکلیف کے احساس کی غمازی نہیں کرتے ہیں جس کا ایک باحمیت اور غیرت دار نوجوان کے دل میں پیدا ہونا ضروری تھا۔ یہ سچ ہے کہ طلب علم کا شوق ان کے دل میں بے حد شدید تھا ممکن ہے کہ اس شوق کی شدت نے اس تکلیف کے احساس کو کم کر دیا ہو یا کم از کم قابل برداشت بنا دیا ہو یا پھر یہ کہ غریبوں کی تعلیم کا چونکہ یہی طریقہ اس زمانے میں رائج تھا ان کا دل اس طریقہ زندگی پر راضی ہو سکا۔ مولوی عبدالخالق صاحب کے مکان کا ذکر کرتے ہوئے اِک دوسری مصیبت کا بیان یوں کرتے ہیں "ادھر میں نے دروازے میں قدم رکھا

ادھر ان کی لڑکی نے ٹانگ لی۔ جبتک سیر دو سیر مصالحہ مجھ سے نہ پسوا لیتی نہ گھر سے نکلنے دیتی نہ روٹی کا ٹکڑا۔ خدا جانے کہاں سے محلے بھر کا مصالحہ اُٹھا لاتی تھی۔ پیستے پیستے ہاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے۔ بخدا جان سی نکل جاتی تھی" اس مشقت میں لذت کا بھی کوئی شائبہ تھا ایسا نہیں معلوم ہوتا اگرچہ نذیر احمد کی عمر اس وقت بارہ برس سے زیادہ کی تھی کوئی ایسے بچے نہ تھے۔ مولوی صاحب البتہ بڑے سیانے تھے کہ مسلسل شکایتوں کے باوجود روزانہ "چلتے چلتے تاکید کر دیا کرتے تھے کہ عبدالخالق صاحب کے مکان میں ضرور جانا" اسی لڑکی سے نذیر احمد کی شادی بھی ہوئی۔ لیکن اس کا سبب کوئی رومانی کشش نہ تھی۔ یہ چیز نذیر احمد کی زندگی میں مفقود تھی۔ دلی کالج میں داخلے کی داستان بھی کم دلچسپ نہیں۔ مختصر یہ علم طلب کے سلسلے میں نذیر احمد کو جو جد وجہد کرنی پڑی اور جو مشقتیں جھیلنی پڑیں اُن سے حالی دوچار نہیں ہوئے۔ یہ بات ایک طرف تو نذیر احمد کی شخصی عظمت پر دلالت کرتی ہے دوسری جانب ان کے کھوسٹ پن، بخل اور دانتوں سے پیسے پکڑنے کی عادت کی تفہیم میں مدد دیتی ہے۔

حالی کبھی بھی پیسے والے نہ ہوئے اور نذیر احمد ایک لکھ پتی سیٹھ اور ساہوکار کیا کیا نہیں ہوئے حالی نے تجارت کے فوائد بہت کچھ بیان کئے ہیں۔ اس کے مبادی اور اصول اور علم اخلاق اور علم معاشرت سے اس کے تعلق پر علم کے دریا بہائے ہیں لیکن تجارت کا فلسفہ بیان کرنا اور چیز ہے اور عملی طور پر تاجر بننا اور۔ وہ علم تجارت کے ماہر بن سکتے تھے لیکن ایک کامیاب تاجر بننا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ تجارت کو قومی ترقی کے لئے ضروری بتاتے ہوئے کہتے ہیں

"جس طرح تجارت سے قومی عقل معاش ترقی پاتی ہے۔ اسی طرح عمدہ اخلاق اور نیک خصلتیں صرف تجارت ہی کے ذریعہ سے تمام قوم میں شائع ہوتی ہیں۔ جزرسی اور کفایت شعاری جس کے بغیر کسی خاندان بلکہ کسی قوم کا وقار دنیا میں قائم نہیں رہ سکتا۔ صرف تجارت ہی کی بدولت تمام قوم میں سرایت کرتی ہے"

جس جزرسی اور کفایت شعاری کی حالی اسقدر تعریف کرتے ہیں وہ نذیر احمد کی شخصیت کا اہم ترین جز تھی اور اس تہذیبی گہوارے میں، جہاں حالی کی شخصیت کی تعمیر ہوئی تھی اس کیلئے کوئی جگہ نہ تھی۔ حالی اگر کوئی دوکان کھول کر بیٹھتے تو شاید گھر کی پونجی بھی گنوا بیٹھتے اور یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ وہ اس کیلئے نہیں بنے تھے۔ ناحق مٹی پلید کی۔ حالی جاگیردارانہ تہذیب کی یادگار تھے۔ اس تہذیب کے برے اثرات ان میں نہ تھے خوبیاں ساری تھیں۔ خلق، حلم، فداکاری، اور ایثار کے مجسمہ تھے۔ ان کے محرکات خود غرضی۔ ذاتی منفعت اور شوق ترقی پر مبنی نہیں تھے۔ ساری زندگی اعلیٰ قومی مقاصد ہی ان کے محرک رہے۔ سکسینہ کے قول کے مطابق "دینوی جاہ و ثروت کا خیال ان کے دل میں مطلق نہ تھا۔ ان کی زندگی ایک سچے انشار پرداز کی زندگی تھی جس نے اپنے تعلیمی اور تصنیفی مشاغل کے آگے دنیوی مرتبہ و عزت کو ہمیشہ ہیچ سمجھا۔ قومی ہمدردی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی مگر اس کے ساتھ فرقہ وارانہ اختلافات سے وہ بالکل علیحدہ تھے ان کا مطمع نظر بہت بلند تھا اور لم تقولون مالا تفعلون کے وہ پورے عامل تھے" یہ الفاظ صرف رسمی اور کھوکھلے نہیں جن لوگوں کو حالی کی زندگی اور ان کے زمانے کے حالات سے واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ اس دور میں وجاہت

اور دولت کے حصول کے امکانات بہت تھے محسن الملک، وقار الملک اور خود سرسید نے بہت ہی حقیر اور معمولی ملازمتوں سے ابتدا کی تھی لیکن ان لوگوں نے اپنی تدبیر اور حکمت عملی سے جو عروج پایا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں حالی عمر بھر انھیں لوگوں کی مصاحبت کرتے رہے۔ اور اس راہ میں کبھی بھی ان کے مد مقابل نہیں ہوئے اس کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ یا تو اس زمانے میں پوزیشن اور دولت حاصل کرنے کے جو ڈھنگ تھے حالی ان سے ناواقف تھے یا وہ دنیاوی جاہ و ثروت سے کنارہ کش تھے انگریزوں کی تعریف تو وہ زبان و قلم سے برابر کرتے رہے لیکن یہ تعریف کبھی بھی صلے کی غرض سے نہ تھی۔ وہ تو انگریزوں سے ملنے سے گھبراتے تھے چنانچہ بڑھاپے میں جب ان کو شمس العلماء کا خطاب ملا تو اُن کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا کہ انھیں اب انگریزوں سے ملنا پڑے گا اور درباروں میں حاضری دینی ہوگی۔ حالی کے لئے یہ ایک مستقل دردِ سر تھا۔ اس کے برعکس نذیر احمد نہ صرف مالی منفعت اور حصول جاہ و منصب کے وسائل سے واقف تھے بلکہ یہ بھی خوب جانتے تھے کہ ان وسائل کو کیونکر کام میں لایا جا سکتا ہے انھوں نے جب محسوس کیا کہ ترقی کے لئے انگریزی سیکھنا ضروری ہے تو وہ اس کام میں اس طرح جٹ گئے کہ تھوڑے ہی دنوں میں اپنی محنت اور جانفشانی سے انگریزی میں ایسی مہارت پیدا کرلی کہ تعزیرات ہند کا نہایت سلیس اور بامحاورہ ترجمہ کر سکے۔ خود کہتے ہیں کہ "تعزیرات ہند کا ترجمہ میرا ایک کارنامہ ہے" انکی محنت اور جانفشانی کا اندازہ خود انھیں کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے مولوی عظمت اللہ

اور ان کے رفقائے کار کے ترجموں کو دیکھکر کہتے ہیں "میں نے دل میں کہاکہ نذیر احمد تو بھی خم ٹھونک کر میدان میں کیوں نہیں آجاتا۔ اُردو جانتا ہے فارسی جانتا ہے عربی جانتا ہے کچھ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بھی سمجھتا ہے۔ ان لوگوں سے اچھا نہیں تو کم از کم ایسا ترجمہ تو بھی کرے گا۔ یہ سوچ سوا روپیہ کی رائل ڈکشنری بازار سے خرید لایا۔ رات کو لیمپ جلا کر کپڑے اُتار لنگوٹ باندھ ترجمے پر پل پڑا۔"

وہ انگریزوں سے خوب ملتے تھے بعضوں سے تو بہت گہرے تعلقات بھی تھے ان سے خط وکتابت بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ مسٹر ریڈ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"میں اپنے دوسرے خطوط میں انشاء اللہ آپ پر ثابت کردوں گا کہ میں نے اپنی انگریزی کو جیسی ٹوٹی پھوٹی اعظم گڈھ میں تھی اب تک بھلایا نہیں"

انگریزوں سے نہ صرف ضرورت پڑنے پر معاملے کی باتیں کرتے ہیں بلکہ اپنی محبت خلوص اور عقیدت مندی کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ اسی خط میں آگے لکھتے ہیں۔

"بشیر نے آپکی چٹھی کی نقل دی اسے میرے پاس دورے میں بھیجی اور اسکے پڑھنے سے وہ پانچ برس آنکھوں میں پھرنے لگے جو آپ کے سایہ عاطفت میں نہایت خوشی اور اطمینان کے ساتھ اعظم گڈھ میں گذارے اگرچہ مفارقت کو بہت دن ہوئے مگر آپ کی مہربانیاں نہ بھولی ہیں نہ بھولیں گی"

انگریزوں کی خوشامد بھی کرتے تھے اور ان سے اکڑتے بھی تھے لیکن انکا ہر عمل موقع اور محل سے ہوتا تھا۔ آدمی تھے نہایت ہی ہوشمند اور چالاک۔

جب ان کی شخصیت ہر حیثیت سے مسلم ہوگئی تو انگریزوں کی پروا نہیں بھی کرنے لگے خواہ وہ لفٹنٹ گورنر ہی کیوں نہ ہوں۔ دلی کالج کے ایک جلسے میں لارڈ لیفرائے کو انھوں نے جو کھری سُنائی اس کے لئے اُنھیں کا جگر چاہیئے تھا۔ بات یہ تھی کہ نذیر احمد کی شخصیت ایک مضبوط اور منفرد شخصیت تھی اور ان کا ایک اپنا رنگ تھا وہ ہوشمند تو بلا کے تھے لیکن اکھڑ پن اور جوش بھی ان کے مزاج کی نمایاں خصوصیت تھی اور یہ صفت ایک مضبوط شخصیت کیلئے ہے بھی ضروری۔ اس دور میں سب سے زیادہ پر رعب، مرعوب کن اور طاقتور شخصیت سر سیّد کی تھی اور وہ اپنے عظیم رفقا کے درمیان جن میں حالی بھی تھے وہی حیثیت رکھتے تھے جو ستاروں کے درمیان ماہتاب کی ہے۔

حالی سر سیّد کو غیر معمولی انسان اور اپنا قائد و رہنما سمجھتے رہے سر سیّد کیلئے ان کے دل میں عقیدت اور استحسان کے جذبات تھے۔ رشک و غبطے کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ ہمیشہ ان ہی کے دامن سے لپٹے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب سر سیّد کی پیروی مغرب اُن کے آخری دنوں میں حد سے تجاوز کرنے لگی تو حالی کو ان سے اختلاف پیدا ہوا۔ لیکن یہ اختلاف جب منظر عام پر نہ آسکا تو اس کا ذکر ہی بیکار ہے۔ اس ذکر سے حالی کی پوزیشن کچھ بہتر نہیں ہوتی سر سیّد کے انتقال کے بعد "حیات جاوید" شائع ہوئی۔ سر سیّد کی چند باتیں جو ناگفتنی تھیں اس کتاب میں مذکور نہیں۔ مردہ را از بدی یاد مکن، کے مقولے پر عمل درآمد کی وجہ سے یا اپنی شرافت اور روایتی تہذیب سے مجبور ہو کر حالی بعض حقیقتوں پر پردہ ڈالتے ہیں اس بات سے ایک طرف تو

سرسید کی شخصیت سے ان کی مرعوبیت ثابت ہوتی ہے دوسری جانب ان میں جرأت کی کچھ کمی بھی محسوس ہوتی ہے۔سرسید کے بعد محسن الملک نے ان کی جگہ لی۔حالی ان سے بھی اسی طور پر وابستہ رہے اور آپس میں کبھی کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوا۔

نذیر احمد کی شخصیت اس کے بالکل برعکس ہے۔اُن کی انفرادیت برابر قائم رہی وہ کسی سے دھونس کھانے والے آدمی نہ تھے۔سرسید اور محسن الملک سے ان کے تعلقات بھی رہے لیکن ان کے تعلقات کی نوعیت قطعاً مختلف تھی۔نذیر احمد اور محسن الملک وغیرہ کے تعلقات میں عقیدت محبت تاثر اور خلوص کے بجائے سابقہ کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں۔"کچھ عرصے تک تو نواب محسن الملک اور انکی بنی رہی بعد میں اتنی کھچی کہ ٹوٹ گئی مولوی صاحب کو یہ شکایت تھی کہ محسن الملک مجھ پر دباؤ ڈالکر کام نکالنا چاہتے ہیں۔محسن الملک کو یہ شکایت تھی کہ مولوی صاحب میرے مخالف ہوکر میرے اکھاڑنے کی فکر میں ہیں۔"

نذیر احمد کسی سے اکھڑے اور وہ اسے بغیر کھری کھری سُنائے ہوئے سامنے سے جانے دیں یہ ان کے مزاج کے خلاف بات تھی۔ ۱۹۰۳ء میں دربار کے موقع پر دلی میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ہز ہائی نس آغا خاں اس کے صدر تھے۔اسی کے ایک اجلاس کے دوران میں جبکہ نذیر احمد تقریر کر رہے تھے یکایک لارڈ کچنر کی آمد کا غلغلہ برپا ہوا۔نواب محسن الملک علی گڑھ کالج کے سکریٹری تھے۔انھوں نے استقبال کے انتظامات شروع کردیے

نذیر احمد کو یہ دیکھ کر کہ محسن الملک ان کی تقریر میں کھنڈت ڈال رہے ہیں بڑا غصہ آیا اس سلسلے میں انھوں نے محسن الملک سے جس طور پر انتقام لیا ہے اسکا جواب شاید ہی کہیں ملے۔ لارڈ کچنر کو مخاطب کر کے نذیر احمد کہتے ہیں "ہمارے یہاں قیامت کی نشانیوں میں لکھا ہے کہ اُس وقت ایسا تہلکہ ہوگا کہ حاملہ عورتوں کے حمل گر جائیں گے۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ ایسی کیا مصیبت ہوگی کہ حمل گرا دے گی۔ مگر آج یقین آگیا کہ جو کچھ لکھا ہے صحیح لکھا ہے۔ جب آپ کی آمد نے بڑے بڑے پیٹ والے بڈھوں کے حمل گرا دیئے تو کیا تعجب ہے کہ قیامت کی آمد عورتوں کے حمل گرا دے" مرزا فرحت اللہ بیگ۔ اس کانفرنس میں شریک تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ نذیر احمد کے اس جملے کا یہ اثر ہوا کہ تمام پنڈال میں سناٹا ہوگیا۔

جہاں تک کہ سیرت اور شخصیت کا تعلق ہے نذیر احمد اور حالی میں آسمان اور زمین کا فرق ہے۔ حالی ایک نہایت ہی متین، سنجیدہ، مہذب، خاموش، منکسر، متحمل، بے حوصلہ قانع اور وضع دار انسان تھے۔ لیکن ان کی شخصیت پھیکی۔ بے مزہ، اور بے جان ہے اس کے برعکس نذیر احمد ظریف، اکھڑ، غصہ ور، باحوصلہ، چالاک، بخیل، سود خوار، جری اور باہمت انسان تھے لیکن ان کی شخصیت دلکش اور دلچسپ ہے، اس میں زندگی ہے ناسازگار حالات سے جنگ ہے پیہم کامیابیاں اور ترقیاں ہیں۔

حالی کی شخصیت عینی اور نظریاتی ہے نذیر احمد کی عملی۔ اور شخصیت کا یہی

سلہ محسن الملک اور وقار الملک۔

فرق ان دونوں کی تخلیقات میں بھی جلوہ گر ہے۔ مسلمانوں کی علمی، اخلاقی اور
مالی زبوں حالی کا مرثیہ اپنے اپنے رنگ میں دونوں نے پڑھا اور دونوں نے
اپنی قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی سعی بھی کی لیکن ان دونوں کی مساعی
میں فرق یہ ہے کہ حالی ایک بلندی سے اپنی قوم کو پکارتے ہیں اور نذیر احمد
سونے والوں کے گھروں میں گھس گھس کر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اور اُن کی بغلوں میں
ہاتھ دے کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ مسدس کو چھوڑ کر حالی کا کوئی کارنامہ تاثیر میں
نذیر احمد کے ناولوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ "مراۃ العروس" "بنات النعش" اور
"توبۃ النصوح" نے مسلمان گھروں کی چار دیواریوں کے اندر جو انقلاب برپا کیا
ہے اور جاہل، روایتی اور توہم پرست پردہ والیوں کی زندگیوں میں جو غیر معمولی
تبدیلیاں پیدا کی ہیں وہ حالی یا کسی دوسرے ادیب کی تخلیقات نہیں کر سکیں
آج بھی کوئی مسلمان گھر ایسا نہیں ملے گا جہاں نذیر احمد کی کتابیں نہ ہوں اور یہ
کہنا غلط نہ ہو گا بیسویں صدی کے مسلمان بچے اور بچیوں کی سیرت و شخصیت
کی تعمیر میں جتنا نذیر احمد کا ہاتھ ہے کسی دوسرے کا نہیں۔ مگر یہ صحیح ہے کہ
ان کا اثر عوام میں زیادہ ہوا خواص کو اور مخصوص طور پر ادیبوں اور مفکروں کو
متاثر کرنے کی اہلیت ان میں نہ تھی یہ کام حالی ہی کا تھا۔ حالی نے اکیلے اپنے
بعد کی نسل کے ادیبوں کو جس قدر متاثر کیا ہے نذیر احمد کیا ان کے جیسے ادیبوں کی
ایک جماعت نہیں کر سکتی اور یہی وجہ ہے کہ آج شاعروں ادیبوں اور انشا
پردازوں کے درمیان جو مقبولیت حالی کو حاصل ہے ان کے دور کے کسی دوسرے
ادیب کو حاصل نہ ہو سکی۔ اس مقبولیت کا سبب صرف یہ نہیں ہے کہ وہ

مختلف اصناف ادب پر حاوی ہیں۔ شاعر بھی ہیں نثر نگار بھی۔ ناقد بھی ہیں سوانح نگار بھی بلکہ یہ ہے کہ انھوں نے ہر صنف میں قدیم راہوں کے رُخ موڑ دیئے اجتہاد سے کام لیا اور اپنی نکالی ہوئی نئی راہوں کے لئے نئے نظریات اور نئے تصورات کی تشکیل کی۔ اور یہی انکا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اردو شاعری کی دُنیا میں انھوں نے ایسا انقلاب پیدا کیا کہ ان کے مخالف بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اکبر حالی کی تحریک کے مخالف اور اودھ پنچ کیمپ کے ایک سرگرم کارکن تھے۔ افتاد طبع اور مزاج میں بھی حالی سے بالکل مختلف تھے لیکن اپنے معاصرین میں سے اگر وہ کسی سے متاثر ہوئے تو حالی سے۔ حالی کا کلام بے حد سنجیدہ ہے اور اکبر کا بلا کا ظریفانہ لیکن اس سطحی اختلاف کے باوجود اکبر کا کلام حالی کے بنیادی نظریات کی فتح کا اعلان ہے۔ اُردو میں شاعری کو "سوسائٹی کی تابع" بنانے کی رسم حالی نے ہی چلائی۔ اکبر کے بعد اقبال اور اقبال کے بعد آج کے شعراء سب کے سب حالی ہی کی دکھائی ہوئی راہ پر چل رہے ہیں۔

تنقید کی دنیا میں انھیں کا سکہ رائج ہوا آج کے ترقی پسند تنقید نگار تو انکو اپنا پیش رو اور راہبر مانتے ہی ہیں مزہ یہ ہے کہ ترقی پسند اسکول کے شدید ترین مخالف کلیم الدین احمد بھی جو اپنی تخریبی تنقید کے لئے کافی مشہور ہیں حالی کی تنقید میں فنی خامیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالنے کے بعد حالی کی برتری اور فضیلت کی ناگزیری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں اور اقرار کرتے ہیں کہ مقدمۂ شعر و شاعری سے بہتر کتاب آجتک اردو میں نہیں لکھی گئی ہے

شاعری میں نذیر احمد کیا پھاڑ پھوڑ سکتے جب وہ "مثنوی میر حسن" اور امانت کے "اندر سبھا" کو سوختنی جانتے ہوں۔ وہ تنقید کے بھی کام کے نہ تھے

بقول غلام محی الدین[1] وہ تنقیدی اور فلسفیانہ خیالات کے اظہار پر بالکل قادر نہ تھے۔

شاعری اور تنقید کے علاوہ سوانح نگاری کے فن میں بھی نہ صرف اولیت کا سہرا حالی ہی کے سر ہے بلکہ "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" اپنے جملہ فنی نقائص کے باوجود ایسے کارنامے ہیں جن سے بہتر ہونے اب تک منظر عام پر نہ آسکے۔ نذیر احمد کی کتاب "امہات الامہ" بہت سی سیرتوں کا ایک مجموعہ ہے۔ ہر سیرت اتنی مختصر ہے کہ اس پر بجائے خود سوانح عمری کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نذیر احمد اگر سوانح نگاری کی جانب توجہ کرتے تو بلا شبہہ حالی سے بہتر سوانح نگار ثابت ہوتے ایک اچھے سوانح نگار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بیباک ہو بے لاگ ہو اور کسی قسم کی مروت اور رعائت کی گنجائش اس کے یہاں نہ ہو۔ یہ صفت حالی میں بہت کم تھی۔ اور نذیر احمد بدرجہ اتم موجود تھی۔ "امہات الامہ" کی اشاعت سے مسلمانوں میں جو ہنگامہ برپا ہوا مولوی عبدالحق نے اسکا بہت ہی دلچسپ نقشہ کھینچا ہے

"مولوی تو پہلے ہی سے اُن سے جلے بیٹھے تھے اُن کی بن آئی خوب جلے پھپھولے پھوڑے مخالفت میں رسالے چھپوائے۔ طرح طرح کے بہتان باندھے۔ کفر کے فتوے لکھے اور بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ طرح طرح سے عوام کو بھڑکایا یہاں تک کہ بعض تو جان کے لاگو ہو گئے اور مرنے مارنے پر مستعد ہو بیٹھے۔ ندوۃ العلماء کے اجلاس میں مولویوں نے اس کتاب کی جتنی کاپیاں دستیاب ہو سکیں جمع کر کے ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور ایک

---

[1] مصنف "اردو اسالیب بیان"

ایک مولوی نے بسم اللہ کہکر آگ لگا دی۔ مولانا شبلی بھی اس کارِ خیر میں شریک تھے مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ "اگر حکومت کا ڈر نہ ہوتا تو مولانا ئے مرحوم بھی اسی آگ میں جھونک دیئے جاتے"۔

نذیر احمد ایسے بھولے بھالے نہ تھے کہ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی ان کو اس صورت حال کا اندیشہ نہ ہوا ہو جو کتاب کی اشاعت کے بعد پیدا ہوئی۔ وہ ضرور سمجھتے تھے لیکن خود جس بات کو سچ جانتے تھے اس کے کہنے سے جان یا عزت کے خوف سے باز آجانا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ یہ نذیر احمد کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے جو ان کی جرأت، حق گوئی، بے لوث مزاجی، روشن خیالی اور ترقی پسندی کا اعلان کرتا ہے۔

علاوہ بریں سیرت نگار کو ایک اچھا کردار نگار ہونا چاہیئے تاکہ وہ جس شخص کی سیرت لکھ رہا ہو اس کی شخصیت کو کما حقہٗ اجاگر کر سکے اور اس کی جیتی جاگتی تصویر پیش کر سکے ایک ناول نگار ہونے کے ناتے نذیر احمد کو اس چیز پر بھی کافی قدرت حاصل تھی بقول غلام محی الدین وہ فطرت کی طرف سے ناول نگاری کیلئے پیدا کئے گئے تھے"۔ لیکن اگر یہ کہنا کہ اس کا تکملاً ابن الوقت ہی سے ہو سکتا ہے غلط ہے تو اتنا ضرور صحیح ہے کہ سرسید کی مکمل سوانح حیات ہے یہاں نذیر احمد کی کردار نگاری کا فنی جائزہ لینا مقصود نہیں صرف یہ بات دکھانی ہے کہ حالی کے مقابلے میں نذیر احمد سیرت نگاری کی ابن الوقت کی اہمیت زیادہ رکھتے تھے نذیر احمد کا ایک ناول ہے اس میں سیرت نگاری کی خصوصیتیں موجود ہیں اس میں ابن الوقت کی صرف خامیاں ہی نہیں دکھائی گئی ہیں، خوبیاں بھی مبالغے کی تھوڑی سی رنگینی سے کافی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے "حیات جاوید" سرسید کی مکمل سوانح حیات ان دونوں کے بین البین ہی مل سکتی ہے۔

میرے خیال میں موجودہ دور میں نذیر احمد کے ساتھ انصاف نہیں برتا جا رہا ہے وہ جس تعریف کے مستحق ہیں ان کو نہیں مل رہی ہے۔ یہ تجربہ ہے کہ نذیر احمد کے متعلق عام طور پر لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ وہ ایک روائتی قسم کے ملا ٹھے تھے درآنحالیکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ ان کی سیرت، ان کے ذہن اور ان کی تصنیفات کے بغور مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مولوی ہوتے ہوئے بھی وہ بڑی حد تک ترقی پسند تھے۔ اس سلسلے میں حالی سے ان کا موازنہ نہیں ہو سکتا۔ ترقی پسند دونوں ہیں۔ لیکن حالی بہت بلند ہیں انھوں نے ترقی پسندی کے نظریات کی تشکیل کی ہے۔ نذیر احمد نے اپنی تخلیقات میں ان نظریات کو برتا ہے۔ حالی نے ادب اور سماج کے تعلق کو واضح کیا ہے۔ نذیر احمد نے زندگی کی تصویر کشی کی ہے اور اس کو سنوارنے کی سعی کی ہے۔ حالی نے جو تصورات "چپ کی داد" میں پیش کئے ہیں کم و بیش وہی خیالات نذیر احمد کی "ایامی" میں ملتے ہیں۔ تعلیم نسواں کے دونوں حامی تھے لیکن اس چیز پر جس قدر زور نذیر احمد نے دیا ہے کسی دوسرے نے نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ عورتوں کو خاتون خانہ، بنانا چاہتے تھے "سبھا کی پری" نہیں۔ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عورتوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کے خلاف ہوں۔ وہ خود لکھتے ہیں "جن عورتوں نے وقت کی قدر پہچانی اور اس کو کام کی باتوں میں لگایا وہ مردوں کی طرح دنیا میں نامور اور مشہور ہوئی ہیں۔ جیسے نورجہاں بیگم، زیب النسا بیگم یا ان دنوں نواب سکندر بیگم یا ملکہ وکٹوریہ۔ یہ وہ عورتیں ہیں جنہوں نے ایک چھوٹے سے گھر اور کنبے کا نہیں بلکہ

ملک اور جہاں کا بندوبست کیا ہے۔" پھر لکھتے ہیں "بعض نادان عورتیں خیال کرتی ہیں کہ بہت پڑھکر کیا مردوں کی طرح مولوی ہونا ہے پھر محنت کرنے سے فائدہ لیکن اگر کوئی عورت زیادہ پڑھ گئی ہے تو بیشک اس نے زیادہ فائدہ بھی حاصل کیا ہے۔" ان کی یہ روشن خیالی ہی ثابت کر دیتی ہے کہ وہ کٹھ ملا نہ تھے بلکہ حالی کی طرح وہ بھی خاصے ترقی پسند تھے۔

اسلوب بیان میں البتہ وہ حالی سے بہت مختلف ہیں اور یہ اختلاف ناگزیر تھا کیونکہ سچ پوچھئے تو اسلوب مصنف کی شخصیت کا ایک پرتو ہوتا ہے حالی کا اسلوب سنجیدہ و قیع اور مہذب ہے۔ نذیر احمد کا ظریفانہ، بامحاورہ اور بازاری نظریاتی اور فلسفیانہ مسائل کے بیان کیلئے حالی کا اسلوب بہت مناسب ہے نذیر احمد کو اس پر قدرت نہیں۔ اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ حالی کا اسلوب صرف طبقۂ خواص اور پڑھے لکھے لوگوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور عوام اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو اپنی بولیوں اور حالی کی تحریر میں کوئی بات مشترک نہیں ملتی اسکے برعکس نذیر احمد کی تحریروں میں محاورات اور روزمرہ کی بھرمار سے وہ لوگ ایک موانست اور ایک ربط محسوس کرتے ہیں۔ نذیر احمد ایک جگہ لکھتے ہیں "تم اپنی ہستی کو کیوں بھولتے ہو۔ گدھی کمہار کی تجھے رام سے کوٹھ۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں بھجوا تیلی؟" یہ زبان وہی ہے جو عوام بولتے ہیں اس دور میں جب اردو شاعری میں نظیر اکبرآبادی کے بتذل اور عامیانہ انداز بیان کو عوامی کہکر سراہا جا سکتا ہے تو نذیر احمد کی نثر بھی بلاشبہ قابل تعریف ہے۔ ان کی عبارتوں میں محاوروں کی ٹھونسم ٹھانس" سے فرحت اللہ بیگ کا جی اکتا سکتا ہے لیکن عوام کو جو لطف اور مزا اس زبان میں ملتا ہے وہ حالی کی خشک وقیع سنجیدہ اور اعلیٰ طبقے کی زبان میں نہیں مل سکتا۔ ان دونوں کے اسالیب کے متعلق میں یہ سمجھتا ہوں کہ حالی کے اسلوب میں سطح عوام سے دوری یا بلندی ہے اور نذیر احمد کی زبان اسی سطح پر پھیلتی پھلتی اور پھولتی ہے۔

حکیم عبدالقوی دریاآبادی بی اے

شیفتہ اور حالی

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ جو فارسی زبان میں حسرتی تخلص کرتے تھے اُردو وفارسی دونوں کے بلند پایہ شاعر اور شاید شاعر سے بھی بڑھ کر سخن فہم وسخن شناس تھے اس دور کے بہترین ناقدین شعروسخن میں ان کا شمار تھا اللہ نے امارت اور تونگری عطا کی تھی۔ بجائے اس کے کہ رئیسانہ مشاغل لہو ولعب میں پڑتے اپنے وقت عزیز کا بڑا حصہ دینی علمی وادبی مشاغل میں گزارتے ان کے یہاں سخن وران باکمال کا جمگھٹا رہتا تھا. مولانا حالی بھی ان کے فیض سے مستفید ہوئے. کئی سال تک وہ ان کے مصاحب کی حیثیت سے ان کے ساتھ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر میں رہے اس قیام سے ان کو جو بیش بہا فائدہ پہنچا اسکا تذکرہ خود مولانا حالی کے الفاظ میں سنئیے

"میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعروسخن کا شوق جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا، تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان جو اب تک مکروہات کے باعث اچھی طرح

ظاہر نہ ہونے پایا تھا چک اٹھا، اس زمانہ میں اردو فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انھیں کے ساتھ میں بھی جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجا تھا۔ مگر درحقیقت مرزا کے مشورے و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا۔ نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادھی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے، چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونو متنفر تھے۔۔۔۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔" (تذکرہ حالی۔ مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی)

اس اثر پذیریوں کا اعتراف حالی نے نثر کے ساتھ نظم میں بھی یوں کیا ہے ؎

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

حضرت شیفتہ ۱۸۰۶ء مطابق ۱۲۲۱ھ میں بمقام دلی پیدا ہوئے طالب علمی کا زمانہ دلّی ہی میں گذارا، اس زمانہ کے مشہور معلم فارسی و عربی

میانجی ماڈماں سے فارسی و عربی کے درسیات پڑھے اور علوم مروجہ کی تحصیل کی، اس کے بعد مولانا حاجی محمد نور دہلوی نقشبندی علیہ الرحمۃ (متوفی ۱۲۵۲ھ) سے جو علوم ظاہر و باطن کے جامع سمجھے جاتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ فن حدیث و تجوید میں شہرہ رکھتے تھے۔ حدیث و تجوید کی تعلیم حاصل کی۔ علاوہ ازیں مولانا کرم اللہ محدث اور بعض دوسرے نامور علمائے عصر سے بھی بعض علوم حاصل کئے، ۱۲۵۵ھ میں جب پہلے سفر حج کو تشریف لے گئے تو مکہ معظمہ میں شیخ عبداللہ سراج حنفی سے اور پھر مدینہ منورہ میں شیخ محمد عابد سندھی سے حدیث کی خصوصی تعلیم حاصل کی۔

بزرگانِ دین سے نواب صاحب بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اوّلاً مولانا شاہ محمد اسحٰق محدث دہلوی اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے نواسے تھے) بیعت کی۔ ان کی وفات کے بعد شاہ ابو سعید، شاہ احمد سعید اور شاہ عبدالغنی دہلوی سے استفادہ باطنی حاصل کیا۔ جو خر الذکر سے بھی آپ نے تجدید بیعت بھی کی۔ شاہ صاحب نے آپ کو سند خلافت بھی مرحمت کی اور اپنے مریدوں کو اکثر تکمیل باطنی و تربیت روحانی کی غرض سے نواب صاحب کے پاس بھیجتے رہتے تھے۔ نواب صاحب ابتدائے زندگی سے مجاہدوں اور ریاضتوں کے خوگر تھے اور یہ مشاغل تادم آخر جاری رہے۔ صوفی باصفا ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ظاہری چیزوں میں بھی مذہب کے سختی سے پابند اور صحیح معنی میں عالم باعمل اور

جامع طریقت و شریعت تھے ذاتی فائدے کے لئے آپ نے کبھی بھی کسی شرعی مسئلہ میں توجیہ و تاویل سے کام نہیں لیا۔ مولانا حالی نے حیات جاوید میں ضمناً آپ کا اسی قسم کا ایک واقعہ تحریر کیا ہے کہ آپ کے پاس ایک موضع گرو رکھا گیا تھا۔ عرصہ کے بعد اس کے مالک نے اسے چھڑانا چاہا۔ ہر چند کہ رہن نامہ میں رہن شدہ موضع کا تمام نفع مرتہن کو معاف کر دیا گیا تھا اور مفتیوں نے بھی اس کی اباحت کا فتویٰ دیدیا تھا لیکن نواب صاحب نے یہ حدیث پڑھی کہ " استفت قلبک ولو افتاک المفتون " (اپنے دل سے فتوی طلب کر اگرچہ تجھے مفتیوں نے فتویٰ دیدیا ہے) اور جو کچھ منافع اس موضع سے وصول ہوا تھا زر رہن میں سے مجرا دیکر باقی روپیہ مالک سے لے لیا۔

نواب صاحب نماز باجماعت کے سختی سے پابند تھے سفر و حضر دونو میں اس کی پابندی ملحوظ رکھتے تھے۔ عصر و مغرب کے مابین آپ کے یہاں عام نشست ہوتی جس میں ہر قسم کے علمی ادبی و مذہبی تذکرے رہتے لیکن کسی کی غیبت و بدگوئی اشارتاً بھی نہ ہونے پاتی۔

مطالعہ کتب خصوصاً کتب حدیث و تصوف کے نواب صاحب بہت عادی تھے۔ آپ نے دوسرا سفر حج ۱۳۰۴ھ میں کیا۔ اس سفر نامہ کی روداد آپ کی زندگی میں برہ آورد کے فارسی نام سے اور ترغیب السالک الی احسن المسالک کے عربی نام سے طبع ہوئی تھی۔ لیکن اب نایاب ہے۔ اس سفر میں آپ کا جہاز طوفان میں کسی چٹان سے

ٹکرا کر ٹوٹ گیا اور مسافر کشتیوں کے ذریعہ ایک جزیرے میں اُتار دیئے گئے۔ کئی روز تک اس ویران جزیرے میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بڑی تکالیف اٹھائیں۔ اس کے بعد کشتی کے ذریعہ ساحل عرب پہنچکر زیارت حرمین سے دوبارہ مشرف ہوئے۔ واپسی وطن کے بعد ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ جسے عرف عام میں غدر کہا جاتا ہے، ظہور پذیر ہوا۔ اس وقت کے مسلم عمایدو شرفا پر اس کے سلسلہ میں جو آفات آئے ان سے نواب صاحب بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ کچھ عرصہ بغاوت کے الزام میں قید فرنگ بھی برداشت کرنی پڑی جسے آپ نے صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کیا۔ بالآخر اس سے باعزت طور پر گلو خلاصی ہوئی اور سارے مدارج و مناصب بھی اعلیٰ درجہ بر قرار رہے۔

نواب صاحب نے پہلے فارسی اور اردو شاعری میں حکیم مومن خان مومن کی شاگردی اختیار کی۔ مومن استاد اور لاثانی استاد سخن ہونے کے باوجود اپنے شاگرد کی قابلیت سخن فہمی و سخن سنجی سے بہت متاثر تھے یہاں تک کہ اپنے اردو کلام کی تدوین کا کام بھی انھیں کے سپرد کیا تھا جس کی تفصیل شیفتہ کے تذکرۂ شعرا مسمٰی بہ گلشن بے خار میں مومن ذکر کے تحت درج ہے۔ مومن نے ان کی سخن فہمی کی داد ایک جگہ فارسی شعر میں یوں دی ہے ؎

زتحسین او حسن معنی بناز

ہزار آفریں بر چنیں امتیاز

مومن کے انتقال کے بعد مرزا غالب کی شاگردی اختیار کی اور

آپ ہی کے ایماء سے مولانا حالی نے بھی اپنا کلام اصلاح کی غرض سے
مرزا غالب کے پاس بھیجنا شروع کیا۔ غالب کا سا شخص جو کسی دوسرے
کو خاطر میں نہ لاتا تھا نواب صاحب کی سخن فہمی کا انتہائی معترف
و مدّاح نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان کا ارشاد ہے ؎

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او!
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفےٰ خاں خوش نکرد

اس کے علاوہ مرزا غالب نے اپنے رسالہ سبد چین میں نواب صاحب
کے متعلق یہ شعر بھی لکھا ہے ؎

مصطفےٰ خاں کہ دریں واقعہ غمخوار من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادار من است

دوسرے سفر حج کے بعد نواب صاحب پر جو حال طاری تھا
اُس کے تحت انھوں نے شاعری بہت کم کر دی تھی اور دن و رات
کا بیشتر حصّہ عبادات و ریاضات میں بسر ہوتا تھا ایک شعر میں اپنی
اس حالت کو بیان کیا ہے ؎

اے شیفتہ ہم جب سے کہ آئے ہیں حرم سے
شوقِ صنم و خواہش صہبا نہیں رکھتے

یہ زندگی کے آخری چند سالوں میں شاعری بڑی حد تک فارسی
زبان تک محدود رہ گئی تھی مولانا حالی کی روایت ہے کہ اس زمانے
میں نواب صاحب خواجہ حافظ کی روش پر فکر سخن کرتے تھے۔

یہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ آپ اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے۔ آپ کا اُردو دیوان مطبع آئینۂ سکندری میرٹھ سے پہلی بار اس وقت شایع ہوا تھا جبکہ آپ کا سن اکیس سال کا تھا۔ اس کی جانب غزل کے ایک مقطع میں آپ نے اشارہ بھی کیا ہے ؎

اے شیفتہ اس فن میں ہوں اک پیر طریقت
گو عمر ہے میری ابھی اکیس برس کی

آپ کا مکمل اُردو و فارسی مجموعہ کلام کلیات شیفتہ و حسرتی کے نام سے آپ کے صاحبزادے نواب حاجی محمد اسحاق خاں مرحوم ریٹائرڈ جج و آنریری سکریٹری ایم اے او کالج علی گڈھ (جو دینداری میں اپنے والد ماجد ہی کے قدم بقدم تھے) کے زیر اہتمام بڑے اہتمام کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے ۱۹۱۶ء میں شایع ہوا جسکے شروع میں حضرت شیفتہ کے مختصر و مستند حالات اور ان کے کلام پر تبصرہ جناب نظامی بدایونی مرحوم، مدیر ذوالقرنین کے قلم سے شامل ہے اس مقدمہ کی ضخامت ۹۰ صفحے کے قریب ہے پھر اردو کلام درج ہے جو ۱۲۴ صفحات میں آیا ہے اس کے بعد فارسی دیوان ۱۵۱ صفحات میں ہے اس کے آخر میں مولانا حالی کے قلم سے دیوان مذکور پر فارسی ہی میں تقریظ قریب قریب آٹھ سوا آٹھ صفحے کی ہے یہ تقریظ اس فارسی دیوان پر نواب صاحب کی زندگی ہی میں مولانا حالی نے تحریر فرمائی تھی تقریظ کا آغاز اس فارسی رباعی سے ہوتا ہے ؎

ہر چند ستائشِ سخن دین من است | من گویم و راست گفتن آئین من است
در مدح سخن ساختگی نیست مرا | تحسین سخن شناس تحسین من است

اور اسمیں نواب صاحب کے فارسی کلام کی خصوصیات دکھلاتے ہوئے ایک فارسی شعر میں یوں داد دی ہے ؎

ہر لب دم اعجاز ندارد چو مسیح
ہر کس نہ بود چو حسرتی سحر بیاں

اس دیوان کے بعد نواب صاحب کے فارسی رقعات ہیں جو اس عہد کے باکمال فضلا و شعرا، نامدار مثلاً مفتی صدر الدین خاں آزردہ مرزا غالب، حکیم مومن خاں مومن، حکیم احسن اللہ خاں، مولانا فضل حق خیر آبادی وغیرہ کے نام ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فارسی نظم کی طرح فارسی نثر پر انھیں اہل زبان کی سی قدرت حاصل تھی۔ یہ یہ مجموعہ ۷۵ خطوط یا رقعات پر مشتمل ہے اور اس کی ضخامت ۷۶ صفحے ہے۔ رقعات میں شعر و ادب کے جواہر پاروں کے ساتھ ساتھ جا بجا تصوف و سلوک کے نکات بھی ملتے ہیں

شیفتہ کے کلام پر اظہار رائے کرتے ہوئے سر سید احمد خاں مرحوم نے جو اپنے ابتدائے دور میں مقفیٰ و مسجّع اور رنگین عبارت لکھا کرتے تھے یہ لکھا ہے کہ :-

"باوجود ناز و نعم و ثروت کے مشق سخن کو اس مرتبہ پر پہونچایا ہے کہ قلم تردد سے نہیں آسودہ ہوتا اور فکر تلاش سے۔

بلبل کی سجع خوانی اور قمری کی فصیح بیانی انھیں کی نستعلیق
گوئی سے مستفاد ہے یہ پایہ فصاحت کا اور سرمایہ بلاغت
کا خداداد ہے اگر رنگینی مضامین کے گل کو رنگ اور لطافت عبارت
کے گوہر کو آب نہ دے، بلبل کا عشق کامل اور تاج سلاطین
کی زینت تمام نہ ہو۔ (آثار الصنادید از سر سید احمد خان)

اس کلیات کے علاوہ شیفتہ کی دو تصنیفات اور ہیں ایک ان کا سفرنامہ
حج جس سے ان کا کمال فارسی انشا پردازی ظاہر ہوتا ہے جس کا فارسی
نام رہ آورد اور عربی نام ترغیب السالک الی احسن المسالک ہے افسوس
کہ باوجود مطبوعہ ہونے کے اب یہ بازار میں ناپید ہے اور دوسری کتاب
تذکرۂ شعرا پر گلشن بے خار کے نام سے ہے جس کے متعلق مولانا حکیم
عبدالحیٔ صاحب تذکرہ گل رعنا نے یہ رائے ظاہر فرمائی ہے

"ایک مبسوط تالیف گلشن بے خار ہے جس میں ریختہ گو شعرا
کے انتخابی کلام کو فراہم کیا ہے اس کو دیکھ کر ان کی سخن فہمی
کی بیساختہ داد دینی پڑتی ہے۔" (گل رعنا صفحہ ۳۲۹)

یہ تذکرہ جس میں شعرا کا حال بہ ترتیب حروف تہجی فارسی زبان میں
اور نمونہ کلام اردو (یا ریختہ) میں ہے سنہ ۱۲۵۰ھ میں پہلے پہل شائع ہوا
تھا اس میں نہ صرف شعرا کے کلام کا بہترین انتخاب پیش کیا گیا ہے بلکہ
ان کے کلام کے حسن و قبح پر آزادی کے ساتھ اظہار رائے کیا گیا ہے یہ
اس زمانہ کے لیے بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی یہ تذکرہ بعد میں مطبع نولکشور لکھنؤ

سے بھی ۱۲۹۱ھ میں شایع ہوا۔ اس کے آخر میں مومن دہلوی، مرزا غالب مفتی صدر الدین آزردہ، مولانا امام بخش صہبائی وغیرہ کی گرانقدر تقریظات بھی شامل ہیں۔ ساتھ ہی مومن کے قطعات تاریخ بھی شامل ہیں۔ پہلا مختصر قطعہ تاریخ حسب ذیل ہے ؎

مومن کو خیالِ سال تاریخ آیا　　اس تذکرہ کا جو ترجمہ ہے بھایا
کیا گلشنِ بے خار ہے۔ بادل چھایا　　مضمون کا ہجوم دیکھ کر فرمایا

دوسرا قطعہ طویل ہے صرف دو شعر ملاحظہ کرتے چلیے ؎

ہے شیفتہ جس کی جان معنی　　کیا تذکرہ شیفتہ نے لکھا
ہر شعر رواں روانِ معنی　　ہر فقرۂ نثر جانِ مضمون

آخر میں اس کی تاریخ گلدستہ گلستان معنی سے نکالی ہے ۱۲۵۰ھ

شیفتہ نے ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۶ھ میں ۶۲ سال کی عمر میں اس جہان فانی سے کوچ کیا اور درگاہ حضرت سلطان اولیا سید نظام الدین محبوب الٰہیؒ میں مدفون ہوئے مولانا حالی نے تاریخ وفات کلام مجید کی ایک آیت وجزاہم بما صبروا جنت وحریرا (سورہ دہر) سے قدرے ترمیم کے بعد یعنی جنت کی جگہ جنات کر کے نکالی ہے کیونکہ جنت کے لفظ میں ایک عدد کی کمی رہ گئی تھی، یہ تاریخ ان کی قبر پر کندہ ہے۔ مولانا حالی نے نواب صاحب کے منجھلے فرزند نواب محمد نقشبند خان کی تاریخ وفات بھی اسی سورہ دہر کی ایک دوسری آیت، وحلوا اساور من فضۃ (۱۲۹۴ء) سے نکالی ہے یہ دونوں تاریخیں دیوان حالی کے

آخر میں درج ہیں۔

اردو کلام کا نمونہ بہتر ہو گا۔ خود موصوف کے انتخاب کردہ کلام سے لیا جائے جو گلشن بے خار میں درج ہے، اور اس سے قبل شیفتہ نے اپنے بارے میں انتہائی عجز و انکساری سے کام لیا ہے اور یہاں تک لکھا ہے:

"کہ از کم وزنیہا رنمی خواست کہ بزمرہ موزونان بشمار آید"

اور اسی سلسلے میں یہ لکھا ہے کہ میں مومن سے خاص طور سے متاثر ہوں۔

ایک نالہ میں ستمہائے فلک سے چھوٹے
جس کو دشوار سمجھتے تھے سو آساں نکلا

گھبرائے اور غیر کے پہلو سے لگ گئی
دیکھا اثر یہ نالۂ بے اختیار کا

کب طالع خفتہ نے دیا خواب میں آنے
وعدہ بھی کیا وہ کہ وفا ہو نہیں سکتا

خوبیٔ بخت کہ پیمانِ عدو
اس کو ہنگام قسم یاد آیا

ہائے اس برق جہاں سوز پہ آنا دل کا
سمجھے جو گرمیٔ ہنگامہ جلانا دل کا

کتنا تھا وقتِ نزع کے ہر اک سے شیفتہ
دینا کسی کو دل تو وفادار دیکھ کر

یاں عجز بے ریا ہے نہ واں نازِ دلفریب!
شکر بجا رہا گلۂ بے سبب تلک!

ہیں جاں بلب کسی کی اشارت کی دیر ہے!
دیکھے ہے اس نگہ کو قضا اور قضا کو ہم!

کم التفاتیوں کا ہے وہم اہلِ بزم کو
شرمندہ ہو گئے نری شرم و حیا سے ہم

طوفانِ نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

ہرجائی اپنے وحشی کو کس منہ سے کہتے ہو
کیا آپ کا نشانِ قدم کُو بکُو نہیں

آہ و زاری نارسا، شوقِ اسیری بے اثر
کون لائے آشیانے تک مرے صیاد کو

ہجران کو ارادہ ہے سفر کا قیامت آتے ہیں شب درمیاں ہے

جس لب کے بوسے غیر لیں اس لب سے شیفتہ
کم بخت گالیاں بھی نہیں تیرے واسطے

وہ شیفتہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

ناصح تری زبان تیرے بس میں نہ ہو تو پھر
انصاف کر کہ دل یہ مرا اذ در کیا چلے

تذکرہ صلح غیر کا نہ کرو بات اچھی نہیں لڑائی کی
ایک دن تیرے گھر میں آنا ہی بخت و طالع نے گر رسائی کی

ایسی رغبت سے کرے قتل، گماں کا ہے کو تھا
شیفتہ اس کو تو دو تم سے محبت نکلی!

فارسی نمونہ کلام بھی لگے ہاتھ ملاحظہ کرتے چلئے ؎

بجز امید کہ ایمانِ عشق کیشان است
کسے نہ داد تسلی دلِ زلیخا را!

خندہ چہ خوش شیوہ ایست از پس خشم و عتاب
لذتِ دیگر دہد زخم نمک سود را

ہر کس کہ قتیل غمزہ اش شد اے حسرتی او ست قاتل ما

زحم است بہ کسے کہ دراں کوے من رود
در دست نامہ من و بر لب سلام ما

خدایا حشر برپا کن بہنگامے کہ عاشق را
بدل حسرت، بہ گردن دشنہ بر لب آفریں باشد

از مردن خود نیست غم، اما غم این ست
گویند کہ معشوق تو اعجاز نہ دانست

تو و رقص و مے پرستی من و وجد و جوش و مستی
تو و نغمہ ہائے دلکش من و نالہ ہا نہ کردن

حالی نے اپنی ایک مشہور غزل میں جسے دہلی کے نوحہ کے نام سے
موسوم کیا جاتا ہے اور جس کا یہ شعر بڑی شہرت حاصل کر چکا ہے ؎

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

منجملہ اور شعراء باکمال کے شیفتہ کا ماتم بھی کیا ہے ؎

غالب و شیفتہ و نیر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

ایک اور رباعی بھی اس ماتمی لے میں ہے یہ

غالب ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی
وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی
حالی اب اسی کو بزم یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

حالی کے کلام میں شیفتہ سے تاثر جابجا ملتا ہے۔ متعدد ہم طرح ہم مضمون غزلیں دونوں کے مجموعہ کلام میں ملتی ہیں۔ مثلاً شیفتہ کی مشہور غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے

دل لیا جس نے بے وفائی کی
رسم ہے کیا یہ دلربائی کی

وہ صنم تھی اپنی پارسائی کی
کبھی کبھی اور کس سے آشنائی کی
کیوں بڑھاتے ہوئے اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں
صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی
دل رہا پائے بند الفت دام
تھی عبث آرزو رہائی کی
دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کس سے
رکھیے امید دلربائی کی

نہ ملا کوئی غارت گر ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی

اسی طرح حالی کی مختلف غزلوں کے اشعار شیفتہ کے رنگ سے ملتے جلتے ہیں مثلاً

آگے بڑھے نہ قصۂ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ ادا سے ہم

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں

ہیں دورِ جامِ اولِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

بس ہو چکا بیانِ کسل و رنج و راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

فصلِ خزاں کمیں میں ہے صیاد گھات میں
مرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں

جی ڈھونڈتا ہے بزمِ طرب میں انھیں مگر
وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں

کل مدعی کو آپ سے کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

کہتے ہیں طبع دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے
بھولے رہے تصور مژگاں میں چند روز
دیکھا تو دل کو ہم ہدف تیر کر چکے

ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر!
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا!

مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر
بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

ضیا عظیم آبادی

حالی

(ایک مطالعہ)

حالی کی شاعری اپنے مواد اور مقصد کے اعتبار سے اتنی پائدار اور وسیع ہے کہ جس کی داغ بیل ماضی سے بڑھ کر حال تک پہنچ چکی ہے اور یقیناً مستقبل میں بھی پھیل کر رہے گی۔ اس کا مطالعہ محض فنی نقطۂ نگاہ سے ممکن نہیں اگر ہم محاکات، تشبیہات، رعایت لفظیاں اور صنایع و بدایع کو اصل شاعری سمجھ کر جائزہ لینا چاہیں گے تو صحیح قدر و قیمت مقرر نہ کر سکنے پائیں گے۔ بلکہ جب ہم انداز بیان کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر لیں کہ شاعر کا مفہوم کیا ہے؟ اُس نے کیا کہا ہے؟ اور الفاظ کے پردے میں کس حقیقت کو نمایاں کیا ہے؟ تب جا کر صحیح نتیجے پر پہونچ سکیں گے۔ اور دیانت داری کے ساتھ وہ مقام دے سکیں گے جو جائز اور مناسب ہو۔

ملک کے ممتاز نقاد پروفیسر احتشام حسین صاحب رضوی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "زندگی ہی کے خزانے سے تو ہر شاعر اپنے جیب و دامن بھرتا ہے لیکن زندگی کو سمجھنے اور اس کو شعر و سخن کے کام میں لانے کی صلاحیت ہر شاعر یا

نہیں ہوتی، کوئی زندگی کے نہاں خانے میں اُتر کر غالب بنتا ہے، کوئی میرؔ کوئی اقبالؔ بنتا ہے کوئی نظیرؔ، کوئی شاہ ظفرؔ بنتا ہے کوئی ناسخؔ۔ مواد اور موضوع کے انتخاب اور اس کے سانچے کے انتخاب پر شاعری کی کامیابی اور ناکامیابی کا انحصار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اوّل شئے مواد ہے۔ اس میں جتنی تازگی جتنی جان اور جتنی توانائی ہوگی، اتنی ہی کامیابی حاصل ہوگی۔ اب رہا سانچے کے انتخاب کا سوال سو اس لئے ضروری ہے کہ موضوعات مختلف وزن کے ہوتے ہیں بعض غزل کی نازک مزاجی سے ہم آہنگ ہو کر بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ بعض قطعات اور رباعیات کے ملبوس میں جاذب نظر دکھائی دیتے ہیں اور بعض نظم کی پوشاک میں حسین دکھائی دیتے ہیں، اس لئے ایک باہوش فن کار کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے سانچے بھی منتخب کرے تاکہ خاطر خواہ اثرات مرتب ہو سکیں، ایسا ممکن ہے کہ غیر مناسب سانچے کا انتخاب موضوع کی حقیقی قدر و قیمت نہ نمایاں کر سکے اور اثر انداز ہونیوالی بات صدا بصحرا ہو کر رہ جائے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ محض سانچہ ہی سب کچھ ہے۔ یہ تو اظہار مطلب کا ایک ذریعہ ہے اور ذریعہ کبھی اصل مقصد نہیں بن سکتا بلکہ اصل مقصد تو وہی موضوع و مواد رہے گا جو شاعر نے پیش کیا ہے اور اس کا مرتبہ بھی اسی لحاظ سے مقرر کیا جائے گا۔

حالی کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے بھی سانچہ بعد میں، سب سے پہلے

مواد اور موضوع کو دیکھنا ضروری ہوگا ورنہ ہماری رائے صائب اور درست نہ ہوگی۔

جہاں تک ادب اور زندگی کے رشتے کا سوال ہے وہاں تک ہر فرد متفق ہے اور کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ قصہ چہار درویش ہو یا الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ ہو یا فسانہ خورشیدی، سب میں لاشعوری طور پر سہی لیکن حیات کی کار فرمائیاں ہیں اور ان کے موضوع و مواد بھی قطعاً اس محدود زندگی ہی سے لئے گئے ہیں جو سماجی نظام کے ماتحت اُس دور کے ارباب قلم کے سامنے تھی۔

لہذا یہ تو اب سمجھا ہی نہیں جا سکتا کہ مواد کوئی غیر مادی شے ہے اور شاعر خلا میں پرواز کرتا ہے یا اسے الہام ہوتا ہے۔ قطعاً وہ بھی ہماری طرح گرد و پیش سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے فن کا سہارا لیکر الفاظ کے پردے میں مصوری کرتا ہے۔

اس مصوری کے دو پہلو ہیں ایک مثبت دوسرا منفی، ایک ہی واقعہ سے ایک ہی زمانہ میں دو فن کار الگ الگ اثر قبول کرتے ہیں ایک اپنے مرقع میں اثباتی طور پر رنگ آمیزی کرتا ہے اور دوسرا منفیانہ حیثیت سے۔

ظاہر ہے کہ جس نے نفی کی ہے اس پر فرار و گریز کا الزام عاید ہوگا اور جس نے اثباتی رجحان پیش کئے ہیں اسے نباض وقت کہا جائے گا۔ حالی میں یہی خصوصیت بدرجہ اتم پائی جاتی ہے وہ اول تا آخر

مثبت نظریہ کے قائل رہے اور کسی موقعہ پر منفی نقطہ نگاہ نہ پیدا ہوا۔ ان کی یہ صفت اس وقت اور زیادہ اجاگر ہو جاتی ہے۔ جب ہم ان کے عہد اور معاصرین پر نظر ڈالتے ہیں۔

وہ ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ سرسید سے بیس سال چھوٹے، اور اکبر الہ آبادی سے نو سال بڑے تھے۔ عین عنفوان شباب میں ۱۸۵۷ء کے غدر کا سامنا کرنا پڑا، اور ملک میں عظیم الشان انقلاب آگیا۔ شہنشاہیت کی جگہ نیم جاگیردارانہ اور نیم صنعتی حکومت کا پرچم لہرانے لگا۔ متوسط طبقے کے اندر فرقہ پرستی کا زہر پھیل گیا۔ مسلمان عہد گذشتہ کو سینے سے لگائے وقت کے ساتھ چلنے سے انکار کرنے لگے اور نئے مہاجنی نظام کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

نفسیاتی طور پر یہ احساس کمتری تھا اور شکست خوردہ ذہنیت کا مظاہرا، انگریزوں کی ہر چیز بری معلوم ہو رہی تھی اور مذہب میں غلو پیدا ہو رہا تھا۔ معاشی اور سیاسی نوعیت کو نظر انداز کر کے عیسائی حکومت کا جذبہ غالب آگیا تھا قدم قدم پر کفر و ایمان کا مسئلہ چھڑا ہوا تھا اور بات بات میں "اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ لگایا جا رہا تھا اس ہی لئے سرسید معتوب تھے اور انھیں زندیق و کافر تک کہنے سے گریز نہیں کیا جا رہا تھا اور جدید و مفید چیزوں کا استعمال بھی ممنوع و حرام قرار دیا جا رہا تھا۔ عام مسلمانوں کا ذہن رجعت قہقری کرتا ہوا سکڑوں سال پہلے کی دنیا میں پہنچ گیا تھا اور داستان پارینہ کے دامن میں حقیقی سکون محسوس کیا جا رہا تھا۔

اکبر الہ آبادی پر یہ جذبہ شدت سے طاری تھا اور وہ اس عہد میں ہماری ذہنیت کی پرورش کر رہے تھے۔ قوم کو بجائے اس عصبیت سے نکالنے کے اور زمانے کا ساتھ دیتے ہوئے جدید علوم و فنون حاصل کرنے کا مشورہ دینے کے یہ فرما رہے تھے۔ ع

کتاب دل مجھے کافی ہے اکبر درس حکمت کو
میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مجھ سے مل نہیں ملتا

دل کو بھایا نہ کوئی راگ محبت کے سواء
عقل کو کچھ نہ ملا علم سے حیرت کے سوا
سامنے کچھ نہ رکھ آئینہ فطرت کے سواء
آگہی تجھ کو نظر صانع عالم کی جھلک

ظاہر ہے کہ یہ منفی نقطہ نگاہ ہے کسی قوم کو حالات سے کنارہ کش کر کے زندہ نہیں رکھا جا سکتا۔ خوش اعتقاد حضرات لاکھ بھی تاویلیں کریں لیکن اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتے کہ اکبر کی وجود پرستی زندگی کی نفی کر رہی تھی اور جس بہ دھارے کو بہر طور آگے بڑھنا تھا اسے روکنے کی ناکام کوشش میں مشغول تھی۔ اگر بدقسمتی سے وہ اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتے تو شاید ہندوستانی مسلمانوں میں آج سوا بدھو، جمن اور کلو کے کوئی نظر نہ آتا۔

لیکن خدا بھلا کرے حالی کا جو سرسید کے دست راست بن کر جلوہ گر ہوئے اور اکبر کے برعکس یہ کہتے ہوئے دکھائی دیئے ع

حالی اب آؤ پیرائی مغربی کریں
بس اتباع مصحفی و میر ہو چکی

یہ پیروی مغربی نہ تو کورانہ ذہنیت کا نتیجہ تھی نہ نئی حکومت کو

خوش کرنے کے لئے محض قومی و ملی ہمدردی کے باعث تھی ۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے حالی کی شخصیت بہت بلند ہو جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا شعور حد سے زیادہ بالغ تھا ۔ اور وہ بیک نظر حالات کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔

غدر کے بعد کا دور سراسر غیر متوازی اور غیر معتدل تھا ۔ جذباتیت ہر شخص پر طاری تھی اگر کچھ لوگ مغربی تعلیم حاصل کر کے اپنے کو مستقل صاحب بہادر سمجھ رہے تھے اور اپنی تمام چیزوں کو نظر انداز کئے دے رہے تھے ۔۔ تو اکثریت کی خواہش تھی کہ موٹر کے بجائے اونٹ کی سواری کا رواج ہو ۔ تار برقی اور ریل گاڑیاں ہرگز ہرگز ہندوستان میں رائج نہ ہونے پائیں ۔ اور ذرہ برابر بھی تبدیلی نہ ہو سکے ۔ ایسے عالم میں کسی یک طرفہ نظریہ کی تشہیر و ہم نوائی ممتاز فنکار کی شان نہیں ہو سکتی تھی ۔ اس لئے کہ فن کار ہم میں سے ہوتے ہوئے بھی ہم سے بلند ہوتا ہے جن چیزوں پر ہماری نگاہیں نہیں پہنچتیں یا پہنچکر کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتیں ان چیزوں کا وہ تجزیہ کرتا ہے ماہیت اور اصلیت دریافت کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ حقیقت میں یہ کیا ہیں ۔؟

حالی کا کلام انھیں اوصاف کی ترجمانی کرتا ہے اور اپنے معاصر اکبر سے بدرجہا افضل و اعلیٰ ہے ۔ آخر الذکر کا فن جذباتیت و سطحیت کا شکار ہو گیا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں زندگی کے متحرک اور منقلب ہونے کا یقین نہیں ہے ۔ وہ حیات کو جامد تصور کرتے ہیں اور تبدیلیوں سے پریشان و مضطرب ہیں ۔ ان کا جی چاہتا ہے کہ عمر رواں کی رفتار

بک جائے اور ایک مخصوص تہذیب ہمیشہ باقی رہے۔ گرچہ عملاً وہ شکست کھاتے ہیں۔ اور باوجود مغربی تعلیم و مغربی کلچر کا استہزا کرنے کے اپنے صاحبزادے کو اسی میکدے سے سرشار ہونے کے لیے یورپ بھیجتے ہیں۔ پھر بھی ان کی نگاہوں میں وسعت نہیں آتی اور جھلاہٹ بدستور قدیم باقی رہتی ہے

لیکن اس کے برعکس اولذکر کا احساس قوی ہے شعور رنجیدہ ہے اور اسے انقلاب عظیم سے کوئی حیرت نہیں ہوتی وہ جانتا ہے کہ مزاج عالم تغیر پذیر واقع ہوا ہے۔ تاریخ بدلتی رہتی ہے اور ہر پرانے سماج سے ایک نیا سماج جنم لیتا ہے۔ جس کی تہہ میں اپنے ماقبل نظام کے کچھ اثرات باقی رہتے ہیں اسی لئے وہ قدامت کے صالح عناصر کو جدت کے صحتمند عناصر سے مربوط و متحد کر کے ایک ایسی متوازن شاعری کی داغ بیل ڈالتا ہے جو ہر دور میں باقی رہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

حالی نے قوم کو جذبات سے بلند ہو کر غور و فکر کی دعوت دی اور یہ بتایا کہ آنے والا انقلاب تو اب آچکا۔ اس کا رونا رونے سے گئی ہوئی عظمت نہیں حاصل ہو سکتی البتہ اگر اپنے اقتدار اور وقار کو پھر واپس لینا ہے تو وسیع النظری وسیع القلبی اور وسیع الدماغی پیدا کرو۔ مذہب مذہب چلانے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ مذہب کی روح اور ارباب مذہب کی مساعی جمیلہ کو مشعل راہ بنا کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مسدس میں عہد ماضی کی شاندار تصویریں دکھاتے ہوئے حال سے موازنہ کیا اور مسلمانوں میں جرأت و حرارت پیدا کر دی ہے

اسی لیے دیانت داری کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبر کی اخلاص پسندی اور خود فریبی اور مغالطہ ہے اور حالی کی قوم پروری خود اعتمادی اور خود شناسی ہے ایک کی شاعری اسیر و پابند بنانے والی ہے اور دوسرے کی شاعری آزادی اور حریت پسندی سکھاتی ہے ایک تھکی ہوئی قوم کو روایات کے جھولے میں میٹھی میٹھی لوریاں دے رہا ہے اور دوسرا عہد گذشتہ کے کارنامہ یاد دلا کر بیدار و ہوشیار کر رہا ہے۔ ایک کا کلام پر لطف ہے اور دوسرے کا کلام پر اثر ایک جوش و شدت کے ساتھ حالات سے بے خبر ہو کر سوچتا رہا اور دوسرا اسلامت روی کے ساتھ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے فکر کرتا رہا۔

میرا مدعا اس مضمون میں اکبر و حالی کا موازنہ نہیں ہے بلکہ ضمناً صرف یہ بتانا ہے کہ جب ان کے عظیم الشان معاصر اس طور پر جولانی طبع کا مظاہرا کر رہے تھے اور شکست خوردہ طبائع کیف و سرور حاصل کرنے میں مشغول تھے اس وقت، انھوں نے قبول عام سے بے نیاز ہو کر اپنی آواز بلند کی۔ اور جو دیانتداری کے ساتھ صحیح سمجھا اسے پرخلوص طور پر پیش کیا۔

اکبر و حالی میں نمایاں فرق یہ ہے کہ اول الذکر عملاً تو مغربی تعلیم، مغربی سرکار کی ملازمت اور مغربی حکومت کا احترام سب کچھ گوارا ہی نہیں بلکہ بخوشی و رغبت قبول فرما رہے تھے مگر قول سے تمسخر و نفرت کا ثبوت دے رہے تھے۔

آخر الذکر کی یہ صورت نہیں تھی۔ انھوں نے اگر مصحفی، و میر کی

اتباع کا دور ختم سمجھتے ہوئے پیروی مغربی ضروری تصور کی تو محض زبانی نہیں بلکہ عملاً کرنل ہالرائڈ کی معیت میں ایک ایسی ادبی انجمن بنائی جس میں طرحی مشاعروں کے بت کو توڑ کر نظموں کو رواج دیا گیا اور برکھا رت، صبح امید وغیرہ کہکر موضوع و مواد کی تبدیلی کے لئے راہ ہموار کی گئی۔

اس ادبی انقلاب لانے میں حالی کا مقصد صرف یہ تھا کہ مذاق شعر واد ب بدلے اور قوم پر جو داغ کے بہکے ہوئے تعیش پسندانہ اشعار نے جادو کر رکھا ہے یا روایاتی تصوف کے غلط توکل بے جا استغنار اور نارواجمود نے غزل میں تمام تر جگہ پالی ہے وہ طلسم ٹوٹے اور کلام کی باتیں کہنے و سننے کا ذوق پیدا ہو۔

یوں تو حالی سے قبل بھی اردو ادب میں نظمیات کا چلن خال خال پایا جاتا ہے اور نظیر اکبر آبادی و نثر رجبان آبادی وغیرہ اس صنف میں طبع آزمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن وہ شعور وہ عمق وہ توازن اور وہ مواد نہیں ملتا جو ان کا طرہ امتیاز ہے انھوں نے ایک نئی شاہراہ تعمیر کی جس پر اقبال، جوش، مجاز اور دوسرے باہوش فن کار وطن پرستی کا پرچم لہراتے ہوئے چلے اور ہمارے شعری ادب میں ترقی پسندانہ شاعرانہ رجحانات کا زندہ جاوید باب کھل گیا۔ آج جس کارواں کو ہم منزل سے قریب دیکھ رہے ہیں اس کے میر اور پیش رو حالی ہی ہیں۔

یہاں پر ایک بات اور عرض کر دوں، بعض لوگوں نے خواہ مخواہ حالی کے مقطع میں پیروی مغربی سے مراد ہے ایران کے غیر معروف صوفی شاعر سے لی ہے۔ اس تخیل کو دور کا بھی حقیقت سے لگاؤ نہیں ہے

مغربی سے مراد تمام تر ارباب فرنگ ہیں اور حالی نے جو ان لوگوں میں مستعدی اپنے وطن سے محبت، قومی ہمدردی اور وقت کی قدر و قیمت وغیرہ وغیرہ پائی تھی اسے ان کی کامیابی کا سبب سمجھا تھا۔ ان کے ادب میں بھی انھیں زندگی سے قربت اور حیات کا ساتھ دینے کی صلاحیت دکھائی دیتی تھی۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ قوم تعصب اور تنگ نظری ترک کر کے اچھی باتوں کو اخذ کرے ان کا عقیدہ حضرت علیؓ کے اس قول کے مطابق تھا: "یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے۔"

حالی کو اس سے انکار نہیں تھا کہ ایک زمانہ میں یہ تمام جوہر مسلمانوں کی میراث تھے اور انھیں سے دوسروں نے حاصل کیا۔ مسدس کے زیادہ حصہ میں اس کا اعتراف و اقرار موجود ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کا یہ خیال بھی پختہ تھا کہ اب قوم بالکل تہی دست ہو چکی ہے وہ اپنا سرمایہ لٹا کر کھوکھلی اور بے روح ہے اسی کی امانت اب جس نے اپنا لی ہے اسے چاہئیے کہ اس سے دوبارہ حاصل کرے اور اس میں جھجھک یا شرم نہ محسوس کرے۔

اُن کی تمام تر کوشش نئی اور پرانی تہذیب کے درمیان مفاہمت اور تجزیہ کرتے میں صرف ہوئی وہ اپنی زندہ قدروں کو دوسروں کی جاندار قدروں سے ہم آہنگ کرنے میں ہمیشہ ہمیشہ پیش پیش رہے انھیں ٹھہراؤ اور جمود سے نفرت تھی وہ آگے بڑھنا اور حرکت کرنا انسان کا فرض سمجھتے تھے

جس طرح غالب نے اپنے خطوط سے اردو زبان میں ایک نیا سبز طارح کیا۔ اسی طرح حالی نے تنقید کا ایک اصول قائم کر کے تابانی بخشی۔

اُن سے پہلے ہمارے یہاں ع

"پسند اپنی اپنی نظر اپنی اپنی"

کا معاملہ تھا مگر وہ پہلے شخص ہیں جس نے غزل کی طرح اس بت کو بھی توڑا اور مقدمہ شعر و شاعری لکھکر وہ مقام حاصل کر لیا کہ آج مغرب زدہ نقاد پرنسپل کلیم الدین احمد بھی یہ کہنے پر مجبور رہی ہو گئے کہ "تنقید کے جدید اور بیش بہا اصول مدون ہونے کے باوجود حالی کا بتایا ہوا راستہ منفرد اور مستحکم ہے۔

"اسکر وائلڈ" کہتا ہے کہ اگر کسی سے سچی بات کہلوانا ہو تو اسے ایک نقاب دے دو۔ حالی کا فن دراصل نقاب ہی ہے انھوں نے پردے پردے میں وہ کام کیا ہے جو شاید کھلم کھلا ممکن نہ تھا۔ شعر و ادب کے فرسودہ و مجہول مزاج کو اس دور میں بدلنا جب ہر طرف جذباتیت کا بول بالا تھا۔ کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن ان کے اخلاص میں اتنی صداقت تھی کہ جس راہ سے گذرنے میں سرسید پر کفر کا فتوی لگ گیا تھا اسی راہ سے حالی مرد میدان نے خراج تحسین و آفرین وصول کرتے ہوئے گذر گئے۔ اور اپنا نقش قدم اتنا پائدار اور مستحکم چھوڑ گئے۔ جو کسی کے مٹائے نہ مٹ سکا۔

ایک عظیم فنکار کی یہ کبھی علامت ہے کہ وہ زندگی کی گردش کو کسی خاص طبقہ میں محصور نہ ہونے دے۔ غدر کے بعد جو متوسط درجہ میں تعصب پیدا ہو گیا تھا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جدید حکومت سرمایہ دارانہ مزاج کی

حائل بھی عوام کو ابھرنے کا موقعہ مل رہا تھا۔ اور درمیانی درجہ اپنی پوزیشن متنزلزل پا رہا تھا۔

حالی بھی اسی حلقے سے وابستہ تھے اور اصولی طور پر اکبر کی طرح انھیں بھی طبقاتی اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے تہذیب جدید سے اظہار نفرت کرنا چاہیے تھا مگر وہ ڈی کلاس ہو کر عوام سے قریب ہو گئے تھے اور محدود و محصور حیات کو وسیع اور پھیلا ہوا دیکھنا چاہتے تھے، روایات کے تبوں کو توڑتے ہوئے آگے بڑھے اور ہمت و جرات کے ساتھ اپنا فرض انجام دینے لگے۔

ان کا موضوع سراسر حیات بخش تھا۔ انھوں نے زندگی کے مثبت پہلو سے مواد حاصل کیا تھا، وہ حالات کے سامنے سپر ڈالنے کے قائل نہیں تھے بلکہ حالات سے ہم آہنگ ہو کر اپنے میں طاقت اور صلاحیت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ان کا شعور ایک ترقی پسند انسان کا شعور تھا وہ سائنسی ایجادات سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ بین الاقوامی رشتہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ انگریزی تعلیم سے استفادہ کرنا چاہتے تھے اور تصور کی دنیا سے نکل کر عمل کی دنیا میں آنا چاہتے تھے۔

اُن کے فن اور اقدامات کو سمجھنے میں انیسویں صدی کا چوتھائی اور بیسویں صدی کا ابتدائی دور معین و معاون ہو گا۔ یہ وہ عہد ہے جس میں عوامی طاقتوں نے نیم صنعتی حکومت کے سایے میں انگڑائی لی

اور خواص دنیم خواص یعنے متوسط حلقہ براہ راست اپنے اثرات پر ضرب کاری محسوس کرتے ہوئے پرانی قدروں کی دُہائی دینے لگا۔

دراصل انگریزی حکومت کے پردے میں مقامی عوام سے نفرت کارفرما تھی اور لاشعور طور پر معاشی واقتصادی مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ تہذیب قدیم و تہذیب جدید کی ٹکر حقیقتاً طبقاتی ٹکر تھی جس میں حالی نے عوامی اور ترقی پسند فنکار کا رول ادا کیا اور اسی نے انھیں زندہ جاوید بنا دیا۔!

ڈاکٹر فاطمہ شجاعت صاحبہ

حالیؔ کے مذہبی تصور کے چند پہلو

۱۔ لا دریت

جب انسان کو اس کا احساس ہونے لگتا ہے کہ کائنات کے مقابلے میں اس کی ہستی بلکل کمتر ہے، علمی قوتوں اور تسخیر فطرت کے زبردست کارناموں کے باوجود اس کا علم اور قوت بہت محدود ہے تو اس کے دل میں سچا عجز و انکسار پیدا ہوتا ہے، لیکن اس احساس اور شعور کی بدولت اس کی علمی قوتیں معطل ہونے نہیں پاتیں بلکہ اس کے دل میں ایک ایسی برتر ہستی کا احساس اجاگر ہوتا ہے جو ساری کائنات پر حاوی ہے۔ اس احساس کی وجہ سے انسان کے دل میں وجہ الوجوہ کا پتہ چلانے اور علت العلل کی تہ تک پہنچنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ اسی شوق تجسس کی بنا پر اگر عصر حاضر کے مشہور رباعی گو "شاعر امجد" نے پیدائش اور موت، مقصدِ حیات اور وجہ فنائیت کے بارے میں یہ بنیادی سوال اٹھائے ہیں۔

بہت سوچا سمجھ میں کچھ نہ آیا
مجھے اس نے بنایا، کیوں بنایا؟

عدم میں کس مزے سے سو رہا تھا
مجھے کس نے جگایا، کیوں جگایا؟

بہت دور ایک کونے میں پڑا تھا
مجھے کس نے بلایا، کیوں بلایا؟

پھر آخر اس بھری محفل سے امجد
مجھے کس نے اٹھایا، کیوں اٹھایا؟

تو ایران کے بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے والے رباعی گو شاعر عمر خیام کو بھی انسان کے تخلیق کیے جانے، زندگی گزارنے اور بالآخر موت کے گھاٹ اتارے جانے کی کوئی تسکین بخش وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور وہ اپنے اسلامی ایمان اور اعتقاد کے باوجود اضطراب سے متاثر ہو کر ایک متشکک فلسفی کی حیثیت سے صاف کہتے ہیں۔

در آمدن و رفتن ما سودی کو؟ — وز تارِ وجودِ عمر ما پودی کو؟
در چنبر چرخ جاں چندیں پاکاں — می سوزد و خاک می شود، دودی کو؟

یا پھر یہ رباعی جس میں وہ اور بھی واضح طور پر پیدائش اور موت کے مسئلوں پر حیرت و استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں

آورد بہ اضطرارم اول بوجود — جز حیرتم از حیات چیزی نفزود
رفتیم باکراہ و ندانیم چہ بود — زیں آمدن و ماندن و رفتن مقصود؟

اور تو اور اکبر جیسے مذہبی، مذہب پسند اور عقیدت مند شاعر بھی احترام اسلام اور ایمان اور عقیدہ میں پختہ ہونے کے باوجود متفکرانہ اور متشکّکانہ موڈ میں یہ لکھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

نزع کا وقت برا وقت ہے خالق کی پناہ
ہے وہ ساعت کہ قیامت سے سوا ہوتی ہے

روح تو ایک طرف ہوتی ہے رخصت تن سے
آرزو ایک طرف تن سے جدا ہوتی ہے

جسم تو خاک میں مل جاتے ہوئے دیکھتے ہیں
روح کیا جانے کدھر جاتی ہے۔ کیا ہوتی ہے؟

بہر حال تخلیق اور فنا کے بارے میں ہمیں ایسے بیشتر اشعار مل جاتے ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ برس ہا برس کی کھوج اور غور و خوض کے باوجود انسانی دماغ اصلیت کا پتہ چلانے سے قاصر ہے۔ سچائی اور حقیقت کی تہ تک پہنچنے سے معذور ہے۔ اگر اردو کے مایۂ ناز شاعر اور مفکر اعظم خدائے سخن غالب نے یہ کہا ہے۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکن زلف عنبریں کیوں ہے؟ — نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ — ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟

تو اردو زبان ہی کے ایک کم معروف شاعر شاد عظیم آبادی نے ایک شعر میں

اپنی لاعلمی اور محدود معلومات کا اعتراف یوں کیا ہے۔

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے، نہ انتہا معلوم؟

شاد عظیم آبادی کا یہ شعر ظاہرہ طور پر ہی نہیں غالباً حقیقت میں بھی کلیم کے اس مشہور فارسی شعر کا ترجمان ہے:۔

ما ز آغاز و انجام جہاں بے خبریم
اول و آخر ایں کہنہ کتاب افتاد است

ان متعدد مثالوں سے جن میں ادبیات کے طالب علم جستجو اور تلاش سے مزید اضافے کر سکتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ قدیم زمانے سے شاعر اور ادیب، مفکر اور محقق غور کرتے چلے آئے ہیں کہ دنیا کیوں پیدا کی گئی؟ آفرینش کیسے ہوئی؟ کب ہوئی؟ کیونکر ہوئی؟ ہم کون ہیں؟ زندگی کا کیا مقصد ہے؟ سزا اور جزا کے کیا معنے ہیں؟ کائنات کا پیدا کرنے والا کون ہے؟ کیا وہ قادر مطلق ہے۔؟ عقل محض ہے؟ نیکی اور پاکیزگی، شرافت اور ایمان کا چشمہ اور سرچشمہ ہے؟ اگر یہ سب کچھ صحیح ہے تو دنیا میں اتنی بے ایمانیاں، غداریاں، بے وفائیاں، شرارتیں، مصیبتیں، اذیتیں، جنگیں اور لڑائیاں کیوں ہیں؟ ارحم الراحمین کی ذات اور دنیا بھر میں آگ اور فساد اور دونوں کی یہ وسعت اور شدت!

پکے مسلمان اور راسخ العقیدہ بزرگ ہونے کے باوجود حالی کے ایک عالی دماغ اصاف گو اور تحقیق پسند مفکر ہونے کا یہ ثبوت ہے کہ ہر قسم کی فلسفیانہ اور غیر فلسفیانہ تشریحوں اور تاویلوں سے حسب الخلیں سیری کیا معنے جزوی

تشفی بھی نہیں ہوتی تو ایک بے ریا محقق اور فلسفی کی حیثیت سے اعتراف کرتے ہیں۔

کاوش میں ہے الہی، دگدا میں ہے طبیعی
جو حل ہوا نہ ہوگا، وہ ہے سوال تیرا

خاص کر قضا و قدرت، قسمت و محنت تدبیر اور تقدیر، پیدائشی صلاحیت اور پرورشی تاثیریت قدرتی قابلیت اور تعلیمی اثر پذیری کی طرح اختیار اور مجبوری کے کبھی نہ حل ہو سکنے والے مسئلوں کے بارے میں کہتے ہیں۔

سپر بھی دی تو نے، تیغ بھی دی مگر دیے ہاتھ باندھ سب کے
جنھیں تھا یاں اختیار سب کچھ، انھیں بھی بے اختیار دیکھا

گویا خدائی قدرت کے آگے ہر چیز ہیچ ہے۔ وہی قادر مطلق اور محیط کل ہے اس نے سب کچھ دے کر بھی بہت سی چیزیں اپنے قبضۂ قدرت میں اس طرح رکھی ہیں کہ انسان کا ان پر بس نہیں۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد انھیں از سر نو ذہنی خلش ہوئی ہوگی کہ اگر انسان مجبور اور بے بس ہے تو جنت اور دوزخ، سزا اور عذاب کے کیا معنے؟ اس ذہنی خلش سے جب حالی کو باوجود فلسفیانہ اور غیر فلسفیانہ تاویل اور ہر قسم کی تشریح اور توضیح سے تشفی نہیں ہوتی تو وہ ہر پھر کر لاادریت کے دبستان سے وابستہ ہو کر قضا و قدر، تخلیق و موت، بیماری اور صحت، تکلیف و راحت، وجود کی غرض و غایت وغیرہ جیسے ابدی مسئلوں پر غور کرنے کے بعد انسان کی محدود ترین معلومات کے مدنظر اعتراف کرتے ہیں۔

مٹی سے، ہوا سے، آتش و آب سے یاں — کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں
پر تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک — گنجینۂ غیب میں اسی طرح نہاں[۱]

جیسے جیسے میں مولانا حالی کے کلام کا مطالعہ کرتی رہی ہوں اور عمرانی علوم سے میری واقفیت بڑھتی جاتی ہے، یہ عقیدہ بھی پختہ ہوتا جاتا ہے کہ مولانا حالی محض کسی سوجھ یا تخیل کو منظوم نہیں کرتے تھے بلکہ تمدنی علوم اور فلسفے سے متعلق چند نکات ان کے ذہن میں اچھی طرح جاگزیں ہو گئے تھے جنھیں بوقع محل کے لحاظ سے وہ واضح بھی کرتے رہے۔ اس کی مثال لاادریتی تخیل ہے، چنانچہ مولانا حالی "مناجات بیوہ" میں کہتے ہیں۔

پہروں سوچتی ہوں یہ جی میں — آئی تھی کیوں میں اس نگری میں؟
ہونے سے میرے فائدہ کیا تھا؟ — کس لیے پیدا مجھ کو کیا تھا؟
آن کے آخر میں نے لیا کیا؟ — مجھ کو میری قسمت نے دیا تھا؟
نین دیے اور کچھ نہ دکھایا — دانت دیے اور کچھ نہ چکھایا!
جندڑی دی اور خوشی نہ بخشی — دل بخشا دل لگی نہ بخشی!

غرض ایک ہی خیال ہے جو مولانا کبھی تو غزل کے لیے موزوں فلسفیانہ زبان میں بیان کرتے ہیں، کبھی رباعی میں ڈھال کر زیادہ وضاحت سے

۱۔ "کلیات نظم حالی" حصہ اول۔ صفحہ ۱۴۲۔ اس رباعی کی تشریح میں مولانا نے لکھا ہے :۔
"جو کچھ اب تک ظاہر ہوا ہے وہ مقابلہ اس کے جو خزانہ غیب میں مخفی ہے، کالن لم یکن ہے۔"

پیش کرتے ہیں اور کبھی ہندوستانی خاندانوں کی کسی نمایندہ ہستی کی طرف سے عام فہم، سادہ ترین اور دل میں کھپ جانے والی، عوامی اور جمہوری زبان میں بیان کر کے ساحری کرتے ہیں۔

۲۔ وحدانیت کی تعلیم

اسلام کی روح اور قرآن کی تعلیمات کے مطابق حالی خدائے واحد کی ذات میں مطلق یقین اور اٹل اعتقاد رکھنے کی تعلیم دیتے ہیں جس کی بڑائی اور برتری مسلّم اور ناقابل بحث ہے۔ وہ خدا کی بزرگی، عظمت اور جلال کو جس طرح غیر متزلزل عقیدت سے بیان کرتے ہیں اس سے ان کا اٹل ایمان اور اسلام کے اس اہم ترین عقیدے میں پختگی کا ثبوت ملتا ہے۔

کہ ہے ذات واحد عبادت کے لائق — زبان اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرمان طاعت کے لائق — اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اس سے اپنی لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم — اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم — اسی کی طلب میں مرو گر مرو تم
مبرا ہے شرک سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کی بڑائی[1]

۱۔ "مسدس حالی" بند ۳۴-۳۶

۳۔ دین، مسلمانیت اور عبادت کا افادیتی تصور

مولانا کی مذہبی سماجیات کا یہ منور پہلو ہے کہ وہ مذہب کی عقلمندانہ اور افادیت پسندانہ تاویل کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک دین برحق کی۔

شان یہ ہے کہ اس میں کوئی چیز انسان کو مجبور کرنے والی نہ ہو، نہ اعتقادیت میں کوئی محال بات تسلیم کرائی جائے .... نہ عبادات میں کوئی بوجھ ایسا ڈالا جائے کہ عاجز بندوں سے اس کی برداشت نہ ہو سکے۔ کھانے، پینے، پہننے اور برتنے کی چیزوں میں ان کے لیے اسی قدر روک ٹوک ہو جیسے طبیب کی طرف سے بیمار کے حق میں ہوتی ہے اس کا بڑا مقصد اخلاق کی تہذیب اور نفس انسانی کی تکمیل ہو۔ اس میں عبادت کے طریقے ایسے عمدہ ہوں جن میں مشقت کم اور فائدہ بہت ہو۔ اس کے اصول ایسے جامع ہوں کہ ایک نیکی میں بہت سی نیکیاں مندرج ہوں۔ اس میں کوئی بندش ایسی نہ ہو جس سے انسان کو اپنی آزادی سے دست بردار ہونا پڑے۔ اس میں کوئی مزاحمت ایسی نہ ہو جس سے انسان پر ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں اور وہ خلافت رحمانی کا منصب حاصل کرنے سے محروم رہ جائے اور جس خوان یغما سے بنی نوع بہرہ مند ہیں اس میں ان کا شریک نہ ہو" [۱]

مولانا اس حد تک دین کو اخلاق کی تہذیب اور نفس انسانی کی تکمیل کا

۱۔ "مقالات حالی" پہلا حصہ۔ صفحہ ۴۰

ذریعہ سمجھتے تھے کہ اپنے خیال کی تائید میں آنحضرت کی اس روایت کو بیان کرتے ہیں جس میں آپ نے دین کا انحصار "حسن اخلاق" پر بتایا تھا اور باصرار اس خیال پر قائم رہے [1] ایک اور موقع پر آپ نے ایک روزہ دار۔ نمازی اور عبادت گزار عورت کے بارے میں جو بدخلق اور مردم آزار واقع ہوئی تھی یہ فرمایا تھا کہ وہ اہل دوزخ میں سے ہے [2] اس سے مولانا یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ "وضو اور غسل، نماز و روزہ حج اور زکوۃ اور اسی طرح تمام ظاہری احکام مقصود بالذات نہیں بلکہ محض تصفیۂ باطن، معالجۂ نفس اور تہذیب اخلاق کے لیے بمنزلۂ آلات کے ہیں"۔ [3]

مسلمان کی تعریف بھی مولانا نے جس طرح کی ہے وہ بھی ان کے عقلیت پسند اور افادیت دوست ہونے کی دلیل ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

"مسلمان سے یہ مراد ہے کہ دین اسلام کے حق ہونے پر اپنی ذاتی تحقیقات سے نہ کہ ماں باپ کی تقلید سے یقین واثق رکھتا ہو۔ اسلام کو اعلیٰ ترین اخلاق کی تعلیم دینے والا، غیر مذہب والوں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ سکھانے والا اور فتنہ و فساد، ظلم و بے رحمی کی بیخ کنی کرنے والا، غرض کہ اس کی تعلیم کو نوع انسانی کے حق میں سراسر رحمت و برکت سمجھتا ہو۔ خدا کے

۱۔ "مقالات حالی" حصہ اول صفحہ ۵۰

۲۔ " " " " " "

۳۔ " " " " " ۵۹

سوا کسی کو مستحق عبادت اور نبی کے سوا کسی انسان کے قول کو واجب الاتباع نہ جانتا ہو۔ اسلام کی حمایت کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد خیال کرتا ہو۔ مسلمان کی عزت چاہنے والا اور ان کی ذلت پر افسوس کرنے والا، جس بات کو سچ جانے اس کو ظاہر کرنے میں کسی کی مخالفت سے نہ ڈرتا ہو۔ معاملات میں راست باز اور برائی کے عوض بھلائی کے سوا کچھ نہ کرتا ہو۔[1]

مولانا صحیح بخاری کی اس حدیث کی تائید کرتے ہیں کہ سچا مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں اور مہاجر وہ ہے جو برائیوں کو چھوڑ دے۔[2]

مذہبی سماجیات، اخلاقی سماجیات، فہم عامہ اور عقل و ادراک کے لحاظ سے بہتر اور قابل عزت ہستی وہ ہے جو نہ صرف عابد و زاہد بلکہ نیکی کی خواہاں، نیک فطرت اور نیک چلن ہو۔ جب ایسے نیک مزاج شریف اور نیک کردار افراد جن کا عمل حسن اخلاق اور حسن اخلاص پر مبنی ہوتا ہے مذہبی اصولوں کی پابندی کرتے ہیں تو مذہب کا وقار بڑھتا ہے اور اس کا نور سماج کے بدترین افراد کے تاریک ترین دلوں اور ان کے سیاہ ترین گوشوں تک سرایت کرتا ہے مگر عمل کے بغیر عبادت مذہب کی اہمیت

---

[1] "حیات جاوید" دوسرا حصہ صفحہ ۴۹۴

[2] "مقالات حالی" حصہ اول " ۵۸، ۵۹

اور افادیت کو گھٹا دیتی ہے۔ حالی کی مذہبی سماجیات کا اصل اصول خدمت اور بھلائی قرار پاتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

"حقوق الٰہی مثلاً نماز، روزہ، حج، عمرہ، اور طواف سے مراد نہیں بلکہ حقوق عبادات سے زیادہ ضروری اور اہم ہیں۔" [۱]

"مکتوبات" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"فرائض کے بعد کوئی عبادت اور کوئی بھلائی اس کے برابر نہیں............... کہ اولاً اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ اور پھر تمام ابنائے جنس کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو سلوک اور بھلائی کی جائے۔" [۲]

اس سے ظاہر ہوا کہ حالی کے مذہبی تخیل کا رجحان افادیت پسندانہ ہے وہ اس مذہب و شریعت کے قابل ہیں جو عوام کی بھلائی اور سماج کی خوشحالی کی ذمہ دار ہے، اس لیے مولانا نہ تو اس حج کے قابل ہیں جو قرض کے روپے سے ادا کیا جاتا ہے [۳] اور نہ ایسی زیارتوں کے معتقد ہیں جو گھر اور محلے کے مصیبت زدہ افراد کو بھلا کر ادا کی جاتی ہیں۔

---

[۱] "مقالات حالی" حصہ اول صفحہ ۱۶۷

[۲] "مکتوبات حالی" حصہ دوم " ۵۲

[۳] "کلیات نظم حالی" حصہ اول " ۷

چنانچہ ایک جگہ وہ یہ کہتے ہیں۔

ہیں نمازیں اور روزے اور حج بیکار سب
سوزِ امت کی نہ چنگاری ہو گر دل میں نہاں[۱]

اور دوسری جگہ اپنے خیالات کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں۔

مقبول نہ حج ہیں، نہ نمازیں ہیں، نہ روزے
جب تک غمِ امت میں نہ جان اپنی گھلاؤ[۲]

....

اعضا تو نمازوں میں بہت تم نے دکھائے
دل کو کبھی ہاتھ سے کچھ دے کے دکھاؤ[۳]

....

پھولے ہوئے جو روزے نمازوں پہ ہیں اپنے
اسلام کی فریاد انھیں چل کے سناؤ
قبل اس کے کہ حج کا کریں کعبہ کا ارادہ
حج ہند میں جو ان پہ ہے فرض ان کو بتاؤ

اسی طرح حالی مذہب اور شریعت، قرآن اور حدیث کی ایسی تاویلیں کرتے ہیں جو معاشیات اور سماجیات جیسے افادی اصولوں کا پرچار

۱۔ "کلیاتِ نظمِ حالی" جلد دوم صفحہ ۱۱۳
۲۔ "جواہراتِ حالی" " ۸۷
۳۔ " " " ۸۹

کرنے والے عمرانی علوم کے ہم آہنگ و ہم رنگ ہیں۔ جب ہم اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ حالی کی نشو و نما اور ان کی تربیت آج سے سَو سوا سو سال پہلے کے فروعات پرست، اعتقادیں مبتلا، ظاہرہ مذہبیت میں آلودہ مسلمانی سماج میں ہوئی تھی لیکن اس کے باوجود محض چند شستہ شائستہ شخصیتوں فیض صحبت، تنقیدی کتابوں کے مطالعہ اور سب سے زیادہ نجی غور و فکر کے سہارے وہ ایسے مقام اور نکتے پر پہنچ گئے کہ حج اور کعبہ سے پہلے حج ہند میں اپنے فرائض ادا کرنے پر زور دیتے ہیں۔ جب مولانا نماز اور روزے سے زیادہ غم امت کو اہمیت دیتے ہیں تو لا محالہ ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ حالی نہ صرف اپنے زمانے بلکہ موجودہ بیچ ۲۰ ویں صدی کی تہذیب و تمدن سے آگے ہیں۔ اس میں شاید ہی شک کی گنجائش ہو کہ کھلم کھلا نماز در روزہ حج و زیارت کو قومی خدمت، سوز ملت اور غم امت سے وابستہ کر کے خدمت خلق اور بہتری امت کو عبادت پر ترجیح دینے والے روشن دماغ اور وسیع النظر مسلمان آج بھی نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں جو تقریر یا تحریر کے ذریعہ خوشحالی اور مرفہ حالی کی علمبرداری کرنے والے ایسے سدھار پسندانہ خیالات کا پرچار کرتے ہوں۔ مولانا نے "فلسفۂ ترقی" نامی نظم میں بار بار اس خیال کو ظاہر کیا ہے کہ دین، قرآن اور آنحضرت کی تعلیمات خیر خواہی کا سبق دیتی ہیں۔

دین کہتے ہو جسے وہ خیر خواہی کا ہے نام
اے مسلمانو، یہ ارشاد رسول انس و جاں

کھول کر دیکھو کتاب اللہ کی کہتی ہے کیا؟
"کلمہ پڑھ لینے سے کچھ حاصل نہیں بے امتحاں"
دین کا دعویٰ اور امت کی خبر لیتے نہیں
چاہتے ہو تم سند اور امتحاں دیتے نہیں

غرض حالی کے مذہبی شعور کی ابتدا، اگر کٹر ملائیت سے ہوئی تھی تو ان کی انتہا ایک آزاد مشرب، صلح کل، افادیت پسند، شریعت کی عقلمندانہ تاویل کرنے والے بزرگ کے مرتبے پر ہوئی اور اسی کو کہتے ہیں۔ خاتمہ بالخیر!

خواجہ مقبول احمد
ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی

حآلی کا نظریۂ تعلیم

جب حالی کا نام آتا ہے تو ماقبل و مابعد غدر کے واقعات، تحریک سرسید کے اثرات اور مغربیت کی تیز رو آندھی کا ذکر اس طرح چھیڑ دیا جاتا ہے گویا حآلی کے سارے کارنامے صرف تاثر پذیری سے عبارت تھے ماحول سے کوئی بے نیاز نہیں رہ سکتا لیکن ماحول کو سب کچھ سمجھ لینا بھی درست نہیں۔ ماحول اور ذہن کے تصادم میں کبھی ایک کی فتح ہوتی ہے کبھی دوسرے کی اور کبھی دونوں کے امتزاج سے ایک ترکیبی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یہ ترکیب مختلف ذہنوں میں مختلف تناسب سے ملتی ہے اور تناسب کے اسی اختلاف سے انفرادیت کی شان پیدا ہوتی ہے۔ سرسید کی قیادت اور رہنمائی سے کسے انکار ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کی دیو پیکر شخصیت کے سامنے معاصرین کی امتیازی کیفیت اجاگر نہیں ہو پاتی ورنہ ان میں سے ہر ایک باشعور، صاحب بصیرت اور صاحب کمال تھا۔ حآلی صرف سرسید کے ہمنوا اور ہم قدم نہ تھے ان کے حلقۂ احباب میں حآلی کا ایک

خاص مقام تھا۔ ۱۹۸۱ء میں علی گڈھ کے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے سر سید نے ان کے متعلق کہا تھا:۔

"ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور فخر کرنا چاہیئے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا۔ آئندہ زمانہ میں جب کہا جاوے گا کہ فخر قوم، فخر شعرا، فخر علما اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور ان سے نجات دلانے والا قوم کا کون ہے تو کہا جاوے گا کہ حالی ہے"۔ [1]

اور سر سید کی پیشین گوئی غلط نہ تھی ۱۹۴۶ء میں "یوم حالی" کی صدارت کرتے ہوئے آل احمد سرور نے کہا کہ:۔

"حالی محض ایک شاعر اور ادیب ہی نہیں ایک بہت بڑے ذہنی معمار بھی تھے"۔ [2]

پچپن ۵۵ سال کا وقفہ کسی شخص کی عظمت متعین کرنے کے لئے کم نہیں ہوتا۔ حالی کی ذہنی معماری ذرا دیر میں سمجھ میں آنے والی چیز تھی۔ ان کا فطری انکسار ان کی نام و نمود سے فراریت، ان کی کم آمیزی راہ میں حائل رہی لیکن حقیقت کو ماننے کی ضرورت نہیں ہوتی وہ خود کو کبھی نہ کبھی منوا ہی لیتی ہے حالی نے تخریب بھی کی اور تعمیر بھی۔ پرانے شعرا اور پرانی شاعری پر نشتر زنی بھی کی اور مداوا بھی تلاش کیا۔ معمار کو تعمیر سے پہلے تخریب کرنی ہی پڑتی ہے

---

[1] یادگار حالی صہ ۱۰۳

[2] تنقید کیا ہے صہ ۱۷

اگر ان کے مقدمہ کے خلاف ہنگامہ برپا ہوا۔ ان کی شاعری کو ابتدائ ایک مخصوص حلقہ میں پوچ اور لچر سمجھا گیا تو یہ کم نظری اور کوتاہ بینی تھی۔

بہر حال آج حالی کی شاعرانہ اور نقادانہ عظمت تسلیم کی جا چکی ہے۔ سیکڑوں اعتراضوں کے باوجود تذکروں کی روش سے گلو خلاصی اور نئی سوانح نگاری کی نشان دہی میں ان کی اولیت مسلم ہے۔ یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ سرسید کے کارآمد انداز بیان میں اسٹائل کی شان انھیں کے دم سے پیدا ہوئی اسی صحافتی طرز کو ادبیت انھوں نے بخشی لیکن ابھی منزل ختم نہیں ہوتی حالی کی بساط اتنی محدود نہیں کچھ اور گوشے بھی ہیں جن پہ نگاہ پڑتی ہے تو کہنا پڑتا ہے "کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست" مثلاً ایک گوشہ ہے حالی کی اہمیت بحیثیت ماہر تعلیم۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد سے لوٹتے وقت انھیں جو سپاس نامہ اہل شہر نے دیا تھا وہ صالحہ عابد حسین کے پاس محفوظ ہے۔ یادگار حالی میں اس کا جو اقتباس دیا گیا ہے اس میں یہ الفاظ قابل غور ہیں:۔

> "آپ کے احسانات ہمارے ملک اور قوم پر ایسے نہیں کہ وہ ہمارے شکریہ کے محتاج ہوں بلکہ وہ ہم پر ایسے چھائے ہوئے ہیں کہ انکے شکریہ سے عہدہ برآ ہونا ہماری طاقت سے باہر ہے ...... اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ سرسید کے مشن کو آپ سے زیادہ کسی سے مدد نہیں ملی۔"

سرسید کا مشن کیا تھا یہ سمجھنا مشکل نہیں۔ سرسید نے اپنے مشن کا آغاز اصلاح تہذیب و تمدن سے کیا تھا اس سلسلہ میں تہذیب الاخلاق کے ایک مضمون میں انھوں نے جو نو اہم عنوانات قائم کئے تھے[1] اُن میں سے تین کسی نہ کسی طرح تعلیم اور سامان تعلیم سے متعلق ہیں۔ پھر انھوں نے اپنی مجبوریوں کے ماتحت کام کو سمیٹ کر صرف تعلیم تک محدود کر لیا اور سارا زور اسی پر صرف کرنے لگے۔

حالی کسی کو رسوا کرنے کے قائل نہ تھے اور تنقید کرتے وقت شرافت سے کام لیتے تھے اس لئے سرسید کے متعلق ان کی تحریروں کو "مدلل مداحی" قرار دے دیا گیا۔ لیکن یہ کہنا زیادتی ہے کہ وہ بے جا مروت سے کام لیتے تھے سرسید سے ان کی ذہنی ہم آہنگی اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ ان کے قریب بھی نہ آئے تھے۔ ۱۸۷۱ء کے "علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" میں ان کا ایک مضمون "سید احمد خاں اور ان کے کام" ملتا ہے جس میں ان کے مشن سے دلچسپی کا اظہار پہلی بار کیا گیا تھا۔ وہ اس زمانہ سے سرسید کے مشن میں ہاتھ بٹاتے رہے جب وہ اصلاحی مشن تھا اور صرف تعلیم تک محدود نہ ہوا تھا اور پھر اس کے تعلیمی دور میں بھی ان کے معاون و مددگار رہے۔ بعضوں کا یہ خیال ہے کہ حالی نے سرسید کی اتنی تعریف اس لئے کی ہے کہ وہ ان کے مجاہدانہ اور عملی انداز سے مرعوب تھے کیونکہ وہ خود عملی آدمی نہ تھے۔ یہ خیال گمراہیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ حالی علم و ادب سے وابستہ ہونے کے باوجود عملی میدان سے گریزاں نہ تھے۔ انھوں نے ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی

---

[1] علیگڈھ میگزین علی گڈھ نمبر ۵۵ء "سید کا خواب اور اس کی تعبیر" عابد حسین۔

مدرستہ العلوم کے لئے سر سید کے ساتھ سرگرم سفر رہے، ان کی نظموں نے چندے کی فراہمی کے لئے بڑی خوشگوار فضا پیدا کر دی تھی۔ یہ سب انھوں نے اس لئے نہیں کیا کہ وہ سر سید سے مرعوب تھے بلکہ اس لئے کہ وہ ان کے مقصد سے اتفاق کرتے تھے لیکن جہاں جہاں طرز عمل میں خامیاں نظر آئیں اس پر بے باکی سے تنقید کرنے میں بھی نہ ہچکچائے۔ بلکہ اکثر ان کی راہ سے ہٹ کر اپنی ڈگر الگ بھی نکال لی۔

حالی کی تحریر و تقریر میں قدم قدم پہ سر سید کے اصول تعلیم تنقید ملتی ہے سر سید ابتدا سے ہی ورنیکولر تعلیم کے خلاف تھے۔ مراد آباد سے انھوں نے ورنیکولر کے خلاف گورنمنٹ پر اپنی رائے ظاہر کی تھی۔ درمیان میں کسی طرح ان کی رائے میں تبدیلی آگئی۔ اب وہ ایک ورنیکولر یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے اور دیسی زبان کے ذریعہ علوم و فنون کی تعلیم دینے کی طرف رجوع تھے غالباً مسلمانوں کی انگریزی سے گریزاں ہونے کی روش نے انھیں اس پر مجبور کیا تھا چنانچہ اسی مقصد کے تحت انھوں نے ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی لیکن آگے چل کر وہ انگریزی کو میڈیم بنانے کی طرف پھر مائل ہو گئے اور بڑے زور شور سے اس کی افادیت کی تبلیغ کرنے لگے۔ حالی اس رویہ پر تنقید کرتے ہوئے "حیات جاوید" میں لکھتے ہیں:

"مگر ۳۶ برس کے تجربہ سے ان کو اس قدر معلوم ضرور معلوم ہوا ہوگا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی فضول اور اصلی لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔"

سر سید کو کوتاہ بین عوام اور رجعت پسند علماء سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ وخصوصاً علماء کی ذہنیت سے بُری طرح مایوس تھے۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء میں ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس میں جب انھیں مدعو کیا گیا تو انھوں نے رسمی طور پر تحریک کو دعا دی لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ مجھے پُرانے طرز کے علماء سے اس کی ذرہ برابر امید نہیں کہ وہ کوئی کامیاب تحریک چلا سکیں گے۔ اس قول میں ایک تجربہ کار مرد کہن سال کی بصیرت پنہاں تھی۔ حالی کی ایک ابتدائی تصنیف کا بھی ایک رجعت پسند استاد کے ہاتھوں خون ہو چکا تھا لیکن وہ اتنی آسانی سے مایوس ہونیوالوں میں نہ تھے۔ انھوں نے تحریک کو لبیک کہا اور علالت کے سبب شریک تو نہ ہو سکے لیکن تقریر لکھ کر بھیج دی جس میں طبقہ علماء کی اصلاح کے علاوہ طرز تعلیم کے متعلق مفید اصلاحیں بھی پیش کیں۔ اگر ان اصولوں پر عمل کیا گیا ہوتا تو ہمارے علماء آج ذلیل و خوار نظر نہ آتے۔ وہ خود کو حقائق اور حالات حاضرہ سے آنکھیں چار کرنے اور ان پر حکمرانی کرنے کا اہل ثابت کر سکتے تھے۔ ہمارے قدیم طرز کے مدرسوں میں مبلغ علم صرف کتابی تعلیم تک محدود ہوتا ہے۔ طلباء میں عربی و فارسی بولنے اور لکھنے کا ملکہ پیدا نہیں ہوتا اس لئے وہ جس علم کے ماہر سمجھے جاتے ہیں اس میں انھیں ہرگز ہرگز دستگاہ نہیں ہو پاتی۔ حالی نے بتایا کہ:

"سب سے بڑا قصور ہمارے طریقہ درس و تدریس میں یہ ہے کہ صرف و نحو کے ساتھ عربی زبان کے بولنے اور لکھنے کی مشق نہیں کرائی جاتی . . . . . . ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر فارغ التحصیل طلباء جو معقول اور منقول کی اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کی درسی کتابیں

نہایت عمدگی سے پڑھا سکتے ہیں وہ عربی زبان کے بولنے اور عربی عبارت کے انشا کرنے سے بالکل عاجز ہوتے ہیں۔۔۔۔

۔۔۔۔ پس میرے نزدیک ایک یہ ضروری بات ہے کہ چھوٹے چھوٹے رسالے عربی جملوں اور فقروں کے عرب عرباء کے کلام سے انتخاب کر کے بنائے جائیں جو ابتدائے تعلیم سے صرف و نحو کے ساتھ پڑھائے جایا کریں اور عربی بولنے اور لکھنے کی مشق اوّل ہی سے کرائی جائے۔۔۔۔۔ اور جب تک کتب درسیہ کا سلسلہ ختم نہ ہو ہر درجے میں اس درجے کی حیثیت کے موافق ادب کی کتابوں کا برابر درس جاری ہے۔۔۔۔۔"

مدرسہ کے لوگ عربی پڑھ کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ فارسی اور اردو کے بھی ماہر ہو گئے اس لئے دوسری زبانوں میں عربی کے مطالب بخوبی بیان نہیں کر سکتے حالی فرماتے ہیں:۔

"دوسری بات جس سے اسلامی مدرسوں میں اب تک تعلیم کے متعلق غفلت کی گئی ہے یہ ہے کہ فارسی یا اردو کو سہل یا ذلیل سمجھ کر ان کی طرف مطلق اعتنا نہیں کیا گیا۔۔۔۔ ۔۔۔۔ یہ خیال کرنا کہ عربی زبان سیکھنے سے فارسی اور اردو دونوں پر قدرت ہو جاتی ہے صحیح نہیں۔"

انھوں نے علماء کو تاریخ اور جغرافیہ کی طرف رجوع کیا کیونکہ یہی وہ علوم تھے جن میں ابتداءً مسلمانوں نے دستگاہ حاصل کی تھی اور دوسری قوموں کے لئے

راہبر ثابت ہوئے تھے۔ تاریخ میں ابن خلدون کی اہمیت کا مغرب بھی معترف ہے[1]۔ حالی کے مشورہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن و حدیث کا مفہوم سمجھنے کیلئے بھی تاریخ اور جغرافیہ کی معلومات لازمی ہے اور بہت سے ایسے مقامات ہیں جن کا مطلب ذہن نشین کرانے کے لئے ان علوم کی مدد کے بغیر چارہ نہیں:-

"ہمارے علم ادب میں، حدیث میں قرآن میں ہزاروں نام امصار وقریٰ و اماکن و مواضع کے آتے ہیں مگر طالب علموں کو سوا اس کے کہ کسی شہر یا مقام کا نام ہے ان کی نسبت اور کچھ نہیں بتایا جاتا۔ حالانکہ بہت سے مقامات احادیث وغیرہ میں ایسے آجاتے ہیں کہ جبتک ان کا محل اور موقع اور مفصل حال معلوم نہ ہو عبارت کا مطلب ہرگز ذہن نشین نہیں ہوسکتا بہت سے مقامات قرآن، انجیل، اور توریت میں ایسے ہیں کہ جب تک ان کا موقع اور محل معین نہ کیا جائے تب تک مخالفین اسلام کے مقابلے میں اسلام کی تائید نہیں کی جاسکتی"

[1] J. TOYNBEE اپنی کتاب A STUDY OF HISTORY VOL. III میں ابن خلدون کی تصنیف کے متعلق لکھتا ہے

A PIECE OF LITRATURE WHICH CAN BEAR COMPARISON WITH THE WORK OF THUCYDIDES OR TH WORK OF A MACHIAVELLI FOR BOTH BREADTH AND PROFOUNDITY OF VISION AS WELL AS FOR SHEER INTELLECTUAL

ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالی کے دکھائے ہوئے راستہ پر آگے چل کر سلیمان ندوی نے ارض القرآن لکھی اور ابوالکلام آزاد نے اسی اصول کو مد نظر رکھکر ترجمان القرآن میں مختلف مقامات اور ناموں کے تعین کے سلسلہ میں اپنا کارنامہ پیش کیا ہے خصوصاً سکندر ذوالقرنین کے متعلق تفسیر لکھنے میں انھوں نے جدید ترین Archealogical research کی مدد سے حقیقت کا انکشاف کیا ہے ورنہ امام رازی نے بھی اسے سکندر یونانی سمجھ رکھا تھا۔

مولانا حالی ریاضی کو سلسلہ درس میں داخل کرانا چاہتے تھے۔ اس کی اہمیت پر انھوں نے بہت زور دیا ہے اور خوش اسلوبی سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ علم مسلمانوں کے لیے اجنبی اور نامانوس نہ تھا نیز اس کے شامل ہونے سے مذہب کو خطرہ پہنچنے کا امکان نہیں فرماتے ہیں:

لہ میرے نزدیک اس میں ذرا بھی حیرت کا مقام نہیں یہ موج کوثر" مصنفہ محمد اکرام اور آزاد کی کہانی خود انکی زبانی مرتبہ عبدالرزاق ملیح آبادی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی زمانہ میں ایک وقت ان پر ایسا بھی گذرا تھا جب وہ سرسید کے پرستاروں میں تھے سرسید اور حالی کا لٹریچر بے تابی اور شوق سے مطالعہ کیا کرتے تھے۔ الہلال کے صفحے شاہد ہیں کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی تقریروں پر خاص توجہ ہوتی اور محسن الملک کا جواب ایک مرتبہ اسی کانفرنس کی پچھلی تقریر کے حوالہ سے دیا تھا پھر اگرچہ اس تقریر کے سلسلہ میں ان کی سوانح حیات میں واضح حوالہ نہیں لیکن یہ سمجھنا کیوں غلط فہمی پر مبنی ہو کہ انھوں نے ندوۃ العلماء متعلق حالی کی یہ تقریریں دیکھی ہونگی اور اس سے فائدہ اٹھایا ہوگا جب کہ ان کے کثرت مطالعہ سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

جبر و مقابلہ کو مسلمانوں کے ساتھ وہ خصوصیت ہے کہ بعضوں نے اسکو خاص مسلمانوں ہی کی ایجاد قرار دیا ہے ہندسہ جو آج تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے وہ بالاتفاق تحریر اقلیدس کے اس ترجمہ کی بدولت پھیلا ہے جو محقق طوسی نے عربی زبان میں کیا تھا۔ اقلیدس کی یونانی تحریر دنیا سے مفقود ہو گئی تھی..... ہیئت میں مسلمانوں کی ترقی کو تمام یورپ نے تسلیم کیا ہے چنانچہ ستاروں کے بے شمار عربی نام آج تک یورپ کی زبانوں میں موجود ہیں علم مناظر اور درایا میں جو نہایت مہتم بالشان مسئلے مسلمانوں نے حل کئے تھے ان میں سے ایک وہ تھا جس کی بنیاد پر زمانہ حال میں عکس تصویر کا حیرت انگیز فن ایجاد ہوا جر ثقیل میں جو آج کل بے انتہا ترقی ہوئی ہے اس کے بڑے بڑے اصول مسلمانوں ہی کے قائم کئے ہوئے ہیں .... باوجود اسکے ہم نے ریاضی سے مطلق سروکار نہیں رکھا یہانتک کہ ریاضی سے مسلمانوں کی نامناسبت اس زمانے میں ضرب المثل ہو گئی ::

وہ کہتے ہیں:

"ہیئت جدیدہ کو یہ سمجھکر کہ وہ نصوص قرآنی کے خلاف ہے ترک کرنا اور اس سے دین میں فتنہ پیدا ہونے کا اندیشہ کرنا گویا اس بات کا تسلیم کر لینا ہے کہ دین اسلام اس کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتا جو لوگ دین اسلام کو دین برحق اور

خدا کا بھیجا ہوا دین سمجھتے ہیں ان کا یہ اعتقاد ہونا چاہئے کہ اگر ہیئت جدید سچی ہے تو یقیناً وہ اصول اسلام کے خلاف نہیں ہو سکتی اور اگر وہ اسلام کے خلاف ہے تو یقیناً جھوٹی ہے اور ہم ضرور اس کی غلطی اور جھوٹ ثابت کر سکیں گے۔

حیات جاوید میں سر سید کی تعلیم نسواں کی طرف سے بے اعتنائی پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ سر سید نئی تعلیم کو عورتوں کے حق میں سم قاتل سمجھتے تھے چنانچہ ۱۸۸۸ء میں گرداس پور خاتونان پنجاب کے ایڈریس کے جواب میں انھوں نے جو تقریر لکھ کر بھیجی تھی اس میں کہتے ہیں:۔

"میری یہ خواہش نہیں کہ تم ان مقدس کتابوں کے بدلے جو تمھاری دادیاں نانیاں پڑھتی آئی ہیں اس زمانہ کی مروجہ نامبارک کتابوں کا پڑھنا اختیار کرو جو اس زمانہ میں پھیلتی جاتی ہیں مردوں کو جو تمھارے لئے روٹی کما کر لانے والے ہیں زمانہ کی ضرورت کے مناسب کچھ ہی علم یا کوئی سی زبان سیکھنے اور کیسی ہی نئی چال چلنے کی ضرورت پیش آتی ہو مگر ان تبدیلیوں سے جو ضرورت تعلیم کے متعلق تم کو پہلے تھی اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہوئی ......

...... تمھارا فرض تھا کہ تم اپنے ایمان اور اسلام سے واقف ہو

.... گھر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں رکھو۔ اپنے گھر کی مالک رہو اس پرمثل شہزادی کے حکومت کرو اور مثل ایک لائق وزیرزادی کے منتظم رہو اپنی اولاد کی پرورش کرو۔"[1]

---

[1] حیات جاوید صفحہ ۱۲۰-۶۹۱

آگے چل کر انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر لڑکوں کو اچھی طرح تعلیم دیدی جائے تو وہ خود بخود حقوق نسواں کا احساس کر کے اس کی طرف توجہ کریں گے اور ان کو پستی سے اوپر اٹھالیں گے۔ حالیؔ ان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انھوں نے جو صرف لڑکوں کے تعلیم یافتہ ہو جانے سے یہ امید ظاہر کی ہے کہ اس سے عورتوں کے مغصوبہ حقوق بن مانگے از خود واپس مل جائیں گے ان کی یہ امید پوری ہوتی نظر آتی ہے یا نہیں؟"

پھر آگے چل کر بڑے پتے کی بات کہتے ہیں:

"اگرچہ ابھی تک سوسائٹی کے دباؤ نے بہت کچھ انکے لڑکوں کے جذبات کو دبا رکھا ہے لیکن آخرکار ایک طرف کی تعلیم اور دوسری طرف کی جہالت قوم کے حق میں یقیناً برے نتائج پیدا کر دے گی۔"

ان کا مفہوم یہ ہے کہ مغربی تعلیم کے اثر سے لڑکے تو اپنی ذہنی ہم آہنگی کے لئے یوروپین لیڈیز کی طرف متوجہ ہو جائیں گے ان کو اپنے یہاں کی جاہل اور دقیانوسی لڑکیوں سے نفرت ہو جائے گی اس لئے لازم ہے کہ دونوں کی ترقی کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کی جائے۔ حالیؔ نے صرف رائے زنی پر اکتفا نہ کی بلکہ عملی کوشش بھی کی۔ انھوں نے اپنے خاندان کے مرد اور بڑی بڑھیوں کو سمجھا بجھا کر لڑکیوں کی تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ اس زمانے میں پرانی عورتیں بچیوں کو لکھنا سکھانے کی سخت مخالف ہوتی تھیں اور رواج قدیم سے سر مو

تجاوز نہ کرنا چاہتی تھیں۔ ۱۸۹۴ء میں انھوں نے پانی پت میں لڑکیوں کے لئے درجہ چار تک کا ایک اسکول بھی کھولا تھا لیکن مناسب اُستانیوں کی کمیابی کے سبب چند سال سے زیادہ نہ چل سکا

حالی کی ذہنی ترقی پسندی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم اقبال اور جوش کے یہاں بھی عورتوں کی تعلیم سے بے پروائی کا احساس کرتے ہیں اقبال کو جس عورت پر فخر ہے وہ "مکالمات فلاطون" لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ — اسی کے سوز سے ہے زندگی کا ساز دروں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلہ سے ٹوٹا شرار افلاطوں

وہ عورت کی تعلیمی محرومی بلکہ کسی بھی مظلومی کا حل تلاش کرنے کی زحمت نہیں کرتے:

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت — نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

وہ عورتوں کی اصلاح اور سربلندی کو مردوں کی مرضی پر چھوڑ دیتے ہیں:

نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی — نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

ظاہر ہے یہ مسئلہ اگر مرد کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو وہ اُسے زمرد کے گلوبند سے ہی بہلانا چاہے گا۔ بہرحال انھیں کم و بیش سرسید کا ہم نوا سمجھنا چاہئے اور جوش نے تو کمال ہی کر دیا ساری بغاوت اور انقلاب آفرینی کے باوجود عورت کے معاملہ میں ان کا نقطۂ نظر خالص جاگیردارانہ ہے وہ عورت کو اس لئے تعلیم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے حقوق کی دعوے دار بن جائے گی۔ فرماتے ہیں:

علم اُٹھا لیتا ہے بزم جاں سے شمع اعتقاد
خال و خد کی موت ہے چہرے کی شان اجتہاد
علم سے بڑھتی ہے عقل اور عقل ہے ڈبہ داغ
جو بجھا دیتی ہے سینے میں محبت کا چراغ
اک جنوں پرور بگولا ہے وہ علم بے وثوق
جس کی رو میں کانپنے لگتے ہیں شوہر کے حقوق

وہ عورتوں کو یہ کہہ کر بہلائے رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ مردوں کے لئے صرف سامان عیش بنی رہیں :-

چاندنی قوس قزح عورت شگوفہ لالہ زار
علم کا ان نرم شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار
روشنائی میں کہیں گھلتی ہے موج ماہتاب
کیا کوئی اوراق گل پر طبع کرتا ہے کتاب

حالی سر سید کی تحریک تعلیم کے مداح تھے کیونکہ وہ نئی تعلیم کی افادیت کے قائل تھے۔ سر سید ترقی کی دوڑ میں مسلمانوں کو سب سے آگے دیکھنا چاہتے تھے ان کی خواہش تھی کہ مسلمان ہر شعبۂ حیات میں کامیاب و کامران نظر آئیں انھوں نے تعلیم سے متعلق جو مطمع نظر پیش کر کے اپنے رفقا کا تعاون حاصل کیا تھا وہ مختصراً یہ تھا کہ علی گڈھ کالج سے ایسے تعلیم یافتہ نوجوان پیدا ہوں

(ا) - جو انگریزی کے ذریعہ تعلیم حاصل کر کے سرکاری عہدے اور عزت پائیں
(ب) - جو انگریزی کے ذریعہ تعلیم حاصل کر کے مغربی علوم کو اردو میں منتقل کریں۔
(ج) - جو اردو میں تعلیم پاکر "لیاقت کامل" حاصل کریں جس کا معیار انگلستان کے کالجوں کے برابر ہو تاکہ ان کو ہر وقت اور محل پر اپنے علم کی ترقی کا موقع ہو"
(د) - جو عربی فارسی میں کمال حاصل کریں تاکہ مسلمانوں کے قدیم مذہبی اور تہذیبی سرمائے کو موجودہ نسلوں تک پہنچا سکیں۔

لیکن کالجوں کی نشو و نما ترقی اور چندہ کی فراہمی کے سلسلے میں آگے چل کر انھیں ایسے عناصر سے ساز باز کرنا پڑا جو صرف (۲) قسم کی تعلیم کی اہمیت سمجھتا تھا۔ رفتہ رفتہ ٹرسٹی بورڈ میں انھیں عناصر کی کثرت ہوگئی اور کالج میں تعلیم کا مطمع نظر صرف سرکاری نوکریاں حاصل کرنے تک محدود ہوگیا۔ حالی ایسے موقع پر خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔ انھوں نے کالج کے طلبا کو مخاطب کرکے ایک تقریر میں صاف صاف کہا:۔

> "اے میرے عزیزو اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ ہماری قوم میں تعلیم کا خیال روز بروز زیادہ ہوتا جاتا ہے.... مگر میری رائے جس کو شاید تم بھی تسلیم کروگے اب تک اس باب میں یہ ہے کہ مسلمانوں نے ابھی تعلیم کو بطوع و رغبت قبول نہیں کیا...... صاف پایا جاتا ہے کہ جن کو معاش کا کچھ سہارا نہیں ہے یا جو اپنے بعد اولاد کے لئے کوئی جائداد یا آمدنی چھوڑنے والے نہیں ہیں وہ انگریزی تعلیم کو محض ایک ذریعہ معاش یا نوکری کا سمجھ کر اولاد کو بہ کراہت و مجبوری تعلیم دلواتے ہیں۔" (مقالات حالی حصہ دوم ص۳۲)

کالج اب ایک خاص قسم کے گریجویٹ ڈھالنے کا ادارہ بن چکا تھا جس میں سرکاری عہدوں کے لئے مفید ثابت ہونے والے طالب علم ڈھالے جاتے ہیں۔ علوم و فنون میں مہارت، بنیادی اور ابدی قدروں کی واقفیت سے زیادہ وضع و لباس، اخلاق و آداب، کھیل کود اور ورزش پر زور دیا جاتا تھا

جن کے ذریعہ انگریز حاکموں کی خوشنودی ممکن تھی۔ لیکن تمام گریجویٹوں کو نوکری دنیا بھی سرکار کے بس کی بات نہ تھی اسے تو اپنے ہم قوموں کا بوجھ بھی ہندوستان پر ہی لادنا تھا۔ ایسی حالت میں نئی تعلیم نے بے روزگاری کا مشکل مسئلہ کھڑا کر دیا۔ حالیؔ مسائل سے آنکھیں نہیں چراتے وہ ان کے اسباب و علل پر نظر ڈالتے ہیں اور سنجیدگی کے ساتھ ان کے حل تلاش کرتے ہیں:۔

"مگر اے میرے عزیزو...... تمہارے آباو اجداد نے وہ زمانہ دیکھا تھا جب مسلمانوں کی سلطنت قائم تھی اور شاہی ملازمت میں سب سے زیادہ مسلمانوں کا حصہ تھا اور تمام فوجی اور ملکی خدمات کا دروازہ ان کے لئے کھلا ہوا تھا...... اب وہ شاہی ملازمت جس میں مسلمانوں کا سب سے زیادہ حصہ تھا اس کے مستحق ان انگلستان کے چار کروڑ باشندے اور ان کے بعد ہندوستان کے پچیس کروڑ باشندے ہیں۔ اب کسی طرح ممکن نہیں کہ چھ کروڑ مسلمان جو ہندوستان میں آباد ہیں وہ اب بھی اپنے آباؤ اجداد کی طرح معاش کو نوکری میں منحصر سمجھیں...... گورنمنٹ میں نہ یہ طاقت ہے کہ وہ ہندوستان کی تمام رعایا پر ترجیح دے کر کل خدمات و مناصب انھیں کے حوالے کر دے" ص۱۸۲،۱۸۳

وہ مشورہ دیتے ہیں کہ:

"آپ میں سے ہر شخص کو تعلیم ختم کرنے سے پہلے اس بات کا فیصلہ کر لینا ضرور ہے کہ ہم تعلیم ختم کرنے کے بعد فلاں پیشہ اختیار

کریں گے یا فلاں ذریعہ سے معاش بہم پہنچائیں گے تاکہ ابھی سے
آہستہ آہستہ اس پیشہ کے لئے تیار ہونے اور اس کی لیاقت
بہم پہنچانے کا موقعہ ملے اور مدرسہ چھوڑنے کے بعد اندھادھند
دائیں بائیں ہاتھ مارنے کی ضرورت نہ پڑے۔" (صد ۳۰)

سرسید خالص اعلیٰ تعلیم کے مبلّغ تھے چنانچہ انھوں نے پیشہ ورانہ تعلیم کی سختی سے مخالفت کی دیسی زبان میں تعلیم دینے کی طرح پیشہ ورانہ تعلیم کے متعلق بھی انکا یہ خیال تھا کہ سرکار یہ طریقہ رائج کر کے ہندوستانیوں کو اعلیٰ تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے چنانچہ انھوں نے خالص اعلیٰ تعلیم کے لئے پرزور دلیلیں پیش کیں لیکن اس نظریہ سے بے روزگاری کے بڑھتے ہوئے مسائل کے لئے مزید الجھنیں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا چنانچہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کی صدارت کرتے ہوئے حالی نے ان کی مخالفت کی:

"سرسید مرحوم جنھوں نے مسلمانوں میں تعلیم کی بنیاد ڈالی ہے ابتدا سے ان کا خیال مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نسبت یہ تھا کہ جب وہ تعلیم پاکر کالجوں سے نکلیں گے تو ان میں ایسا ملکہ پیدا ہو جائے گا کہ جو ذریعہ معاش وہ اپنی طبیعت کے مناسب اور اپنی حالت کے موافق دیکھیں گے اس کو خود اختیار کر لیں گے کیونکہ تعلیم ان کی خود رہنمائی کرے گی اور ان کو اس رستے پر ڈال دے گی جس کی قابلیت ان کی فطرت میں موجود ہوگی۔ . . . . . . لیکن ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں جہاں تک

دیکھا جاتا ہے اب تک اس خیال کا ظہور نہیں ہوا اور جو امیدیں
ان سے کی گئی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں۔"

آگے چل کر وہ سرسید کا قول نقل کر کے کہتے ہیں "جب تالاب بھر جائے گا تو اپنی نکاس کا راستہ آپ نکال لے گا" لیکن جس رفتار سے مسلمانوں کی تعلیم چل رہی ہے اس رفتار سے تالاب بھرنے میں بہت دیر معلوم ہوتی ہے مگر راستہ نکالنے کی ضرورت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔

حالی خیالی دنیا کے باشندے نہ تھے، مجرد علم کے خوگر نہ تھے، وہ ہر چیز کو افادیت کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے مضمون "دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے" میں عمل کی اہمیت پر زور دیا ہے اور علم کے سلسلہ میں اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:

"جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ علم ہے جو ہماری ساکن و پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ و شاداب کرے نہ کہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قوئی کو بھی ساکن اور پژمردہ کر دے"

وہ علم و عمل کو ہم آہنگ دیکھنا چاہتے تھے۔ اپنی نظموں میں بھی انھوں نے اس پر زور دیا ہے:

گیا دورِ حکومت کا بس اب حکمت کی ہے باری
جہاں میں چار سو علم و عمل کی ہے عملداری
گئے وہ دن کہ تھا علم و ہنر انسان کا زیور
ہوئی ہے زندگی اب منحصر خود علم و دانش پر

اجلاس کراچی کی صدارتی تقریر میں فرماتے ہیں:

"ممکن نہیں کہ ہر تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان کے لئے حسب دلخواہ سرکاری ملازمت مل سکے البتہ صنعت وحرفت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ جس قدر تعلیم یافتہ لوگ بڑھتے جائیں گے اسی قدر ان کی مانگ زیادہ ہوتی جائے گی۔"[1]

آگے چل کر کہتے ہیں:

"جس طرح صنعت وحرفت کی تعلیم کا قوم میں پھیلنا ضروری ہے اسی قدر بلکہ اس سے بہت زیادہ ہمارے نوجوانوں کے لئے نئے طریقۂ زراعت کی تعلیم دلانی ضروری ہے خصوصاً ایسے صوبہ میں جیسا کہ سندھ ہے اور جہاں اسی فی صدی کے قریب مسلمان کاشتکار اور زمیندار ہیں ....."[2]

مغرب زدگی اور مغربی تعلیم کے تاریک پہلو پر اکبرؔ اور اقبالؔ نے خوب خوب نشتر زنی کی ہے حالیؔ مغرب پرستی یا مغرب پسندی کے مجرم ٹھہرائے جاتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے انھوں نے اگر پیروی مغربی کی تلقین کی، مغربی تعلیم کی ترویج میں تحریر و تقریر، زبان و عمل سے مدد کی تو اس کے مضر پہلوؤں اس کی بے اعتدالیوں پر سختی سے تنقید بھی کی ہے۔ مغرب کی سستی نقالی سے ابدی قدروں کو اپنانے کی جگہ ظاہری پہلو سے متاثر ہونے سے نوجوانوں میں خود پسندی کی جو روش پیدا ہو رہی تھی، وطن اور

---

[1] مقالات حالی حصہ دوم ص۹۰ [2] مقالات حالی حصہ دوم ص۹۱

اہل وطن سے جو نفرت پیدا ہو رہی تھی اس کے خلاف انھوں نے صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ اپنے مضمون "ہم جیتے ہیں یا مر گئے" میں فرماتے ہیں:

"ہماری قوم میں انگریزی تعلیم جو پریکٹیکل آدمی پیدا کرنے کا دعویٰ کرتی ہے چشم بددور روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور تعلیمیافتہ اصحاب کی تعداد میں ہر سال معقول اضافہ ہوتا رہتا ہے مگر افسوس ہے کہ مستثنیٰ صورتوں کے سوا عملی قوت اور سیلف ہلپ (اپنی مدد آپ کرنا) کا مادہ ان میں تعلیم کے بعد اتنا بھی باقی نہیں رہتا جتنا کہ مدرسہ میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔"

حالی تعلیم یافتہ نوجوانوں سے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ وہ ملک و قوم کی خدمت میں پیش پیش نظر آئیں گے۔ تعلیم ان میں انسانی ہمدردی کے جوہر پیدا کرے گی لیکن جب مغرب زدہ گریجویٹ سمندر پار کی بستی کو جنت سمجھنے لگا، اپنا دیس اور اپنے لوگ اس کی نظروں میں ہیچ ہو گئے تو انھیں سخت چوٹ لگی اور وہ اس کی مذمت پر مجبور ہوئے۔ فرماتے ہیں:

"ہمارے بہت سے نوجوان ولایت سے تعلیم پا کر آتے ہیں اور اس پارس پتھری کو چھو آئے ہیں جو مس کو طلا کر دیتی ہے وہ اپنی عمر کا ایک عمدہ حصہ اس قوم میں بسر کر آئے ہیں جو حب الوطن اور قومی ہمدردی کو اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر جب مع الخیر ہندوستان پہنچتے ہیں تو ۔ ۔ ۔ قوم سے

ان کو نفرت ہو جاتی ہے۔ . . . . . ہندوستانی سوسائٹی میں شریک ہونے سے ان کو شرم آنے لگتی ہے . . . . . جس حقارت سے کہ انگریز ہندوستانیوں کو دیکھتے ہیں وہ ان سے کہیں زیادہ حقارت کی نگاہ سے اپنے ہموطنوں کو دیکھنے لگتے ہیں "

حالی نے قوم کو پروان چڑھانے کی کوشش کی تھی۔ ابھرتے ہوئے نوجوانوں کی ملک و قوم سے یہ بے اعتنائی دیکھ کر ان کی تلخ گوئی بے سبب نہ تھی۔ یہ نوجوان رفاہ عام کی طرف تو کیا راغب ہوتے دوسروں کی اصلاحی کوششوں کو بھی بے سود جانتے تھے اور ہندستانیوں کی حالت کو ناقابل اصلاح سمجھتے تھے حالی ایک طنزیہ تشبیہہ کے ساتھ لکھتے ہیں:

"ہائی ایجوکیشن (اعلیٰ تعلیم) کی بدولت ان کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جو اندھیری رات میں ایک نہایت روشن کمرے سے باہر نکلتا ہے اور باہر آکر اس کو در و دیوار کچھ نظر نہیں آتا وہ باہر چلنے پھرنے والوں کے پاؤں کی آہٹ سُن کر تعجب کرتا ہے کہ یہ لوگ کیونکر اندھیرے میں چل پھر رہے ہیں اور آخر گھبرا کر پھر اس روشن کمرے میں گھس جاتا ہے۔"

سرکاری تعلیم کی اس سے زیادہ تنقید کرنا شائد اکبر کے بس کی بات نہ تھی۔ زندگی کے بقا و استحکام اور نشو و نما کے لئے اقتصادی سہارے کی بہت بڑی اہمیت ہے لیکن زندگی صرف معیشت سے ہی عبارت نہیں، شخصیت اور انسانیت کے ارتقاء اور نشو و نما میں دوسری قدروں کا بھی ہاتھ ہوتا ہے

انسانیت کی ترویج و تکمیل کیلئے مذہبی اور اخلاقی قدروں کا بھی سہارا لینا پڑتا ہے
آج سائنس کے بڑے بڑے کارنامے دنیا کو بہت فلاح پہنچانے اور بہت آگے لے جانے کے باوجود ذہنی و قلبی سکون بخشنے سے قاصر ہیں۔ نہرو جیسے مذہب کے نکتہ چین بھی روحانی اور اخلاقی قدروں کی اہمیت محسوس کرنے لگے ہیں۔ "بنیادی رویہ" کے نام سے حال میں ان کا ایک مضمون شایع ہوا تھا۔ جس میں مرقوم تھا:

"اکثر کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مایوسی اور اضمحلال کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے ..... یہ چیز صرف ہمارے ملک ہی میں دکھائی نہیں دیتی بلکہ ایک لحاظ سے عالمی واقعہ بن چکی ہے ... یہ اس وجہ سے ہے کہ ہمارے پاس فلسفیانہ رویہ کا فقدان ہے ہم نے ملک کی معاشی خوش حالی کی کوششوں میں انسانی فطرت کے روحانی عناصر کی جانب توجہ نہیں دی ہے[1]

حالی تو شروع ہی سے مذہبی آدمی تھے اور اس کے قائل تھے کہ زندگی کی تکمیل نشوونما کے لئے صحیح مذہبی عنصر کا شامل ہونا لازمی ہے چنانچہ انھوں نے مذہبی تعلیم کی طرف توجہ دلائی ہے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کی تقریر میں انھوں نے مذہبی تعلیم کی اشاعت پر زور دیا ہے۔

سرسید کی تعلیمی مہم سے وابستہ ہونے، اس میں عملی حصہ لینے، اور انکی تعلیمی تحریک کا جائزہ لینے کے سلسلے میں انھوں نے فن تعلیم سے متعلق وقیع

[1] بحوالہ "الکلام" پٹنہ صـ ۳ ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۷ء

معلومات حاصل کرلی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سلسلہ میں کافی مطالعہ کیا تھا، کافی غور وخوض کیا تھا۔ حیات جاوید میں ملکی و قومی خدمات کے ضمن میں انھوں نے جہاں سرسید کی تعلیمی خدمتوں کا جائزہ لیا ہے وہاں فن تعلیم سے ان کی واقفیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"تعلیم کے مسئلہ پر کبھی نظام تعلیم (ایجوکیشنل سسٹم) کے لحاظ سے اور کبھی طریقہ تعلیم کے لحاظ سے اور کبھی دیگر حیثیتوں سے بحث کی جاتی ہے مگر سب سے مقدم اور مہتم بالشان حیثیت جس سے تمام حیثیتیں متفرع ہوتی ہیں یہ ہے کہ کس قوم میں ایک اجنبی اور غیر مانوس تعلیم جاری کرنے کی کیا سبیل ہے؟" صفحہ ۴۲۹

گویا مسئلہ تعلیم پر انھوں نے تین پہلوؤں سے غور کرنا مناسب سمجھا ہے۔

(۱) اشاعت یا ترویج تعلیم

(۲) نظام تعلیم

(۳) طریقۂ تعلیم

سرسید کی تعلیمی خدمات کے تحت حیات جاوید میں انھوں نے سب سے پہلے اشاعت تعلیم کے سلسلہ میں خامہ فرسائی کی ہے اور دکھایا ہے کہ کن کن طریقوں سے انھوں نے علی گڑھ کالج کے لئے چندہ فراہم کیا، اس کے استحکام کی صورتیں پیدا کیں اور مسلمانوں میں نئی تعلیم کا شوق پیدا کیا۔ اس مسئلہ پر لکھتے ہوئے اکثر وہ بہت تفصیل سے کام لیتے ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ سرسید سے مرعوب تھے اور ان کے کارناموں کو دیکھ کر حیرت سے چیخ اٹھے

بلکہ یہ تفصیل ارادۃً پیش کی گئی ہے تاکہ اشاعت تعلیم کے سلسلے میں ان طریقوں سے آئندہ بھی مدد لی جا سکے۔ ترویج تعلیم کے سلسلے میں ترغیب تعلیم کا مسئلہ بھی نکل آتا ہے۔ سرسید سرکاری آدمی نہ تھے انھیں تو لوگوں میں شوق و رغبت پیدا کرنا تھا۔ پھر یہ کہ محض جبر سے کچھ نہیں ہو سکتا جب تک کہ خود اس چیز سے محبت یا رغبت نہ ہو جائے اس سلسلہ میں حالی نے اجلاس کراچی کی صدارتی تقریر میں تعلیمی وظیفوں کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ نظام تعلیم کے سلسلے میں خالص اعلیٰ تعلیم اور پیشہ ورانہ تعلیم پر انھوں نے جو اظہار خیال کیا ہے اسکے متعلق ہم عرض کر آئے ہیں طریقۂ تعلیم کے متعلق انھوں نے سرسید کی تعلیمی خدمات کے تحت کچھ نہیں لکھا لیکن حیات جاوید میں دوسری جگہوں پر اس سلسلے میں اشارے مل سکتے ہیں۔

حالی کی تعلیمی خدمتیں سرسید کی تحریک تعلیم کی مضامین کے ذریعہ اشاعت علی گڈھ کالج کے لئے چندہ کی فراہمی، ندوۃ العلماء کو مشورہ دینے، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کرنے اور پانی پت میں بچیوں کے لئے اسکول کھولنے اور لائبریری قائم کرنے تک محدود ہیں۔ ان کو ایک محدود دائرہ سے نکل کر سارے ہندوستان کے تعلیمی مسائل پر توجہ کرنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ اس زمانہ میں توجہ اور خدمات کا دائرہ اسی طرح محدود ہوا کرتا تھا لیکن ان کی وسعت نظر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یو۔پی، پنجاب اور دوسرے صوبوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق پوری پوری واقفیت رکھتے تھے۔ غیر اسلامی اداروں میں تعلیم کی کیا روش ہوتی ہے، مسلمان ان اداروں میں تعلیم حاصل کرنے سے کیوں پرہیز کرتے ہیں ان معاملات پر ان کی

رائے معلوم کرنے کے لئے ان کے خطوط اور مقالات سے مدد لی جاسکتی ہے انھیں مصر، ترکی اور روس میں مسلمانوں کی رفتار تعلیم کا بھی علم تھا اور اس سلسلے میں کراچی کی صدارتی تقریر میں انھوں نے سامعین کو مفید معلومات فراہم پہنچائی ہے۔ مثلاً لڑکیوں کی تعلیم کے متعلق کہتے ہیں:

"انھوں نے (روسی مسلمانوں نے) مسلمان لڑکیوں کو بھی فراموش نہیں کیا چنانچہ باکو میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جس عالیشان مدرسہ کی بنیاد انھوں نے ڈالی ہے صرف اس کی تعمیر پر تین لاکھ بیس ہزار پاؤنڈ کی رقم صرف ہوئی ہے۔ اس مدرسہ کے اخراجات کے لئے انھوں نے ایک جائداد وقف کی ہے جس کی سالانہ آمدنی تیس ہزار پاؤنڈ یا ساڑھے چار لاکھ روپئے ہے۔"

حالی کی تعلیمی کوششیں مسلمانوں کے دائرہ تک محدود تھیں لیکن انھوں نے جو نظریے پیش کئے ہیں ان کی اہمیت اور افادیت آج بھی مسلم ہے۔ آج سارے ہندوستانیوں کو صنعتی اور زراعتی تعلیم کی اس طرح ضرورت ہے جیسا کہ حالی سمجھتے تھے۔ مذہبی تعلیم تو ایک غیر مذہبی حکومت میں ممکن نہیں لیکن HUMANITIES کی تعلیم کی اہمیت ہمارے سربرآوردہ لیڈر بھی اب محسوس کرنے لگے ہیں اس [illegible] آج کے مسائل تعلیم کو پیش نظر رکھیں اور حالی کے نظریوں میں ان کا حل تلاش کریں تو ان کی عظمت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

شکیلہ غالب ملیح آبادی

حالی بحیثیت مصلح قوم و ادب

اس مقالہ میں حالی کی ان اصلاحی کوششوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ جو انھوں نے قوم و ملک، ادب اور شاعری کیلئے کیں۔

ادارہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس میں کوئی شک نہیں کہ دیدہ ور کبھی کبھی ظہور میں آتے ہیں اور اس کے بعد بھی گمنامی و عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لالہ و گل کی شکل میں چند حضرات ہی نمایاں ہوتے ہیں ورنہ سب خاک میں پنہاں ہو جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد ہم مختلف طریقوں سے روشنی ڈال کر ان کی شخصیت کو اجاگر کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں مگر افسوس کبھی زندگی میں ان کی قدر نہیں کرتے، قدر کیا اُن کی مخالفت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں اور کسی طرح ان کو سنبھلنے نہیں دیتے

مرنے کے بعد ان کی معمولی سی معمولی بات کو یاد کر کے اظہار غم کرتے ہیں۔

بعد مرنے کے قدر کرتی ہے

کتنی مردہ پرست ہے دُنیا

الطاف حسین پانی پتی کے ساتھ بھی یہی ٹریجڈی ہوئی۔ اس ہیرے کو جوہریوں نے اس وقت پرکھا جب یہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ جب تک پاس رہا اس کو اس قدر لاپروائی سے رکھا کہ گرد و غبار کی تہوں نے اس کی حقیقی چمک کو کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کاش اس وقت مخالفت کی آندھیاں نہ چلتیں۔ اس ہیرے کو چمکنے دیا جاتا تو آنکھیں خیرہ ہو جاتیں اگر قوم اس وقت ان کی پکار سن لیتی تو آج اس کی حالت لکیر پیٹنے والوں کی طرح نہ ہوتی، اگر قوم نے اپنے رہبر کی راہوں میں روڑے نہ اٹکائے ہوتے۔ ان کو وقت پر پہچان لیا ہوتا تو آج ترقی، عزت، شہرت اور علم اپنی ابتدائی منزل پر نہ کھڑے ہوتے بلکہ ترقی کے تمام مدارج طے کر کے ماہ کامل بن چکے ہوتے مگر اب افسوس کرنے سے کیا ہوتا ہے ہندی کی پرانی کہاوت ہے: "اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت" جب رہبر ہی نہ رہا تو یہ تمنا بھی بے کار ہے کہ کسی رہبر کی پیروی کی ہوتی۔ "خود کردہ را علاج نیست۔" یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے ترقی نہیں کی۔ کی اور ضرور کی۔ مگر اتنی نہیں جتنی کرنا چاہیے تھی۔ ترقی کے میدان میں آج بھی ہمارا ملک دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے زندگی کے ہر میدان میں ہم بہت پیچھے ہیں، حالانکہ ہمارے رہبران نے

ہم کو دوسری قوموں کے شانہ بشانہ چلانے میں اپنی جانوں تک کی بازی لگا دی کیونکہ ہم ترقی کرتے جب ہم نے اپنے رہبر کی پکار پر لبیک نہیں کیا، ہمارا مرض کیسے دور ہوتا جب ہم نے طبیب کی تشخیص کو ہذیان سمجھا۔ شیخ سعدی نے سچ کہا ہے: "ترقی فرمانبرداری میں مضمر ہے نافرمانی میں نہیں" خیر جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ ماضی کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے اور کف افسوس ملنے سے اب کیا حاصل؟ اب بھی اگر ہم چاہیں تو ترقی کے دروازے ہم پر بند نہیں۔ ضرورت متحد ہو کر یقین محکم کے ساتھ عمل پیہم کی ہے۔ اتحاد کے فقدان سے قومیں بساط دہر پر پٹے ہوئے مہرہ کی طرح رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

خواجہ الطاف حسین حالی ایک تراشے ہوئے ہیرے کے مانند ہیں جس طرح ہیرے کے ہر پہل سے مختلف روشنیاں پیدا ہوتی ہے اسی طرح حالی کے خد و خال سے مختلف دلی کیفیات کا اظہار ہوتا ہے ادب کی وہ کونسی محفل ہے جہاں آپ بڑی شان و شوکت سے جلوہ فگن نہیں۔ اگر وہ بہترین نقاد تھے تو اعلیٰ درجہ کے سوانح نگار بھی۔۔۔ ایک طرف مصلح قوم تھے تو دوسری طرف مصلح ادب بھی۔ ان کا مقدس دل صرف عشق الہیٰ میں سرشار نہیں تھا بلکہ قوم کی سچی دبے لوث محبت میں بھی بے چین تھا۔ دل کا ایک گوشہ اگر حب وطن کے چراغوں سے

منور تھا۔ تو کوئی دوسرا گوشہ عالمگیر محبت، انسانیت کی شمع محبت سے چراغاں تھا۔

مولانا حالی فطرتاً خاموش طبع، سنجیدہ مزاج، متین و مدبر تھے مذہب سے آپ کو فطری لگاؤ تھا۔ زمانہ کے ناسا عد حالات نے حالی کی سنجیدگی میں غم کی رنگ آمیزی کی اور قریب قریب ان کو پیکر غم بنا ڈالا۔ قدرت نے ان میں شعری صلاحیت بطور عطیہ کے مرحمت فرمائی تھی۔ وہ ازل ہی سے ایک حساس دل لیکر آئے تھے۔ جذبہ شاعری نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا جس نے ان کے دل کو نازک اور حساس بناتے ہوئے حقیقی سوز و گداز کی بیش بہا دولت سے مالا مال کر دیا۔ اور یہی وہ سچا درد و احساس تھا جس نے حالی کو قوم کا رہبر انسانیت کا نمائندہ اخلاق کا دیوتا اور مذہب کا سچا پیرو بنا دیا۔

شاعری اپنے وقت کی سچی ترجمان ہوتی ہے۔ ادب وہ آئینہ ہے جس میں زمانہ اپنے پورے نشیب و فراز کے ساتھ ابھرتا ہے اور اپنے صحیح خد و خال کو پورے طور پر نمایاں کرتا ہے۔ شاعر کبھی اپنے احول سے بے نیاز ہو کر صرف تصوری شاعری نہیں کر سکتا ہے۔ دن رات کے مشاہدے اس کی شاعری کے آئینہ میں منعکس ہوتے ہیں۔ وہ ہماری اور اپنی زندگی سے اپنے فن کی تکمیل کے لیے مواد لیتا ہے اس کی شاعری بھی ہماری زندگی کا پرتو ہوتی ہے اور کبھی شاعر خود اپنے تمام لطیف احساسات و جذبات کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ غرضیکہ شاعری سوسائٹی کی تابع ہے

یہ تو صحیح ہے کہ شاعر تشبیہہ و استعارے، مبالغہ و غلو، صنایع، بدایع کی رنگین پیالیوں سے پیکر شاعری میں رنگ بھرتا ہے اگر یہ ممکن نہیں کہ اس پیکر کو حقیقت سے کوئی لگاؤ نہ ہو وہ اپنے بلند تخیل کی مدد سے کبھی ماضی کی سیر کرتا ہے اور کبھی مستقبل کی مگر ہمیشہ تصورات کی دنیا میں گم نہیں رہ سکتا۔ بقول جان کیٹس کے۔

"The fancy cannot cheat so
as she is famed to do
deceiving elf."

شاعری سوسائٹی کی تابع اور شاعر ماحول کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ حالی کی شاعری کا اگر ہم سرسری جائزہ لیں تو یہ بات بخوبی ثابت ہو جائیگی اس کے لئے انھوں مقتضائے وقت کا گلا نہیں گھونٹا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ اس مصلح قوم کی شاعری نے کب کب سوسائٹی کی تابع رہی اور کب کب سوسائٹی کو اپنا تابع بنایا۔

قوم کا یہ نجات دہندہ ہم کو سب سے پہلے شعر و سخن کی اس محفل میں ملتا ہے جہاں گل و بلبل، لیلیٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد کے قصۂ عشق کو دہرایا جا رہا تھا۔ جہاں شاعری اپنے اعلیٰ مقاصد اور بہترین خصوصیات سے بے پرواہ ہو کر داد عیش دے رہی تھی اور صحیفہ حسن و عشق بن چکی تھی۔ ہر طرف مجازی عشق اور خیالی اصنام پرستی کا بازار گرم تھا۔۔۔ مہمل الفاظ میں لیلیٰ معنیٰ کم تھی۔ رکاکت و ابتذال کی افراط تھی۔ مبالغہ نہ

غلو کا دور دورہ تھا۔ مذہب کا مذاق اڑا رہا تھا۔ تشبیہ و استعارے کے لئے شعراء کے خیالی گھوڑے عرب و عجم میں دوڑ رہے تھے۔ ہمارا بھی یہ مایۂ ناز شاعر جو مستقبل قریب میں ہمارا رہبر اعظم ہونے والا تھا ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے بھی وہی فرسودہ راگ چھیڑ دیا گو کہ رنگ الگ تھا۔ غالب و شیفتہ کی صحبت نے حالی کی شاعری کو عامیانہ اور رکیک خیالات سے پاک رکھا۔ اس ماحول میں بھی حالی کی انفرادیت باقی رہی۔ کچھ بھی ہو۔ رنگ وہی تھا۔ راگ وہی تھا۔ اونچا ہو یا نیچا قصۂ عشق بتاں وہی تھا مانا کہ کہنے کا ڈھنگ نیا تھا ؎

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

جو دل پہ گذرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

اس راگ و رنگ کی محفل میں حالی کے نغموں میں دوسروں کے مقابلے میں نمایاں فرق تھا جس کا واحد سبب غالب و شیفتہ کا فیض صحبت تھا جس نے ان کو شعراء اور پاکیزہ مذاق سخن بخش دیا تھا۔ حالی خود فرماتے ہیں" شیفتہ، مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے۔ سیدھی سادی

بات کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو نبھانے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ ویسے قدرتی طور پر حالی خود سنجیدہ مزاج تھے۔ بناوٹ مبالغہ اور تصنع سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ مضمون سادہ انداز بیان سادہ لیکن اثر میں ڈوبا ہوا یہی ان کی خصوصیت ہے۔ ان کی شاعری کا نفس مضمون وہ عشق تھا جو اپنے پورے خصائل کا حامل تھا۔ ان کی عشقیہ شاعری قلبی واردات کی ترجمان نہ تھی پھر بھی جب انھوں نے نقل کی تو مجنوئے ثانی بن گئے اور زندگی کا کافی حصہ صحرانوردی میں گزر گیا۔

عیش و نشاط کی محفلوں نے راجہ اور پرجا سب کو زندگی کے حقائق سے بے خبر کر دیا۔ راگ و رنگ کی محفلیں روز سجتی رہیں۔ عوام زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے منہ پھیر کر داد عیش دینے میں اس طرح مصروف ہوئے کہ پھر کوئی آواز ان کو چونکا نہ سکی۔ ادبار کی گھٹائیں چھاتی رہیں۔ زمانہ کروٹ پر کروٹ بدلتا گیا مگر ان کی عیش و نشاط کی محفلوں میں ذرا کمی نہ ہوئی بلکہ کیف و سرور بڑھتا ہی گیا۔ بربادی و نحوست کی گھٹا اٹھی اور ٹوٹ کر برسی۔ ۱۸۵۷ء کی قیامت صغریٰ نے دلی کی بساط کو الٹ دیا۔ عیش و نشاط کی محفلیں درہم برہم ہو گئیں وہی دلی جو اپنی شان و شوکت عزت و دبدبہ میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھی تباہ و برباد ہو گئی۔ آج اس کا تاج خاک دخون میں لتھڑ چکا تھا۔ بربادی و ابتری اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ حالی اس رستخیز بے جا کے

عینی گواہ تھے۔ ان کے حساس، درد مند اور سنجیدہ دل پر اس حادثے کے نقوش بہت گہرے پڑے اور وہ اس سے بہت متاثر ہوئے۔ یوں تو دلّی میں ہزاروں افراد اس سانحہ کے عین گواہ تھے مگر ہر سینہ میں حالیؔ جیسا دل نہیں تھا۔ ہر آنکھ میں حالیؔ جیسی بصارت نہیں تھی۔ کچھ اپنے آپ کو زمانہ کے مطابق ڈھال لیا اور اپنی خودی و خودداری کو طاق پر رکھکر بے حیائی و بے حسی کا لبادہ اوڑھ لیا اور ہنسی خوشی زندگی کے دن گذارنے لگے۔ لیکن جن کا جذبہ خودی بیدار تھا وہ کنارا کش ہو گئے اس شدید بدحالی و افراتفری کے باوجود "جہاں آباد" بقول میرؔ کے "رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے" آج بھی برگزیدہ و مشہور ہستیوں کے وجود سے خالی نہ تھا۔ غالبؔ، آزردہؔ اور شیفتہؔ وغیرہ جو قدیم تہذیب و تمدن کے امین تھے آج بھی اجڑی دلّی کو زینت بخش رہے تھے۔ دلّی روز بروز تباہی و بربادی کی طرف پیش قدمی کر رہی تھی۔ پرانی تہذیب و تمدن کی سر بازار دھجیاں اڑ رہی تھیں۔ سیاسی بدحالی کے ساتھ معاشی بدحالی کے بھیانک دیوتا نے اپنی گرفت مضبوط کرنا شروع کر دی تھی اس گرفت سے محفوظ رہنے کے لیے بہت سی مشہور ہستیاں دلّی سے بے سر و سامانی میں تلاش معاش اور تحفظ ناموس کی فکر میں ہجرت کر گئیں۔ انھیں میں ہماری ذہنی آزادی کا بانی مبانی بھی تھا۔ حالیؔ نے لاہور کی طرف رُخ کیا۔ یہاں ان کو قوم کی خوش قسمتی سے "پنجاب بک ڈپو" میں ملازمت مل گئی

یہاں ان کا کام اردو کی ان کتابوں کی عبارت کا تصحیح کرنا تھا۔ جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی جاتی تھیں۔ مولانا حالی عبارت کا لب و لہجہ درست کرتے اور کتابوں پر اپنی ناقدانہ رائے کا اظہار کرتے۔ اس ملازمت نے ان کو انگریزی ادب سے روشناس کر دیا حالی کی یہ روشناسی ایک بڑے ذہنی انقلاب کا سبب بنی۔ یہی وہ وقت تھا جب حالی کو ادب و زندگی کے درمیان رابطہ قائم کرنے کا خیال آیا۔ انھوں نے ادب برائے ادب یا نشاط سے احتراز کر کے ادب برائے زندگی کا نظریہ پیش کیا۔ اور اردو نظم کو نئے اور مفید خیالات اور مغربی رجحانات سے مالا مال کیا جس کا وہ خود اعتراف کرتے ہیں" تقریباً چار برس تک میں نے ایسے ترجموں کی اصلاح کی جو انگریزی سے اردو میں کئے جاتے تھے۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ مجھے مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہو گئی۔" حالی کے نظریات میں کافی تبدیلی ہو چکی تھی ان کو اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ ان کی شاعری فضول ہے اس کا کوئی مقصد نہیں غزل صرف عشقیہ خیالات ہی کی حامل تھی شاعری کی تنگ دامانی پر جسقدر وہ سوچتے تھے اتنا ہی انھیں دکھ ہوتا تھا۔ مشرقی شاعری کے لئے نئی راہوں کی تلاش نے حالی کو کافی عرصہ تک سرگرداں رکھا مغربی شاعری کے رجحان نے حالی کی راہوں کو روشن کیا اور آخر تک

ایک دن وہ بھی آیا جب انھوں نے مغربی چراغ سے مشرقی چراغ کو روشن کردیا۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے لاہور میں کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں ایک نئے طرز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی، جس میں مصرع طرح کے بجائے کوئی موضوع دیا جاتا تھا۔ حالی اس کے روح رواں تھے۔ انھوں نے مغربی ادب سے استفادہ کرتے ہوئے مشرقی ادب کے دھارے کو پلٹ دیا جو مستقبل قریب میں قومی انقلاب کا ضامن ثابت ہوا۔ اس مشاعرے میں قدرتی مناظر اور فطرت انسانی کی عکاسی کی گئی اور اس ادب کو وسیع تر کیا گیا یہیں سے پرانی اور نئی شاعری کے ڈانڈے الگ الگ ہو گئے۔ یہ ادب کی تاریخ ہے جس میں حالی نے نئے باب کا اضافہ کیا اور جس کو مورخ ہمیشہ زریں حروف میں لکھیں گے۔ حالی نے اس مشاعرے میں چار نظمیں پڑھیں "برسات" "رحم و انصاف" "امید" "حب وطن" نظم برسات کی منظر کشی ملاحظہ ہو۔

گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں — جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی — قدرت ہے خدا کی نظر آتی

اور جب امید پر روشنی ڈالتے ہیں تو یوں نغمہ ریز ہوتے ہیں۔

اے مری امید مری جاں نواز — اے مری دل سوز اے مری کارساز
میری سپر اور میرے دل کی پناہ — درد و مصیبت میں مری تکیہ گاہ

وطن کی محبت دن بدن بڑھتی گئی اور آخر سارا ہندوستان وطن ہو گیا کس قدر عزیز ہے حالی کو اپنا وطن اللہ اللہ یہ محبت ۔

تری ایک مشتِ خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

اے دل! اے بندۂ وطن ہوشیار — خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار
نام ہے اسی کا حبِ وطن — جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کیا وطن کی یہی ہے محبت ہے — یہ بھی الفت میں کوئی الفت ہے
اس میں انساں سے کم نہیں ہیں درند — اس سے خالی نہیں چرند و پرند
ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں — سوکھ جاتے ہیں روکھ فرقت میں

اب حالی کے فطری جذبہ یعنی اصلاحی جذبہ نے ان کو مہمیز کیا اور ان کی دنیا بدل گئی۔ عشقیہ شاعری جو صرف تقلیدی تھی اس سے ان کی طبیعت متنفر ہونے لگی اور ساتھ ہی ساتھ وہ بیس برس کا طویل عرصہ جو صرف جھوٹی شاعری میں گزر گیا یاد آکے ان کے دل کو دکھانے لگا۔ ظاہر ہے حالی جیسے حساس دل کو جو ایک قدم بھی غلط یا غیر مفید نہیں اٹھانا چاہتا تھا اس کو جب اپنی گذشتہ نکمی شاعری یاد آئی ہو گی تو کیا کچھ نہ دل پر گذرتی ہو گی اپنے ان جھوٹے موتیوں کے بارے میں جن کی پالش اب اتر چکی تھی۔ یوں اظہار خیال فرماتے ہیں۔ "البتہ شاعری کی بدولت چند روز

جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی جادہ میں برسوں دست جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا۔۔۔ جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا۔۔۔ بادہ نوشی پر آئے تو خم کے خم لنڈھا دیتے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ کفر سے مانوس رہے، ایمان سے بیزار رہے۔۔۔ کعبہ و مسجد کی توہین کی۔۔۔ خدا سے شوخیاں کیں۔۔۔ نبیوں سے گستاخیاں کیں۔ بیس برس کی عمر سے چالیس سال تک تیلی کے بیل کی طرح دس گز زمین میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے۔ جب آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں۔ سبحان اللہ کیا خوب تعریف کی ہے۔ ایک طرف ان کو اپنی نکمی شاعری کا احساس بے چین کئے ہوئے تھا تو دوسری طرف قومی بدحالی کی فکر انھیں خون کے آنسو رلا رہی تھی اور ساتھ ہی یہ خیال بھی پختہ ہو گیا تھا کہ قدرت نے یہ شعری صلاحیت کسی بڑے کام کے لئے بخشی ہے اگر اس کا صحیح استعمال نہ کیا گیا تو خدا کے سامنے شرمسار ہونا پڑے گا۔

حالی میں قدرتی طور پر وہ تمام صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جو ایک رہبر کامل ایک مصلح قوم کے لیے ضروری ہیں۔ قدرت نے ان کے معجز نما قلم میں وہ خلوص وہ اثر وہ جوش بخشا تھا جو سوئی ہوئی قوموں کو بیدار کرنے کے لیے کافی تھا۔ جو مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونک سکتا تھا جو جذبہ خودی کو متحرک کر سکتا تھا جو بے کیف

دلوں میں نئی امنگ اور نیا جوش ابھر سکتا تھا۔ اور یہ سب حالی کے درد دل کا اعجاز تھا جس نے انکو مصلح قوم بنا کے چھوڑا۔ انھوں نے اپنے فرض کو پہچان لیا تھا۔ منشائے الٰہی کو پا لیا تھا۔ جوانی کا زمانہ تقریباً گذر چکا تھا۔ فطری صلاحیتیں آہستہ آہستہ اُجاگر ہو رہی تھیں عقل اپنے سن شعور کو پہنچ چکی تھی۔ مذہبی جذبہ بھی اپنے شباب پر تھا اور اصلاحی جذبہ ابھر رہا تھا اسی جذبے نے انھیں ایک بار استاد کے سامنے شرمسار کیا تھا۔ غرضکہ حالی کا مطمح نظر اب صرف اصلاح قوم تھا۔ اس زمانہ کی شاعری میں ایسی مثالیں کم نہیں۔ جس میں انسان کی اصلاح کے لئے کوئی نہ کوئی بات نہ کہی گئی ہو

اسباب پہ گر نظم جہاں کا ہے مدار ۔۔۔ اس قوم کا جینا ہے حالی دشوار
عزت کی نہیں جس کو ہرگز پروا ۔۔۔ ذلت سے نہیں ہے جسکو ہرگز کچھ عار

تحصیل علم کی ترغیب اس طرح دلاتے ہیں ۔

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال ۔۔۔ غائب ہوا جہاں سے وہاں آیا زوال
ان پہ ہوئے غیب کے خزانے مفتوح ۔۔۔ جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے یوں فرماتے ہیں ۔

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں ۔۔۔ شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا ۔۔۔ وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

حادثات اور مصائب جو جوہر انسانیت کو جلا دیتے ہیں ان کے حالی احسان مند ہیں ۔

کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو ہماری
احساں یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمہارا
گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے
اپنی نظر میں ہوگا گر وزن کم تمہارا

لاہور کی آب و ہوا موافق نہ ہونے کی وجہ سے حالی کو لاہور چھوڑنا پڑا۔ اور پھر ان کے قدم اس دلی کی طرف اٹھ گئے جو تباہیوں، بربادیوں کے ہاتھ کا کھلونہ بن چکی تھی۔ حالی کا دل پھر ان کو اس گلشن کی طرف لے چلا جہاں خزاں کا دور دورہ تھا جہاں نغمہ شادی پر نوحہ غم غالب آچکا تھا جہاں بہار کے سارے نشان ایک ایک کر کے مٹ چکے تھے۔ حالی پھر اس غمکدے میں آگئے اور یہاں آکر ان کے غم زدہ دل نے جو راگ چھیڑا آج بھی اس کو سنکر دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ آنکھیں بے اختیار نمناک ہوکر حالی کی درگاہ میں عقیدت کے موتی چڑھاتی ہیں یہ صرف دہلی کا مرثیہ نہیں بلکہ دیدہ بینا کے لیے پوری قوم کا مرثیہ ہے جس کا سوز و گداز آج بھی ہمارے دل کو بے چین کر دیتا ہے حالی کے دل کی کیا کیفیت ہوگی جن کی آنکھوں نے اس کو اجڑتے دیکھا تھا۔

جتنے رہتے تھے تیرے ہوگئے ویراں اے عشق
آکے دیوانے میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلّی سے ترے قدر شناس
قدر یہاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرۂ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ ہرگز
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

حالی کی یہ نظم اپنے اندر رنج و الم کا طوفان رکھتی ہے۔ جس میں اصلیت، صداقت، سوز و گداز، درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے ان کی شاعری وہ شاعری نہیں جو مبالغہ و غلو کی محتاج ہو۔ وہ شاعری اور وہ مواد نہیں جس کے لیے سوئے فلک پرواز کرنے کی ضرورت ہو۔ وہ شاعری نہیں جو نازک خیالی کی محتاج ہو۔ یہ وہ شاعری ہے جس میں مسلمانوں کی دردناک کہانی پوشیدہ ہے اور جس کا مواد ہندوستان کے گلی کوچوں میں تھا۔ انسانی فطرت ہے کہ اپنا درد دوسروں کے مقابلہ میں سوا معلوم ہوتا ہے کون ایسا ہندوستانی تھا جس کا یہ درد اپنا درد نہ تھا۔ آشفتہ سری میں خوشی کے نغمے کس کو بھاتے ہیں۔ حالی کے دل میں وہ درد تھا جس کی کسک ہر دل

میں تھی اب اثر کا کیا پوچھنا۔

دلی آکر ان کا درد دل اور سوا ہو گیا۔ دلی کی ہر چیز زبان حال سے شکوہ کر رہی تھی کہ دیکھو میں وہی ہوں جہاں تمہاری عزت وعظمت، جاہ وحشم اپنے عروج پر پہنچا تھا اور آج وہی عزت و عظمت تباہیوں کی آخری حد کو پہنچ گئی۔ مگر تم میں سے کسی کو اس کا احساس نہیں کہ میری عزت کا پاس کرے اور مجھ کو پھر سنبھالنے کی کوشش کرے

رستے میں گر نہ ٹھہرے تو تم بھی جا ملو گے
گزرا ابھی ہے یاں سے خیل وحشم تمہارا

پھرتے ادھر ادھر ہو کس کی تلاش میں تم
گم ہے نہتیں میں یار نہ باغ ارم تمہارا

جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تم کو حالی
کچھ کر کے بھی دکھائے زور قلم تمہارا

حالی کو اپنی گذشتہ عمر کے ضائع ہونے کا کافی افسوس تھا۔ کہ کوئی کام بھی ایسا نہ کیا جو قوم کے لئے مفید ہوتا۔ خود ایک جگہ اظہار کرتے ہیں۔ "نگاہ اٹھا کر دیکھا دائیں بائیں آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا۔ اس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لئے عرصہ حیات تنگ نہ تھا جی میں آیا کہ ایک قدم بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم

بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی
دوڑ دو گز زمین میں محدود رہی ہو ان سے اس وسیع میدان میں
کام لینا آسان نہ تھا۔ قومی درد نے حالی کو بے چین کر دیا تھا وہ قوم
کی اصلاح کرنا چاہتے تھے مگر کوئی واضح اور روشن راہ نظر نہ آتی
تھی ہر راہ تاریک تھی البتہ عشق نہیں بلکہ بوالہوسی اور تعیش کی
راہیں کھلی ہوئی تھیں جن پر ہر شاعر اندھا دھند دوڑا چلا جاتا
تھا۔ حالی کے لئے یہ راہ ابتدا ہی سے کسی قدر مانوس تھی انھوں نے
اپنی راہ میں راست گوئی، حب وطن، امید، رحم و انصاف اور
اخلاق کے ننھے دیئے جلائے مگر افسوس ان میں اتنی روشنی نہ تھی
جو اس تاریک راہ کو ان کے حسب منشا روشن کر سکتے جس پر دوسرے
بھی چل سکتے۔ عین عالم جستجو اور اضطراب کی حالت میں قدرت نے
حالی کو خضر قوم سے ملا دیا۔ جس کا ان کا دل برسوں سے متلاشی تھا
حالی کو راہ نما مل گیا اور قوم کو اعلیٰ ترین رہبر بقول عابد حسین صاحب
سرسید کی بدولت شاعر کو قوم اور قوم کو شاعر مل گیا۔ خود حالی یوں
فرماتے ہیں" ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد
ہے راستہ میں راہ نورد ہے بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے
تھے تھک کر بیٹھ گئے۔ بہت سے ابھی اس کے ساتھ اُفتاں و
خیزاں چلے جاتے ہیں۔ مگر ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں۔ پیروں میں
چھالے پڑے ہیں۔ دم چڑھ رہا ہے چہرے پہ ہوائیاں اڑ رہی ہیں

مگر وہ اولوالعزم آدمی جو ان سب کا راہ نما ہے اس طرح تازہ دم ہے نہ اس کو رستہ کا تکان نہ ساتھیوں سے چھوٹ جانے کی پرواہ، نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے۔ اس کی جنون میں غضب کا جادو بھرا ہے جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے اس کی ایک نگاہ کرم ادھر بھی پڑی اور کام کر گئی۔ سرسید کو قوم کی سیاسی، سماجی، مذہبی، تعلیمی اور اقتصادی بدحالی کا پورا پورا احساس تھا اور اسی احساس نے ان کو روحانی کرب میں مبتلا کر دیا تھا وہ جلد سے جلد قوم کی تباہی دور کرنا چاہتے تھے۔ قوم کی بدحالی کو دور کرنے اور اس کو اس کے حقیقی عزت و منزلت کے تخت پر جلوہ فگن کرنے کی سچی لگن نے سرسید کو وارفتہ مزاج بنا دیا تھا قوم کی ذہنی و جسمانی آزادی کے لئے انھوں نے جان کی بازی لگا دی۔ حالی کا دل کافی عرصہ سے قوم کی تباہی پر خون کے آنسو رو رہا تھا جو آگ ان کو عرصہ سے جلا رہی تھی اسی آگ میں سرسید کو جلتے دیکھ کر اور بھی شدت سے بھڑک اٹھی۔ حالی نے بڑھ کر اس مفکر اور رہبر اعظم کے مقدس ہاتھوں کو تھام لیا۔ ان کی دلی کیفیت کو انھیں کے الفاظ میں سنئے :۔ "قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے ... آ کر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے قوم کی حالت تباہ ہے عزیز ذلیل ہو گئے۔ شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے

دین کا صرف نام باقی ہے' افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دُہائی ہے۔ اخلاق بگڑ چکے اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہے . . . . ایسی حالت میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیالات گزرتے رہتے ہیں ایک یہ کہ ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے۔ پہلے خیال کا یہ نتیجہ کہ کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوتے ہیں۔"

سرسید کی ملاقات نے حالی کی دنیا بدل ڈالی۔ ایک بار پھر بجھی ہوئی طبیعت جوش پر آئی۔ قومی درد جو عرصہ سے حالی کے سینہ میں چنگاری کی طرح سلگ رہا تھا اس کو سرسید نے آتش فشاں میں تبدیل کر دیا۔ سرسید نے ٹھیک وقت پر اس ہیرے کو زمین سے اٹھا لیا جو کسی تاج کی زینت بنے بغیر تاراج ہونے کے قابل تھا اور قوم کے تاج کو اس ہیرے سے تزئین کر دیا۔ سرسید نے اصلاح قوم کا بڑا حصہ حالی کے دوش پر رکھ دیا اور قومی درد کی اس امانت کو بھی جس نے سرسید کی قویٰ کو مضمحل کر کے وقت سے پہلے ضعیف کر دیا تھا۔ حالی نے خوشی خوشی بار امانت اٹھا لیا اور سرسید کے سچے پیرو بن گئے۔ حالی کو سرسید کی اعلیٰ شخصیت نے نہیں بلکہ ان کے مقدس جذبے نے متاثر کیا تھا۔ حالی شخصیت پرست نہیں اصول پرست تھے۔ یا نے سرور صاحب نے بالکل درست کہا ہے "ابھی تک ایک ہی انسان تھا جو

قومی ترقی، انسانیت کی اصلاح کے لیے تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے تھا۔ اب اس میدان میں دوسرا ابھی سر سے کفن باندھ کر اتر آیا تھا سر سید کے قلم میں بڑا زور رہی مگر وہ شاعری کی سحر نگاری سے محروم تھا اس بات کو سرسید بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ نظم بہ نسبت نثر کے انسان کے دل و دماغ کو زیادہ متاثر کرتی ہے سرسید نے حالی کو ایک ایسی نظم کہنے کا مشورہ دیا جس میں قومی بدحالی کی نقشہ کشی پر درد و پر اثر انداز میں کی جائے جس کی وجہ سے قوم کے سوتے جذبے بیدار ہو جائیں۔ حالی نے سرسید کے مشورہ سے ایک نظم مدوجزر اسلام لکھی۔ یہ نظم نہیں۔ قوم کے عروج کا قصیدہ اور زوال کا مرثیہ ہے جس کو آج ہم صرف "مسدس" کہتے ہیں۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا مرثیہ ہے اس میں شاعر نے اپنے دماغ کی بہترین صلاحیتوں سے کام لیکر اسلام کے عروج و زوال کا منظر پیش کیا ہے جس کو پڑھکر کبھی گردنیں شرم سے جھک جاتی ہیں اور کبھی رگوں میں آباؤ اجداد کا خون بڑے جوش سے گردش کرنے لگتا ہے اسلام کے ابتدائی دور سے ۱۸۷۹ء تک کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ یہ اگر کبھی رلاتے ہیں تو کبھی دلوں کو نئے جوش و ولولہ سے بھر دیتے ہیں۔ اس میں شاعر نے خیال آرائی و مبالغہ سے سخت پرہیز کیا ہے تاریخی واقعات کو بہت سیدھے سادے انداز اور سلیس عبارت میں بیان کیا جسکو اُمّی سے عالم تک بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ یہ شاعر کے معجز نما قلم کا اعجاز ہے

جس نے مسدس کی سادہ عبارت میں اثر کوٹ کوٹ کر بھر دیا اور کیوں نہ ہو اپنی ہی کہانی ہے اپنے ہی عروج و زوال کا پر درد قصہ ہے اثر و تاثیر کا کیا پوچھنا، سرور صاحب کہتے ہیں "مسدس ان نظموں میں سے ہے جو مردہ قوموں کو جلا دیتی ہے" اس مسدس میں تیرہ سو برس کی تاریخ کا نقشہ یوں کھینچا ہے جیسے آئینہ میں عکس آجائے۔ مغنی نے وہ نغمہ چھیڑا جس نے ہر دل کے تار کو جھنجھنا دیا۔ یہ قوم کی اصلاح کا نرالا ڈھنگ تھا وہ قوم کے سامنے ان کی گذشتہ شوکت و عظمت عزت و شہرت، غیرت و حمیت، محبت و مروت، علم و حکمت، اعلیٰ اخلاق اور بلند کردار کے نقشے یکے بعد دیگرے پیش کرتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ موجودہ ذلت و نکبت، جہالت و غربت، پستی و بدحالی کے بھیانک منظر بھی پیش کرتا رہا جیسے کوئی شعبدہ گر شعبدہ دکھاتا ہے اور دیکھنے والے ایک کے بعد دوسرے سین کے منتظر ہوتے ہیں۔ اس طرح قوم بھی حالی کی مسدس میں بدلتے ہوئے سین کو دیکھ رہی تھی اور اشک ندامت سے دامن تر کر رہی تھی۔

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

حالی نے قومی درد کو مسدس کی شکل میں پیش کر دیا ہے۔

مس خام کو جس نے کندن بنایا — کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا
عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا — پلٹ دی بس اک آن میں اس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موج بلا کا
ادھر سے ادھر پھر گیا رُخ ہوا کا

گھٹا سر پہ ادبار کی چھا رہی ہے
فلاکت سماں اپنا دکھلا رہی ہے
نحوست پس و پیش منڈلا رہی ہے
چپ و راست سے یہ صدا آ رہی ہے
کہ کل کون تھے آج کیا ہو گئے تم
ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے تم
مگر قوم غافل کی غفلت وہی ہے
تنزل پہ اپنے قناعت وہی ہے
ملے خاک میں پر رعونت وہی ہے
ہوئی صبح اور خواب غفلت وہی ہے
نہ افسوس انھیں اپنی ذلت پہ ہے کچھ
نہ رشک اور قوموں کی عزت پہ ہے کچھ

شاعر روتا رہا اور قوم کو بھی رلاتا رہا۔ دھیرے دھیرے غفلت کے پردے اٹھتے گئے معطل دماغوں میں سوچنے کی قوت پھر سے عود کر آئی۔ جذبہ حمیت و غیرت پھر بیدار ہوا۔ زندگی کی نئی لہر ہر انسان کی رگ و پے میں سرایت کر گئی ہر ہندوستانی کا جذبہ غیرت متحرک ہو گیا۔

جہاں زہر کا کام کرتا ہے باراں
جہاں آکے دیتا ہے رو ابر نیساں
تردد سے جو اور ہوتا ہے ویراں
نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں

یہ آواز پیہم وہاں آ رہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

وہ دین حجازی کا بیباک بیڑا
نشاں جس کا اقصائے عالم میں پہنچا
مزاحم ہوا کوئی خطرہ نہ جس کا
نہ عماں میں ٹھٹکا نہ قلزم میں جھجکا

کیے پے سپر جس نے ساتوں سمندر
وہ ڈوبا دہانے میں گنگا کے آکر

مسدس میں حالی کا جذبہ دل اور قومی درد نقطۂ عروج کو پہونچ گیا مسدس ان کا شاہکار ہے اور حالی کا حساس دل جس کو انھوں نے قوم کے سامنے کھول کر رکھدیا تھا تاکہ ہر کس و ناکس دیکھ لے۔ اور اس کی سچی پکار کو سن لے۔ مسدس پر مشہور ہستیوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا جو ہر حالت میں مسدس کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کی عظمت کو بڑھاتی ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کا کہنا ہے "مسدس نئی شاعری کا بنیادی پتھر ہے"۔

سر سید احمد خاں جو قوم کے نجات دہندہ اور مسدس کے محرک ہیں "مسدس" کو اپنی نجات کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ "اگر خدا نے قیامت کے دن مجھ سے سوال کیا کہ کیا لایا ہے تو عرض کرونگا "حالی سے مسدس لکھوا لایا"۔

رام بابو سکسینہ یوں رقمطراز ہیں "یہ ایک الہامی کتاب ہے اس کو تاریخ ارتقائے ادب اردو میں ایک سنگ نشان سمجھنا چاہیے یہ ایک تارا ہے جو اردو کے افق شاعری پر طلوع ہوا اس سے ہندستان میں قومی اور وطنی نظموں کی بنیاد پڑی۔ ان کے مخاطب ان کے اہل مذہب ہی نہیں بلکہ کل اہل وطن ہیں"۔

جدید تاریخ اردو کے مصنف اشرف علی خاں تحریر فرماتے ہیں

"مسدس حالی" یعنی مد و جزر اسلام" انسانی تصانیف سے زیادہ الہامی کارنامہ کہے جانے کا مستحق ہے یہ تاریخ، مذہب، سیاست تمدن ادب اور شاعری کا ایک ایسا مکمل و جامع شاہکار ہے جس کے ایجاد و اختصار، جامعیت و افادیت، حقیقت و واقفیت، آمد و اصلیت اور کیفیت و نشریت کی کماحقہ تعریف کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔"

مسدس کی تعریف کرنا یا حالی پر کچھ کہنے کے لیے دفتر درکار ہیں حالی وہ بحر ذخار ہیں جن کی گہرائی معلوم کرنا کار دشوار ہے۔ جو جتنا تلاش کرے گا اتنا ہی پائے گا۔ حالی نے اپنی زندگی اور اپنے فن کو قوم کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیا۔ ان کا خاص مقصد قوم مسلم میں جذبہ ملی اور قومی حمیت بیدار کرنا تھا۔ غرض کہ مسدس قوم کی تیرہ سو برس کی صحیح کیفیت، ہمہ گیر قوت اور جذبہ اخوت کا مکمل آئینہ دار ہے۔ شروع میں مسدس کی بڑی مخالفت ہوتی۔ ابتدا میں کب عوام رہبر کو پہچانتے ہیں جب مار ڈالتے ہیں تب اس کے گن گاتے ہیں۔ اور یادگاریں قائم کرتے ہیں۔ مسدس کے جواب میں مسدس کہے گئے۔ نقادوں نے اس کو فنی کسوٹی پر پرکھ کر ناقص قرار دیا۔ مخالفت کا طوفان اٹھا۔ سچائی پر کتنی دیر جھوٹ غالب آتا ہے؟ سورج کے سامنے چراغ کہاں جلتا ہے؟ بادل کہاں چاند کے منور چہرے کو چھپانے پر کامیاب ہوتے ہیں؟

آخر تو چھٹ جاتے ہیں اور چاند اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ منور ہوتا ہے یہی حال مسدس کا بھی ہے۔ یہ کاغذ پر نہیں دلوں پر نقش ہے۔ مسدس اگر اثر، زور، تسلسل، روانی، جوش، اصلیت اور واقعیت سے خالی ہوتا تو یہ مقبولیت و ہر دلعزیزی کیسے نصیب ہوتی۔

مسدس کے علاوہ بھی حالی نے بہت سی نظمیں، رباعیات، قصیدہ اور قطعہ کہے جن کا ہر شعر اصلاحی جذبہ کا حامل ہے ان کی شاعری مقصدی تھی اس لئے انھوں نے شاعری کی عام خصوصیات سے لاپرواہ ہوکر اس کے سوز و گداز کو اپنا لیا تھا۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں — پر حیف تجھ پہ جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام — ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں — تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمان شاعری — قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجئے نماز تو
اے شعر راہ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا — اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو

ترقی پسند شاعری کا پودا حالی نے لگایا اور اپنی منتخب راہ پر خاموشی سے چلتے رہے یہاں تک کہ زمانہ نے آخر حالی کے سامنے گردن جھکا ہی دی۔

کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل — بیڑہ زمانہ کے ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر پہ بے قدریوں کے بعد — اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو

حالی کو یقین تھا کہ ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب ان کی شاعری کی قدر کی جائے گی جو آج فنی اعتبار سے ناقص ہے۔ لیکن اخلاقی اعتبار سے ضرور گراں بہا ہو گی یہ تھی حالی کی خصوصیت شعری۔ انھوں نے بہت سی ایسی نظمیں کہیں جن کو ٹھوس اصلاحی نظمیں کہا جا سکتا ہے۔

"تعصب و انصاف" "کلمۃ الحق" "مناظرہ واعظ و شاعر" "پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ" "شکوۂ ہند" "ننگ خدمت" "چپ کی داد" اور "مناجات بیوہ" وغیرہ۔ چپ کی داد اور مناجات بیوہ کو حالی کا دوسرا تیسرا شاہکار کہا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ حالی کا مطمح نظر اصلاحی تھا اس لئے ان کی نظر انسان کی زندگی کے ان حصوں پر پڑتی تھی جنھوں نے ناسور کی صورت اختیار کر لی تھی "مناجات بیوہ" اور "چپ کی داد" لکھ کر حالی نے سفاک و بے رحم سماج کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا اور جس کا بہتر نتیجہ موجودہ دور میں ظاہر ہے معاشرتی اصلاح میں ان کو سب سے پہلے عورت کا خیال آیا جس پر جیتے جی عرصۂ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ حالی سے پہلے عورت کا اول تو شاعری میں کوئی مقام ہی نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو ایک طوائف سے زیادہ نہیں۔ عورت کی فطری صفات یعنی خدمت، محبت، شرافت، شرم و حیا، پاس عزت، قربانی و ایثار، محنت و جفاکشی اور بلند کرداری کا کہیں ذکر نہیں ملتا یہ حالی اس ملک کی شاعری کا تھا جس کو اپنی عورت

کی خودی وخودداری، عفت وعصمت پر ناز تھا ہندوستان کی تاریخ کو اپنی عورت پر فخر تھا حالی نے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ عورت اس کا صحیح مقام دیا جائے۔ عورت کی حیثیت اردو شاعری میں کچھ ایسی تھی جس کو نہ مکمل مرد کہا جاسکتا تھا نہ مکمل عورت، عورت کا صحیح تصور کسی دماغ میں نہ تھا اس کمی کی تلافی کے لئے حالی اٹھے اور انھوں نے مناجات بیوہ لکھکر سماج کی بنیادوں پر وہ کاری ضرب لگائی کہ ساری عمارت ہل گئی۔ اس نظم میں انھوں نے ایک بیوہ عورت کے دلی جذبات کیفیات و احساسات کو اس قدر پر اثر انداز میں بیان کیا کہ عورت تو عورت مردوں کے دل اس کو پڑھ کر بے چین ہو جاتے ہیں اور جذبہ ہمدردی سے دل لبریز ہو جاتا ہے۔ رام بابو سکسینہ اس نظم کی یوں تعریف کرتے ہیں۔ اس کو پڑھ کر یا سن کر دل پھٹ جاتا ہے۔ بیوہ سب کہیں سے مایوس ہو کر جب خدا کی بارگاہ میں پہونچتی ہے تو آسمان تھرا جاتا ہے

تو ہے ٹھکانہ مسکینوں کا — تو ہے سہارا غمگینوں کا
تو ہے اکیلوں کا رکھوالا — تو ہے اندھیرے گھر کا اُجالا
لاگو اچھے اور بُرے کا — خواہاں کھوٹے اور کھرے کا
بید نرالے بیماروں کا — گاہک مندے بازاروں کا
سوچ میں دل بہلانے والا — بپتا میں یاد آنے والا

عورت پر بیوگی سے زیادہ اور کیا بپتا پڑ سکتی ہے سہاگ لٹ جانے

کے بعد سنسار سونا ہو جاتا ہے، دل گیا اداس ہے کہ زمانہ اداس ہے بیوہ بیچاری اس کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتی ہے، یہ اپنی بپتا سنائیے تو کس کو؟ ہاں ایک ہی سہارا ہے جو دکھیوں کا دکھ درد، دور کرنے والا ہے۔ سماج، اعزا و اقربا، اپنے پرائے سب بیوہ کے اوپر کیا کیا ستم ڈھاتے ہیں ان سے عاجز آکر خدا سے کہہ رہی ہے ؎

جس دکھیا پر پڑے یہ بپتا   کر اسے تو پیوند زمیں کا
یا عورت کو پہلے بلا لے   یا دونوں کو ساتھ بلا لے
یا یہ مٹا دے ریت جہاں کی   جس سے گئی پریت یہاں کی
جس سے ہوئے دل سینکڑوں بیکل   جس نے ہزاروں کر دئے گھائل
جس نے کلیجے آگ میں بھونے   جس نے بھرے گھر کر دئے سونے
خوف دلوں سے کھو دئے جس نے   شرم کے پردے دھو دئے جس نے
قوم کی جس بن آن ہے جاتی   دیس کی جس پر جان ہے جاتی
جس نے کئے دل رحم سے خالی   ریت ہے جو دنیا سے نرالی
قوم سے تو یہ ریت چھڑا دے   بندیوں کی بیڑی یہ تڑا دے

اور آخر میں کہتے ہیں کیا ہوا اگر انسانوں نے انسانوں پر مظالم کی انتہا کر دی، اپنی خوشیوں کی خاطر دوسروں کی خوشیوں میں آگ لگا کر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ تمام راجہ و پرجا، دکھی و سکھی سب ایک ہی جگہ جائیں گے نہ خوشیاں ہمیشہ رہیں گی نہ غم ؎

خوش نہ ہوں خوشیوں کے متوالے   ہیں یہ نشے سب اترنے والے

خواہ ہو وہ رنڈوا اور خواہ سہاگن — عورت ہے سب کی جان کی دشمن
عیش گئی وہ چھوڑ کے یہاں سے — قید گئی یہ کاٹ کے یہاں سے
اس کو پڑی کل اس کی گئی کل! — یہ گئی ہلکی وہ گئی بوجھل
جان پہ آساں دیتی ہے ایسی — بو ہے نکلتی پھول کی جیسی
غم ہو غرض یا عیش ہو کچھ ہو — ہے نہیں جانا چھوڑ کے سب کو
ترے سوا یہاں اے میرے مولا — کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا

غرضیکہ "مناجات بیوہ" لکھ کر حالی نے سماج کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا اور اس انقلاب نے تمام فرسودہ رسومات کو جو بیوگی سے وابستہ تھیں ایک ایک کر کے ختم کر دیا۔ یہ حالی کا لگایا ہوا پودہ تھا جس کا یہ آج سے ہندوستان کے باغ میں پھل آ رہے ہیں۔ بیواؤں پر زندگی کے دروازے کھل گئے ہیں۔ "مناجات بیوہ" کی زبان گنگا جمنی ہے۔ اردو کو فروغ دینے کے لیے انھوں نے دیسی زبان کے الفاظ زیادہ سے زیادہ استعمال کئے ہیں۔ گاندھی جی نے ایک دفعہ مولوی عبدالحق سے کہا تھا کہ میں اردو پڑھنا چاہتا ہوں کونسی کتاب میرے لیے مفید ہوگی تو اس پر بابائے اردو عبدالحق نے جواب دیا: "آپ حالی کی "مناجات بیوہ" پڑھیں۔ اگر ہندوستان کی کبھی کوئی مشترکہ زبان ہوئی تو وہ ہوگی جو اس نظم کی ہے"

"چپ کی داد" دوسری معرکۃ الآرا نظم ہے جو انھوں نے عورتوں

کی اصلاح اور ان میں تعلیم و تربیت کا چرچا عام کرنے کے لئے کہی تھی۔
اس نظم میں عورتوں کی فطری عملاحیتیوں، محبت، شفقت، ہمدردی
خلوص، وفاشعاری، خدمت، مروت، شرم و حیا، پاس ناموس،
فرمانبرداری وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔

اے ماؤ بہنو بیٹیو، دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں، قوموں کی عزت تم سے ہے

نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تصویر ہو
ہو دین کی تم پاسباں، ایمان سلامت تم سے ہے

فطرت تمہاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر و وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا، انساں عبارت تم سے ہے

تم آس ہو بیمار کی ڈھارس ہو تم لاچار کی
دولت ہو تم نادار کی عسرت میں عشرت تم سے ہے

اس نظم میں انھوں نے عورت کی پوری زندگی پر اس طرح روشنی
ڈالی ہے کہ اس کی مکمل شخصیت نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ میکے اور
سسرال کا نقشہ کس قدر دلکش انداز میں پیش کرتے ہیں :

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم
پر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمت گار تم
ماں باپ کے حکموں پہ تم تیلی کی طرح پھرتی رہیں
تم خوار بالپن کی رہیں ماں اور ابا کی تابعدار

سسرال میں جانے کے بعد لڑکی کو جو سب سے پہلی فکر ہوتی ہے اس کو حالی کی زبان سے سنیئے :-

یہاں فکر بھی ہر دم کہیں ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے پاؤ نہ واں آثار تم
بدلے نہ شوہر کی نظر، سسر کا دل میلا نہ ہو
آنکھوں میں ساس اور نند کے کھٹکو نہ مثلِ خار تم
پالا بروں سے گذر گر پڑے بدخو ہوں سب چھوٹے بڑے
چتون پہ میل آنے نہ دو، گو دل میں ہو بیزار تم

تعجب ہے کہ حالی مرد ہونے کے باوجود عورت کے احساسات سے اس حد تک واقف تھے کہ ہر عورت بھی ایک دوسرے کے جذبات سے اس وقت تک باخبر نہیں ہوتی جب تک کہ اس حالت میں نہ پہنچ جائے "چپ کی داد" میں عورت کی ساری خوبیاں بیان کرنے کے بعد اپنے اصلی مقصد پر آجاتے ہیں اور اس طرح سے عورتوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کو تعلیم کا شوق پیدا کرتے ہیں اور مردوں کو ان مظالم پر سے پردہ بھی اٹھاتے ہیں جو انھوں نے عورت کو پوری طور سے اپنا خدمت گذار بنانے کے لئے اس کو دنیا کے تمام علوم و فنون سے بے بہرہ رکھا ہے

جب تک جیو علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبر ویسی ہی جاؤ بے خبر

جو علم مردوں کے لئے سمجھا گیا آب حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں زہر ہلاہل سر بسر
آتا ہے وقتِ انصاف کا نزدیک یوم حساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

ہندوستان میں سب سے پہلے جو آواز عورت کی مظلومی اور انصاف کے لئے بلند ہوئی وہ حالی کی آواز تھی۔ حالی کو طبقہ نسواں سے بہت ہمدردی و محبت تھی۔ اور یہی جذبہ تھا جس نے حالی کو عورتوں کی حالت سدھارنے میں اپنی عزیز و قیمتی زندگی کا کافی حصہ صرف کرنے پر مجبور کر دیا۔ حالی کا دل بہت نرم تھا ہر دکھی کے دکھ پر وہ اس سے زیادہ بے چین ہو جاتے تھے جب تک اس کو دور نہ کر لیتے چین سے نہ بیٹھتے۔ انھوں نے بے رحم سماج پر جس نے عورتوں کی زندگی جانوروں سے بدتر کر دی تھی ٹھوکر پر ٹھوکر لگائی یہاں تک کہ سماج کا ڈھانچہ ہلنے لگا اور تیلیاں بکھرنے لگیں حالی کو اس کی آواز سے تحریک کی صورت اختیار کر لی اور انصاف کو اپنی غفلت اور بے انصافی پر شرم آنے لگی ؎

نوبت تمہاری حق رسی کی بعد مدت آئی ہے
انصاف نے دھندلی سی اک اپنی جھلک دکھلائی ہے
گو ہے تمہارے حامیوں کو مشکلوں کا سامنا
پر حل ہر اک مشکل یوں ہی دنیا میں ہوتی آئی ہے
اٹکے ہیں روڑے چلتی گاڑی میں سچائی کے   پہ فتح جب پائی سچائی ہی نے آخر پائی ہے

سچ ہے ہر زوال عروج کا ضامن ہوتا ہے حالی کی پرخلوص کوششیں کام آئیں اور آج ہندوستانی وہ نہیں جو کبھی تھی آج اسکی قسمت کا فیصلہ خود اس کے ہاتھ میں ہے جتنی چاہے تعلیم حاصل کرسکتی ہے کوئی روک ٹوک نہیں اس پر اب یہ قطعی پابندی نہیں کہ عورت مرد کی غلامی کی خدمت میں زندگی بسر کرے اور خود ترقی نہ کرے۔ یہ بولتی نظمیں زندہ جاوید ہیں ان کی نظموں کی زبان اور طرز نگارش کے متعلق مولوی عبدالحق تحریر فرماتے ہیں "مناجات بیوہ" اور "چپ کی داد" دو ایسی نظمیں ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں کیا ہندوستان کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ ان نظموں کے الفاظ ایک ایک مصرعے سے خلوص، جوش، ہمدردی اور اثر ٹپکتا ہے۔ یہ نظمیں نہیں دل و جگر کے ٹکڑے ہیں۔ لکھنا تو بڑی بات ہے کوئی انھیں بے چشم نم پڑھ بھی نہیں سکتا......" شاعری کے میدان میں حالی نے اپنے مقصد کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے، فنی خوبیاں، بیان کی لطافت، زبان کی شیرینی، ندرت خیال، معانی کی گہرائی اور اثر آفرینی اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتی ہے اس میں شک نہیں کہ بعض نظمیں بے مزہ اور سپاٹ ہیں مگر اس کے ساتھ ہمکو یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ حالی کا مقصد شاعری کو تفریح طبع کے لئے استعمال کرنا نہیں تھا بلکہ قوم کی اصلاح کے لیے۔ اس لئے عمداً انھوں نے حسن و بیان، شگفتگی و رنگینی سے قطع نظر کر کے اپنے خیالات کو خوبی و وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میدان میں حالی کا کوئی حریف نہیں وہ

اپنے مقصد میں پورے طور پر کامیاب ہو گئے۔

صرف نظم ہی کے میدان میں نہیں بلکہ نثر کے میدان میں بھی انھوں نے کارہائے نمایاں کئے ہیں اردو نثر ان کی زیر بار منت ہے حالی کا نثری کارنامہ ادب کا گراں بہا سرمایہ ہے یہ وہ بنیاد ہے جس پر آئندہ عمارتیں بنتی رہے گی لوگ حسب استعداد اس میں اضافہ کرتے رہیں گے۔ اردو کو سر سید کے علاوہ ایک اور مصلح قوم کی ضرورت تھی جس کو عوام نے حالی کی شکل میں پہچانا اور ان کا خیال تھا کہ اس زبان میں علمی یا سنجیدہ مسائل بیان کرنے کی صلاحیت نہیں ہے ان کو اپنی اپنی جگہ پر شرمندہ ہونا پڑا۔ حالی کے معجز نما قلم نے نثر میں ایک سے ایک باریک اور سنجیدہ مسئلہ کو عوام کے سامنے اس طرح سلجھا کر پیش کر دیا ہے جیسے دو اور دو چار۔ یہ حالی کا اصلاحی جذبہ تھا جس نے اردو نثر کو زندگی بخشی۔ اردو کے تنگ دامن کو حالی نے ہندوستان کی مقامی بولیوں سے مالا مال کر دیا۔ خاص طور پر ہندی سے استفادہ کیا اور ایسے ایسے لفظ استعمال کئے جس کو خود ہندو ترک کر چکے تھے مگر انھیں متروک الفاظ کو حالی نے ایسی مناسب جگہ جڑ دیا کہ نگینہ بن گئے۔

حالی قول اور فعل دونوں کے اعتبار سے پیکر اصلاح ہیں۔ نثر میں بھی قومی اصلاح کے کارنامے نظم سے کچھ کم نہیں وہ سب سے پہلے مذہبی رنگ میں مصلح قوم بنکر عوام کے سامنے آئے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے

لاہور کے دوران قیام میں ایک کتاب "مجالس النساء" دو جلدوں میں لکھی۔ یہ کتاب قصہ کی شکل میں ہے اس میں عورتوں کی تعلیم و تربیت کے اصول نہایت دل نشیں انداز میں بیان کئے ہیں یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ کافی عرصہ تک داخل نصاب رہی۔ اس کتاب پر آپ کو پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیم کی طرف سے چار سو روپیہ انعام دیا گیا تھا۔

مولانا کی سیرت کی ایک خاص خصوصیت ان کی بے تعصبی تھی وہ ہر قوم اور ہر فرقہ کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے تھے اور اتنی ہی محبت کرتے تھے جتنی کہ ایک مسلمان سے، وہ بہت کشادہ دل اور روشن دماغ انسان تھے ان کے قومی نعرے سے مراد صرف مسلمان نہیں ہوتے تھے بلکہ ہر وہ قوم جو ہندوستان میں تھی وہ بہت دور رس اور نقطہ سنج تھے۔ وقت کے تیور پہچاننے میں آپ کو کمال حاصل تھا۔ اس بات کو وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ملک اس وقت تک ترقی نہیں نہیں کر سکتا جب تک کہ ملک میں رہنے والی ساری قومیں یکجا کوشش نہ کریں جیسا کے لیے ایک جگہ فرماتے ہیں "جو لوگ ہندو مسلمانوں میں تفرقہ اور پھوٹ ڈالنے والی کتابیں لکھتے ہیں وہ ہندوستان کے سخت دشمن ہیں خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان برہمو ہوں یا آریہ" رسالہ "اتحاد" لکھنؤ کے ایک مضمون میں کہتے ہیں۔" درحقیقت اس سے زیادہ کوئی غلط خیال نہیں ہو سکتا کہ ہندو مسلمان میں دوستی اور یک جہتی کے

روابط مستحکم نہیں ہو سکتے۔ بے شک بدقسمتی سے چند ناشدنی اسباب پیدا ہو گئے جن سے بالفعل دونوں قوموں کی ایک محدود جماعت کے دل و دماغ ایک دوسرے سے پلٹ گئے... بغیر اتفاق اور یک جہتی کے دونوں قوموں کا ملک میں عزت سے ہنا اور گورنمنٹ کی نظر میں عزت و توقیر پیدا کرنا غیر ممکن ہے" تعصب اور اتحاد کے نتائج پر یوں اظہار خیال فرماتے ہیں ؎

تعصب کہ ہے دشمن نوع انساں بھرے گھر جس نے سیکڑوں کیے ویراں
ہوئی بزم نمرود جس سے پریشاں کیا جس نے فرعون کو نذر طوفاں
گیا جوش میں بولہب جس کے کھویا
ابو جہل کا جس نے بیڑا ڈبویا

ملک ہیں اتحاد سے آزاد شہر ہیں نفاق سے آباد
ہندو میں اتفاق ہوتا گر کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر

اصلاح ادب کے سلسلے میں حالی نے "مقدمہ شعر و شاعری" "مسدس حالی اور دیوان حالی کا دیباچہ لکھکر ادب پر وہ احسان کیا جس سے ادب رہتی دنیا تک سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ یہ حالی کا اصلاحی دماغ تھا۔ جس نے ادب میں تنقیدی نقوش ابھار کر جو ان سے پہلے مدہم تھے اردو کو ادبیت بخشی، مقدمہ شعر و شاعری، ایسی مبسوط و مدلل کتاب ہے کہ آج تک باوجود اس احساس کے کہ ادب کو نئے "حالی" اور

"جدید مقدمہ شعر و شاعری" کی ضرورت ہے کوئی نہ لکھ سکا۔ آج بھی جبکہ ادب ترقی کی کئی منزلیں طے کر چکا" مقدمہ شعر و شاعری" کی اس کو ضرورت ہے۔ اس مقدمہ میں انھوں نے فن شاعری پر کافی بحث کی ہے اور بہت سے اصول بھی مرتب کئے ہیں۔

سرسید کی ملاقات کے بعد انھوں نے اصلاح قوم اور اصلاح زبان کے لئے بڑی تیزی سے قدم اٹھائے۔ آپ نے مسلم ایجوکیشنل کے متعدد جلسوں میں شرکت کی اور وہاں نظمیں بھی پڑھیں اور تقریریں بھی کیں۔ سرسید کے اخبار "تہذیب الاخلاق" میں آپ کے اصلاحی مضمون شایع ہوتے تھے اور بھی چند دوسرے رسائل تھے جن کو حالی کے مضمون شایع کرنے کی عزت حاصل تھی ان کا ہر مضمون کسی نہ کسی تعلیم اور خاص رجحان کا حامل ہوتا۔ یہ تمام مضامین مقالات حالی کے نام سے دو جلدوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان مقالات کے عنوانات پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مذہبی تعلیمی سیاسی، اخلاقی اقتصادی اور معاشرتی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک بار آپ کو جلسہ میں شرکت کرنے کی غرض سے علی گڈھ گئے اتفاق سے آپ کی قیام گاہ "مدرستہ العلوم" کے احاطہ سے قریب تھی، آپ مدرسہ دیکھنے گئے اس کو دیکھکر بہت متاثر ہوئے اپنے جذبات کا ان الفاظ میں اظہار فرماتے ہیں "ہم حال و قال کی مجلسوں میں بھی شریک ہوئے ہیں ہم نے پیران طریقت کے گرد مریدوں اور طالبوں کے

حلقے بھی دیکھے ہیں اور ان کے دل ہلا دینے والے نعرے بھی سنے ہیں ۔
..... مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ جو قومی مسرت اور اسلامی حمیت اس مدرسہ کو دیکھکر خود بخود جوش میں آتی ہے وہ کسی دوسری جگہ اب تک نہیں دیکھی گئی..... اس کالج کی ادھوری نیویں، اس کے اسکول کے نامرتب کمرے اس کی بورڈنگ ہاؤس کی ناتمام لینیں..... ہمارے دل میں تاج گنج کے روضہ اور اکبر کے مقبرے سے زیادہ عظمت وشوکت رکھتی ہیں ۔ "کیونکہ ان سے قوم کو نہ کچھ فائدہ پہونچنے کی امید تھی اور نہ اب ہے اور نہ ان سب کی بنیاد محض قوم کی بہبودی اور عزت کی امید پر رکھی گئی تھی ۔" مقالات حالی صفحہ ۱۳۱-۱۳۲ حصہ اول

حالی نے نثر نگاری کے میدان میں اپنے لئے دو خاص موضوع منتخب کئے تھے۔ "ادبی تنقید اور سیرت نگاری" انھوں نے مشاہیر کے حالات پیش کر کے اصلاح قوم کی طرف ایک قدم اور بڑھایا ۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے کہ انسان اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ وہ بھی اس طرح عزت و مرتبہ حاصل کرے اور اس کو بھی اس کی اولاد اس طرح فخریہ یاد کرے اس لئے ہر ترقی پسند قوم اور زندہ ادب اپنے مشاہیر کے کارناموں کو قلمبند کر کے پیش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے حالی نے اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر تین بلند پایہ ہستیوں کا انتخاب کیا۔ فارسی کے مشہور صوفی اور بزرگ شاعر شیخ سعدی جن کو معلم اخلاق بھی کہا جاتا ہے اردو کے مشہور اور مایۂ ناز ادیب و شاعر مرزا اسد اللہ خاں غالب اور

انیسویں صدی کے مخلص اور قابلِ فخر مصلح قوم سر سید احمد خاں۔ یہ تینوں اپنے اپنے زمانہ کے مجدد تھے جنھوں نے قوم کے مردہ جسموں میں روح پھونکنے کی کوشش کی اور اپنے کلام کے ذریعہ سے اس کو زندگی دپائندگی بخشی۔ "حیات سعدی" تذکرہ نگاری میں یہ پہلی ادبی کوشش تھی اس تذکرہ میں حالی نے سعدی کا جو کردار پیش کیا وہ آپ اپنی نظیر ہے اس کتاب کا مقصد مسلمانوں میں اسباب زوال پر روشنی ڈالنا تھا اور ساتھ ہی ساتھ ان کا مقصد خوابیدہ جماعت میں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے تنظیم اور شیرازہ بندی بھی تھا۔ سعدی کو بحیثیت شاعر، معلم اخلاق اور نثر نگار کے پیش کیا گیا ہے فارسی کے اس مایۂ ناز شاعر کے انتخاب میں حالی کا فطری جذبہ کارفرما تھا۔ سعدی کی شاعری اخلاقی شاعری تھی۔ سعدی کی شاعری کے اجزائے ترکیبی انسانی کردار کو بلند کرنا ان میں مذہبی ذوق پیدا کرنا اچھے اور برے میں امتیاز کرنے کی صلاحیت بخشنا تھا اور یہی وہ چیز تھی جس نے حالی کو متاثر کیا انھوں نے "حیات سعدی" لکھکر ہندوستان میں ان کی اخلاقی تعلیمات کو عام کرنے کی کوشش کی۔ یہ بھی ان کا اصلاحی قدم تھا جس نے بڑی حد تک ہندوستانیوں کے اخلاق کو بلند کیا۔ غیر شعوری طور پر لوگوں نے اپنے کو سعدی کے اخلاقی آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کی اور اس طرح سے غیر ارادی طور پر عوام کا اخلاق سدھرتا گیا۔ سعدی کی سوانح عمری پڑھکر لوگوں کو ان کے علمی شوق کا اندازہ ہوا اور بہتوں نے انھیں کی طرح

تعلیم حاصل کرنے کے ذوق کی آرزو کی۔

دوسری مشہور ہستی غالب کی تھی۔ غالب مشکل پسندی، جدت پسندی اور انفرادیت نے ان کو عوام سے اس قدر دور رکھا کہ مشکل سے محدود سے چند اشخاص ان کو جان سکے سمجھ سکے اور وہ بھی پوری طرح نہیں حالی نے اس بات کو محسوس کیا اور انھوں نے غالب کے بہت مشکل اشعار کی سلیس عبارت میں تشریح کی۔ غالب کو عوام میں لانے والا اگر کوئی ہے تو وہ حالی کی ذات بابرکات ہے جس کی وجہ سے عوام کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی اور انھوں نے غالب کی فن شاعری کو سمجھا ورنہ عوام تو عوام خواص بھی ان کی مشکل پسندی و انفرادیت سے عاجز آکر کہہ چکے تھے ؎

کلام میر سمجھے اور دیوان مرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور جس پر غالب کو بھی چیں بجبیں ہو کر کہنا پڑا تھا ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
نہ سہی گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

حالی سے عقیدت مند تلمیذ نے "یادگار غالب" میں ان کے فنی کمال اور محاسن شعری پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کی اولالعزمی خوش طبعی و بزلہ سنجی کی مکمل تصویر پیش کر دی ہے اور اس طرح سے ادیبوں کی توجہ ان کی ادبی خوبیوں، انفرادیت و عظمت کی طرف مبذول کر دی اور یہ بات اچھی طرح

ذہن نشین کردی کہ غالب کا شعری اور نثری کارنامہ ادب کا گراں بہا سرمایہ ہے ایسا سرمایہ جس سے آئندہ ادب کو فائدہ پہنچ سکتا ہے بقول شجاعت علی سندیلوی "حالی نے سب سے پہلے اس بات کو ہمارے ذہن نشین کیا کہ ان کا استاد اور ممدوح محفل گل و بلبل، وصل و فراق، کاکل و عارض کا شاعر نہیں ہے بلکہ وہ اردو کا سب سے بڑا رمز شناس، حقیقت آشنا اور صاحب طرز شاعر ہے جس نے اپنے جام میں نہ صرف حسن و عشق سے راز و نیاز ہی کھول کر رکھ دیئے بلکہ تصوف و حق شناس کے رموز اور حکمت و فلسفہ کے نکات بھی بیان کر دیئے۔"

غرض کہ یہی ایک واحد کتاب ہے جو غالب کو منظر عام پر لانے کا سبب بنی اور ان کتابوں کی محرک ہوئی جو غالب پر بعد میں لکھی گئیں۔ یہ تذکرہ جو ادب کا قیمتی سرمایہ ہے غالب کی درگاہ میں ان کے لائق و فائق شاگرد کا ہدیۂ عقیدت ہے۔ اس میں حالی کا اسلوب مصنوعی آرائش سے پاک و مبرّا ہے۔ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں۔ "مرزا کی بھی خوش نصیبی تھی کہ انھیں شاگرد بھی ایسا ملا جس نے ان کے نام کو روشن کر دیا۔" سچ ہے یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ وہ کچھ دن حالی کے استاد رہے جنھوں نے قعر گمنامی سے غالب کو نکال دیا۔

حالی کی تیسری اور زندہ جاوید تصنیف "حیات جاوید" ہے۔ اس تذکرہ میں انھوں نے مغربی طرز کی سیرت نگاری کی روشنی میں لکھ کر ادیبوں کے لئے نئی راہ کھول دی۔ "حیات جاوید" حقیقت میں ایک

جماعتی زندگی کی صحیح تصویر ہے اس کتاب میں اس ماحول کا پورا نقشہ موجود ہے جس میں سرسید کی ذہنی، دماغی اور ارتقائی کیفیات جھلکتی ہیں۔ اس کتاب میں سرسید کی ابتدائی زندگی، ان کی تعلیمات، ان کے تعلقات، ان کے احباب اور طریقۂ تالیف و تصنیف کے تفصیلی واقعات پائے جاتے ہیں۔ حالی نے سرسید کے خد و خال من و عن ظاہر کر دیے۔ اس میں منقبت سے کہیں زیادہ تنقیدی مواد ہے۔ اس میں نہ صرف حالات و واقعات کو جمع کیا گیا ہے بلکہ ان کو تنقیدی کسوٹی پر پرکھ کر بھی دکھایا گیا ہے "حیات جاوید" لکھکر حالی نے سرسید کے بے نظیر کارنامے کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ جو آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔ یہ "حیات جاوید" کبھی نہ کبھی دوسرا سرسید ضرور پیدا کرے گی۔

حالی کی نثر نہایت نپی تلی اور متین ہوتی ہے۔ عبارت میں ضبط استدلال، وضاحت اور توازن پوری طور پر نمایاں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ انداز بیان بے حد دلکش و جاذب نظر، شگفتہ و رنگین ہو، انھوں نے اردو نثر کو صاف، سلجھا، سادہ سلیس، دلکش اور رواں انداز بیان ضرور بخشا۔ ان کی ہر عبارت اثر میں ڈوبی ہوئی اور معلومات کا ایک ذخیرہ اپنے اندر پوشیدہ رکھتی ہے کتابیں لکھتے وقت ان کا مقصد دماغی تفریح نہیں تھا جو لوگ تفریح طبع کے لیے کتابیں پڑھتے ہیں وہ رنگین اور شگفتہ طرز بیان کو پسند کرتے ہیں جس کا حالی کے وہاں فقدان تو نہیں کچھ کمی ضرور ہے۔ وہ

حالی کی کتابوں اور ان کی عبارت کو پسند نہیں کرتے۔ اگر مطالعہ کا معصد محض تفریح دماغ نہیں بلکہ کسی علمی مسئلے کا حل کرنا، کسی ذہنی الجھن کو دور کرنا، کسی مسئلہ کی حقیقت کو سمجھنا ہے تو صرف اس وقت حالی کی تحریر کی صحیح قدر کا اندازہ ہوتا ہے اس کے پڑھنے والے کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جو دماغی تفریح سے کہیں بڑھکر ہے یعنی علمی ذوق کی تسکین اور تلاش میں کامیابی" صالحہ عابد حسین کی رائے یقیناً ٹھوس ہے۔ زندگی حالی کے اسلوب کو نصیب ہوئی اور یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے انھوں نے سرسید کے جہاں سب کام بخوبی انجام دئیے۔ ہاں اردو کو بھی فارسی کے اثرات سے زیادہ سے زیادہ محفوظ رکھ کر سرسید کے اردو کو سلیس بنانے والے مشن کو بھی پورا کیا۔ مہدی حسن کا کہنا ہے کہ "سرسید کے بعد اگر کوئی قلم اٹھا سکتا ہے تو وہ بوڑھے حالی ہیں"۔ یہ قول آپ جانتے ہیں کس کا ہے کتنے رنگین بیان ادیب کا ہے جس کی عبارت شوخی و رنگینی، حسن و ادا کی حامل ہے وہ بھی حالی کی عبارت کو پسند کرتا ہے۔ ان کی نثری خوبیوں کا اعتراف ڈاکٹر عابد حسین صاحب کتنے مناسب الفاظ میں کرتے ہیں :" حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں ان کی نظم سے کم نہیں۔ اس میں پختگی اور سادگی کی وہی شان پائی جاتی ہے یہ ظاہر ہے کہ سلاست و روانی میں نثر کبھی نظم کا مقابلہ نہیں کر سکتی خصوصاً وہ نثر جس میں علمی مضامین ادا کئے جائیں۔ پھر ان کا اسلوب بیان اتنا سلجھا ہوا ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو پانی کر دیتے ہیں اور لطف

یہ کہ علمی متانت اور وقار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا۔" بیگم اسمٰعیل ان الفاظ میں اظہارِ خیال فرماتی ہیں: "حالی کی عبارت میں ایک آہستہ بہنے والے صاف و شفاف دریا کا لطف آتا ہے۔ جو خس و خاشاک سے پاک اور گرد و غبار سے صاف ہے اپنے مقررہ راستہ پر معمولی چال سے بہتا چلا جاتا ہے ان کے یہاں کوئی مہمل یا مبہم فقرہ نہیں ملتا۔ بلکہ موزوں اور مناسب الفاظ ایک دوسرے سے ملے ہوئے برابر چلے جاتے ہیں شاذ و نادر ایک آدھ لفظ ایسا ملتا ہے جو عام استعمال میں نہیں ہے ورنہ حالی کی نثر زمانہ حال کے مصنفین کے لیے شمعِ ہدایت کا کام دے سکتی ہے۔ ربط و سلسلہ زور سب باتیں ان کی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہیں بیجا تکلف و تصنع کا ان کے یہاں کہیں پتہ نہیں۔"

ان اقتباسات کے پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حالی کی نثر ہر ایک انسان سمجھ سکتا ہے اور وہ اپنے خیالات کو نہایت وضاحت کے ساتھ صاف اور سلیس زبان میں پیش کرنے کا ملکہ رکھتے تھے جو ایک ریفارمر کے لئے نہایت ضروری ہے دنیا کے ہر مصلح قوم نے آسان تر زبان میں اصلاحی خیالات پیش کئے ہیں۔ حالی سب کچھ سہی لیکن اگر یہ کہا جائے کہ وہ مصلح قوم اور صرف مصلح قوم تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ نظم و نثر دو راستے ہیں جن کو حالی نے انتخاب کیا تھا انھوں نے اصلاح کا روشن مینارہ دنیا کے اب

میں تعمیر کر کے آنے والے ادیبوں اور شاعروں کو گمراہی سے بچا لیا ان کو صاف اور روشن راستہ نظر آنے لگا۔ جس پر وہ رواں دواں چل سکتے ہیں۔ حالی کی پوری زندگی آپ کے سامنے ہے وہ بشر کی صورت میں ایک فرشتہ تھے۔ اپنے خلوص، ایثار، اپنی محبت و شرافت کی وجہ سے وہ امر رہیں گے ان کی شاعری پر اعتراضات کئے گئے لیکن ان کی اعلیٰ انسانیت کو دشمن نے بھی تسلیم کیا۔ ان کی شاعری کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کی سوانح حیات بھی ہے جو پوری طور پر ان کے اعلیٰ کرکٹر کی عکاسی کرتی ہے۔ ایسے پاک دل، پاک ذات، پاک خصلت انسان صدیوں میں جا کر پیدا ہوتے ہیں۔

مدت سہل ہمیں جا نو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

مقام حالی

اگر آج حالی زندہ ہوتے اور اُن سے یہ سوال پوچھا جاتا کہ اُردو ادب میں آپ اپنا کیا مقام سمجھتے ہیں تو ان کی طبیعت کی حد درجہ انکساری اور خاکساری کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ غالباً اسی قسم کا جواب دیتے کہ میں خود کو اُردو زبان و ادب کا ایک ادنیٰ خادم تصور کرتا ہوں۔

یقیناً حالی اردو ادیبوں کی صف میں بحیثیت ایک ادنیٰ خادم یا ایک شوقین طالب علم کے داخل ہوئے لیکن بہت جلد انھوں نے خدمت سے عظمت حاصل کر لی اور یہ عظمت انھوں نے اُس وقت حاصل کی جب کہ اردو لکھنے والوں اور اُردو ادب کو پرکھنے والوں میں ایک سے ایک جید شاعر و عالم موجود تھا۔ غالب، مومن، شیفتہ جیسے سخن دان و سخن سنج کے علاوہ نثاروں میں صہبائی۔ سرسید۔ آزاد۔ نذیر احمد اور شبلی وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا۔ حالی انگریزی پڑھے لکھے نہ تھے کہ مغربی علوم کے دروازے اُن پر وا ہوتے۔ عربی و فارسی کی تعلیم بھی اتنی نہ تھی کہ ان کا شمار عالموں میں ہوتا

پھر کیا بات تھی کہ حالیؔ باوجود اپنی محدود اکتسابی صلاحیتوں کے اپنے عہد کے اردو شعر و ادب پر چھا گئے ؟ وجہ صرف یہ تھی کہ حالیؔ ایک ذہین دماغ اور ایک دردمند دل کے مالک تھے انھوں نے اپنی ذہانت سے اندازہ لگا لیا کہ ملک و قوم کو آج کل کس قسم کے تعمیری کاموں کی ضرورت ہے ۔ ہمارے شعر و ادب میں کن چیزوں کا فقدان ہے اور کون سی ایسی خامیاں ہیں جنکی اصلاح ضروری ہے ۔ صحیح نباضی کے بعد پھر خود ان امراض کا علاج بھی شروع کردیا یعنی ان خامیوں اور کمیوں کو پورا کرنے میں اپنا تن من لگا دیا خود کام کیا اور دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دی ۔ مثلاً انھوں نے محسوس کیا کہ ہماری شاعری میں تمام تر خیالی باتیں ہوتی ہیں ۔ تصنع تکلف اور لفظی شعبدہ بازیوں سے محفلیں گرم کی جاتی ہیں ، حقیقی نجاد بات سے یکسر معرّا اور مطالعہ کائنات یا مشاہدۂ فطرت انسانی سے تمام تر مبرا ۔ ایسی نظموں کا ہمارے یہاں کوسوں پتہ نہیں جنھیں ہم نیچرل کہہ سکیں ۔ جن میں واقعیت ہو سچائی ہو یا جن میں اپنا یا دوسروں کا سچا دُکھ درد ہو ۔ یا ایسی نظمیں ہوں جنھیں سنکر کہا جا سکے کہ شاعر نے سچ کہا ہے ۔ ۱۸۷۴ء میں مولانا محمد حسین آزاد اسی خیال کے تحت لاہور میں ایک محفل مناظمہ قائم کرتے ہیں آزاد کی نظمیں سپاٹ ہونے کے باعث تو فراموش ہو گئیں لیکن حالیؔ کی نظمیں ۔ برکھارت ۔ مناظرۂ رحم و انصاف وغیرہ آج بھی لوگوں کو بھولی نہیں ہیں ۔ ہر چند کہ ان میں کوئی شاعرانہ کمالات صرف نہیں کئے گئے ہیں پھر بھی ان میں پیش کردہ احساسات اور مشاہدات کے پیچھے جو خلوص ہے وہ ان نظموں کا بہا ئو اد

بنائے ہوئے ہے۔

یہی خلوص ہم کو ان کے مسدس میں بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ حالی کے دل میں قوم کا درد بہت زیادہ تھا بلکہ یہی جذبہ مشترک تھا جس نے حالی کو سرسید کا گردیدہ بنا رکھا تھا۔ اسی قومی درد نے حالی سے مسدس مد و جزر اسلام لکھوایا۔ آپ اس مسدس کو پڑھیے اس میں شاعرانہ خوبیاں یا فنی کمالات کا مظاہرہ آپ کو نظر نہ آئے گا۔ صرف اسلام اور مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان ہے جو ایک دردمند دل سے نکلی ہے۔ اور اسی لئے دلوں پہ اثر کرتی ہے۔ اس کے شایع ہوتے ہی ملک میں اس کی دھوم مچ گئی تھی اور تقریباً ہر مذہبی محفل میں اس کو سنایا جانے لگا۔ حالی کی خلوص نیت کا اس سے بھی اندازہ کیجیے کہ اس کا حق طباعت انھوں نے اپنے لیے محفوظ نہیں رکھا بلکہ عام کر دیا۔ سرسید تو اس نظم سے اس قدر متاثر ہوئے کہ یہاں تک کہہ گئے کہ خدا جب حشر میں مجھ سے پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لایا تو میرا جواب یہی ہوگا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔

حالی چند ہستیوں سے بھی متاثر تھے۔ مُردوں میں سعدی سے اور زندوں میں اپنے استاد عبدالرحمان پانی پتی، غالب اور سرسید سے۔ اُردو میں اس وقت تک ایسی سوانح عمریاں جنھیں سائنٹیفک کہا جا سکے یعنی جن میں حالات و واقعات کی ترتیب بہت سلیقے سے کی گئی ہو فضول باتوں کو اہمیت نہ دی گئی ہو۔ عقیدت نے معقولیت پر غلبہ نہ پایا ہو، نہیں لکھی گئی تھیں۔ حالی حیات سعدی لکھنا شروع کرتے ہیں ہر چند کہ سعدی ایک غیر ملک کے باشندے تھے ان کے حالات صرف چند تذکروں یا چند تاریخی کتابوں میں منتشر ملتے تھے لیکن حالی نے

ایسے سلیقہ سے ان کی حیات لکھی اور سعدی کی ادبی خوبیوں کو اس عہد کی بات پیش کیا کہ ایک طرف تو حق سوانح نگاری ادا ہو گیا اور دوسری طرف ان کی تصنیفات پر تنقید کا حق بھی ادا کر دیا۔ آج جب ہم حیات سعدی پڑھتے ہیں تو سعدی کی گلستان بوستاں اور ان کی کلیات کا مطالعہ کرنے کا بے اختیار جی چاہنے لگتا ہے تقریباً یہی احساس ہم کو یادگار غالب پڑھنے سے ہوتا ہے غالب کو حالی نے دیکھا تھا ان کے شاگرد رہے تھے ظاہر ہے کہ حیات سعدی سے بہتر ان کی لائف لکھی اور ایسی لکھی کہ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ غالب کی شہرت بہت کچھ یادگار کی مرہون منت ہے ورنہ اس سے پہلے تو شعر و شاعری کی دنیا میں ذوق اور ناسخ کے سوا اس عہد میں کسی کا چراغ نہ جلتا تھا۔ خود غالب کو بھی تمام عمر اپنی کما حقہ قدر و منزلت نہ ہونے کا افسوس ہی رہا۔

حیات جاوید ان دونوں سے بدرجہا بہتر کارنامہ ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حالی سرسید کے ساتھ عرصہ تک رہے ان کو بہت قریب سے دیکھا اور ہر حالت میں دیکھا۔ پھر سرسید کی سوانح عمری لکھنے کے سلسلے میں تمام مواد ان کے سامنے تھا۔ سرسید سے جو بے پناہ محبت اور عقیدت حالی کو تھی وہ الگ کام کر رہی تھی

تنقید کے میدان میں حالی نے محسوس کیا کہ ہماری اردو شاعری صحیح راستے پر نہیں چل رہی ہے اس میں تصنع، تکلف، مبالغہ، دور از کار استعاروں اور تشبیہوں کا زور ہے تمام قوت لفظی اور ظاہری صناعیوں پر صرف کی جاتی ہے۔ موضوع صدیوں سے بندھے ٹکے چلے آ رہے ہیں۔ زندگی سے ہمارے

شعروادب کا کوئی رابطہ نہیں ہے اور اگر ہے تو برائے نام ۔ ہمارا فن تنقید تذکروں میں روایتی قسم کا ہے ۔ کسی ناقد کو یہ کہنے کی جرأت نہیں ہے کہ شاعروں سے کہے کہ تم اپنی روزمرہ زندگی کے واقعات اور تجربات کو شاعری کا موضوع بناؤ اپنے قدرتی اور معاشرتی ماحول کو پیش کرو ۔ حالیؔ ہرچند کہ مغربی فن تنقید سے کماحقہ آگاہ نہ تھے لیکن چند انگریزی ترجموں سے انھوں نے مغرب کی شاعری کے نمونے اور مغربی فن تنقید کے اصول جزوی طور پر سمجھے تھے ان کے ذہین دماغ نے انھیں چند اصولوں کو بنیاد بنا کر اس پر فن تنقید کی ایک عظیم عمارت تیار کردی یعنی ۱۸۹۳ء میں جب انھوں نے اپنے دیوان پر مقدمہ لکھنا شروع کیا تو اس میں فن شعر کی صحیح تعریف کے علاوہ اس کے فوائد و نقصانات اس کے حسن و قبح اور اس کے لوازمات پر عام بحث کی ۔ اور ساتھ ہی ساتھ اُردو شعروشاعری پر ایک غائر نظر ڈالی اُس کی تمام خامیوں کا تجزیہ کیا اور پھر ان تمام خامیوں کو دور کرنے کے لئے اصلاحیں بھی تجویز کیں ۔ یہ مقدمہ اس قدر طویل ہو گیا کہ خود اپنی جگہ پر ایک کتاب بن گیا اور یہی مقدمہ ہمارے جدید فن تنقید کا اب پہلا سنگ میل سمجھا جاتا ہے ۔

ذہین آدمی بہت سے ہوتے ہیں لیکن دنیا میں پرخلوص آدمی کم ملتے ہیں ۔ ایسے آدمی جو نام پر مرتے ہوں بہت مل جائیں گے اور ہر جگہ مل جائیں گے لیکن جو کام پر جان دیتے ہوں اور گمنام رہنا پسند کرتے ہوں گے شاذ ہی دکھائی دیں گے حالیؔ ایک ایسے ہی آدمی تھے ۔ ان کا دل سر تا سر محبت و درد کا گنجینہ تھا وہ جیتے تھے تو دوسروں کے لئے ۔ محنت کرتے تھے تو دوسروں کے لئے ۔ دوسروں کا

دکھ درد ان کا اپنا دکھ درد تھا ۔ ساتھ ہی ان دکھوں اور غموں کو دور کرنے کی سعی بھی وہ کیا کرتے تھے ۔ دوائیں بھی ڈھونڈھتے تھے اور دعائیں بھی مانگتے تھے ۔ جس عمارت کو وہ اٹھاتے اس کی بنیادوں کی درستی پر نظر پہلے ہوتی تھی تاکہ عمارت شاندار اور مستحکم اٹھ سکے ۔ یہی خوبیاں ہیں جن کی بدولت حالی ہمارے قصر ادب کے بہترین معماروں میں شمار ہوتے ہیں آج اردو ادب اپنی اعلیٰ منزل کی طرف گامزن ہے لیکن وہ رہنما جنھوں نے اس کو سیدھے راستے پر ڈالا ان میں ایک خضر ایسا بھی تھا جو راستہ تو دکھا دیتا ہے لیکن خود نمایاں ہونا نہیں چاہتا ۔ اب یہ فرض ہم پر ہے کہ ہم اس خضر کو نمایاں کریں ۔

بیانِ حالی

مکتوبِ خالدی کی روشنی میں

عرب ہاؤس
مولوی گنج لکھنؤ
۲۸ راپریل ۵۹ء

محترم شجاعت صاحب سلام و تحیات

آپ کا حکم ہے کہ "فروغِ اردو" "مولانا حالی" کے لیے جو بزم آراستہ کرنے جا رہی ہے، اس میں میں آپ کا ہاتھ بٹاؤں۔

مگر جو بزم آراستہ ہو چکی ہو؟ اس کے لیے ....

فروغِ اردو کا حالی نمبر حصہ اول نظر نواز ہو چکا ہے، حصہ دوم کا انتظار رہے؟ مشاہیر علم و فن میں سب ہی اس بزم میں نظر آ رہے ہیں، حالی پر یہ کام نقش آخر نہ ہی، پھر بھی اردو ادب کی تاریخ میں باقی رہنے والا کام ہے۔ مولانا ہندوستان گیر

شہرت کے مالک تھے اور آج ہندوستان کے نامور شعرا میں مولانا حالی کا نام سرفہرست نظر آتا ہے، شاید کسی کا خیال ہو کہ یہ شہرت ان کو مسدس کی بدولت حاصل ہوئی ہوگی، تو یہ بات سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ

"جب مسدس حالی شائع ہوا، تو کیا کچھ طوفان نہیں برپا ہوا، کئی مسدس اس کے جواب اور ردمیں لکھے گئے"

(خطبات ڈاکٹر عبدالحق)

مسدس قالی خیالی، موالی، لاابالی، اسی کے جوابات ہیں" اودھ پنچ لکھنؤ" "بہار پنچ پٹنہ" میں اس کا مضحکہ اڑایا گیا، "البشیر اٹاوہ" نے بھی اس مسئلہ میں حصہ لیا۔ لیکن مسدس حالی کو جو مقام آج حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، خیالی تو خیالی ثابت ہوا، "لاابالی" اپنے لاابالی پن کی بدولت ناپید ہوگیا۔

اسی طرح ان کی شہرت کا سبب مقدمہ شعروشاعری بھی نہیں ہے کیونکہ

"یہ تو آپ میں سے بعض صاحبوں کو یاد ہوگا کہ مقدمہ شعروشاعری کی اشاعت پر کس قدر اعتراضوں کی بوچھار ہوئی، ایک اخبار نے تو مسلسل بیس تیس مضامین لکھے، جن میں کتاب اور مصنف دونوں کا مضحکہ اڑایا تھا، مولانا حالی نے نہ کبھی جواب دیا، اور نہ برا مانا، یہ باتیں جواب دینے یا غم وغصہ کے اظہار کی نہیں"

(خطبات عبدالحق)

کیونکہ مولانا حالی جانتے تھے کہ اگر میں نے جواب دیا تو "اس سے اپنی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے"

تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کی شہرت کا سبب کیا ہے، تو میرے خیال میں ان کی شہرت کا اصل سبب دنیائے شاعری میں اس عظیم انقلاب کو قرار دیا جا سکتا ہے جو مولانا حالی لائے، جس نے دنیائے شاعری کو ایک نئی زندگی بخشی، اور اس کے جسد مردہ میں جان ڈالی، شعرا کو قدرت کے عجائبات کے مشاہدہ کی دعوت دی حالات زندگی کے جائزہ کا مشورہ دیا، نئے نئے عنوان، نئے نئے موضوع ان کے سامنے رکھے۔ اس سے ایک نئی جماعت پیدا کی اس نئی جماعت نے جو کام انجام دیا، اس کو چکبست لکھنوی سرور جہاں آبادی، اور علامہ اقبال کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے، یہ حالی کی صدائے بازگشت تھی، جو ان شکلوں میں نمودار ہوئی۔ ان حضرات نے تمام شعبہ حیات پر ایک کامیاب اور گہری نظر ڈالی، محبت والفت، تسلیم ورضا، دکھ، سکھ، مسرت و شادمانی، عبادت وریاضت غلامی و آزادی غرض کہ وہ کونسا انسانی فعل وعمل ہے کہ جس کی نقاب کشائی نہیں کی، اور کونسی ایسی گتھی تھی کہ جو نہیں سلجھائی گئی۔

مگر حالات زندگی کا مجموعی طور پر صحیح جائزہ شان عکاسی کے ساتھ ہیں جو نظر آتا ہے، وہ صرف "مناجات بیوہ" میں نظر آتا ہے۔ مناجات بیوہ دیکھنے کے بعد جب ہم شعر وسخن کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں، اور شعری ذخیرہ میں اس کی مثال تلاش کرنا چاہتے ہیں، تو ہماری نگاہیں مایوسی کے ساتھ واپس آجاتی ہیں اور زبان کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ مولانا حالی اس کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی' اور ہمارے پورے لٹریچر میں اس نوع کی کوئی دوسری نظم نظر نہیں آتی۔ اسی لیے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی شاعری صرف انقلاب ۱۸۵۷ء کی صدائے بازگشت

یا قومی مرثیہ نہیں ہے، بلکہ آخر انیسویں صدی کا اور اوائل بیسویں صدی کے سیاسی اور سماجی ماحول، معاشی اور معاشرتی تبدیلی اور تہذیبی حوادث انقلاب کا نتیجہ ہے، ہمیں ان کی شاعری میں قدیم و جدید کا سنگم نظر آتا ہے، ان کا شاہد اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ جس کی مثال مشکل ہے مولانا حالی اخلاقی پستی، اور عیش پرستی سے بیزار تھے، فرار کی ذہنیت سے ان کو نفرت تھی، جن لوگوں نے مسدس کو فراری ذہنیت کا کارنامہ قرار دیا ہے، ان لوگوں نے مولانا حالی کے ساتھ انصاف نہیں کیا" اگر وہ لوگ اس کے مطالعہ کے وقت بالغ نظری کا ثبوت دیتے، تو ان کی زبانیں اقرار کرتیں کہ مسدس پہلا "صور بیداری" تھا جو ہندوستان میں پھونکا گیا، اور شعر و ادب کے صحیفوں میں اسی کو بانگ درا" اور صور اسرافیل" کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔

مولانا حالی کی شاعری کا آغاز آخر انیسویں صدی میں ہوتا ہے، اور بیسویں صدی میں سنہ ۱۹۱۴ء تک ہم ان کا پیغام سنتے رہے ہیں۔ وہ پیغام مختلف انداز میں اور مختلف اصناف سخن میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ان اصناف سخن میں (۱) قصیدہ (۲)، مثنوی (۳) مرثیہ (۴) غزل (۵) رباعی، (۶) قطعہ، (۷)، مسدس کے علاوہ نظمیں بھی ہیں، اور ان تمام اصناف سخن میں وہ امتیازی شان کے حامل نظر آتے ہیں۔ اسی لیے ان کا موازنہ بھی کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔

کہیں اس سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو جائے کہ مولانا حالی صرف شاعر تھے، تو ایسی بات نہیں، ہمیں مولانا حالی کی ذات مجموعہ صفات نظر آتی ہے، اور جس طرح وہ نیچرل شاعری کے موجد نظر آتے ہیں، اسی طرح ادبی تنقید کا بانی بھی انہی کو

قرار دیا جا سکتا ہے - اور اسی حقیقت کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ ادبی تنقید کی ابتدا ابھی مولانا حالی نے کی، اب اس فن پر متعدد دیکھنے والے نظر آرہے ہیں اور کافی کام ہو رہا ہے، یہ بات دوسری ہے کہ ہمارے تنقید نگاروں میں مغربی تعلیم کا اثر نمایاں ہے، اور جو کام ہو رہا ہے وہ اسی مغربی اصول کے پیش نظر ہو رہا ہے، اسی لیے وہ کام تحقیقی کم اور تقلیدی زیادہ ہے۔ لیکن پھر بھی تنقید کے ذریعہ جو زبان کی خدمت انجام دی جا رہی ہے اس کو کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - پھر

"اردو زبان پر مولانا حالی کا جو احسان ہے اس کی یاد دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ مولانا مرحوم غالباً پہلے شخص تھے جنھوں نے یہ آواز بلند کی کہ زمانے کے ساتھ اردو شاعری کو بھی نیا لباس بدلنا چاہیئے۔"

(مضامین حکمت)

اور اسی کے ساتھ زبان نہایت سادہ اور آسان لکھنا چاہیئے، اسی حقیقت کے پیش نظر مولانا حالی (اور ان کے رفقا) نے بقول ڈاکٹر عبدالحق صاحب

"ان الفاظ کو جو گھروں کے کونوں کھدروں، گلیوں، بازاروں اور کھیتوں میں کس مپرسی کی حالت میں پڑے تھے، چُن چُن کے نکالا انھیں جھاڑا، پوچھا، صاف کیا، جلا دی، اور ان میں سے بہت سے اچھوتوں کو مسند عزت پر لا بٹھایا۔" (خطبات ڈاکٹر عبدالحق)

اس کے لیے ہمیں مولانا حالی کی تمام تصنیفات کا جائزہ لینا ضروری نہیں،

صرف مناجات بیوہ کو اٹھا لیجئے، اور پڑھتے چلے جائیے، تو بے شمار الفاظ ایسے ہمارے سامنے آئیں گے کہ جن سے اردو لٹریچر خالی نظر آتا ہے، ہاں نظیر اکبرآبادی کے یہاں تو اس کی مثالیں مل جاتی ہیں، اور جو ہندی لٹریچر سے مستعار لی گئی ہیں، مگر مولانا حالی نے وہ الفاظ استعمال کئے ہیں کہ جن پر مستعار کا شبہ بھی نہیں کیا جا سکتا، ملاحظہ فرمائیے

جوت ہے تیری جل اور تھل میں — باس ہے تیری پھول اور پھل میں
راہ تری دشوار اور سکڑی — نام ترا رہ گیر کی لکڑی
لاگو اچھے اور برے کا — خواہاں کھوٹے اور کھرے کا
بیدڑا سے بیماروں کا — گاہک منہ سے بازاروں کا
ساتھی جن کا دھیان ہے تیرا — دسرائیت کی واں نہیں پروا
یاں تپھوا ہے، واں پروا ہے — گھر گھر ترا حکم نیا ہے
ڈوب چکی ہے جن کی اگیتی — ڈھارس دیتی جن کو پچھیتی
جب اپنی ہی زمین ہو کلر — پھر الزام نہیں کچھ مینہ پر
تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں — نون کو ترسی میں سانجھر میں
پڑی تھی سونی جب یہ نگریا — تیری ہی تھی یاں کھڑی اٹریا
پھر یہ نگریا اجڑ کے ساری — تیری ہی رہ جائے گی اٹاری

مندرجہ بالا اشعار مناجات بیوہ کے اشعار ہیں، ان میں آپ یہ دیکھئے کہ کتنے اچھوت سندھ ت پر بیٹھے دکھائی دے رہے ہیں، کون کہہ سکتا تھا کہ اردو زبان کے دامن میں جوت، باس، سکڑی، لاگو، دسرائیت

بچھوا، پروا، اگیتی، پچھیتی، کلر، نگریا، اٹریا، اور "نون" کو ترسی میں "سانجھ" میں جیسے الفاظ جگہ پائیں گے ان میں گلیوں، بازاروں اور کھیتوں میں بولے جانے والے الفاظ ہیں، اور اچھوتوں کی کوئی کمی نہیں۔

"مناجات بیوہ"

تو یہ بات اہل نظر حضرات سے پوشیدہ نہیں کہ مناجات تلسی داس کی رامائن کی بحر میں لکھی گئی ہے، اس مناجات میں کیا ہے؟ تو اس کے بتلانے کی ضرورت نہیں، "عنوان" خود مستقل اعلان ہے، اس موضوع پر ہمارے سامنے کئی اور نظمیں بھی ہیں، ان نظموں میں سرور جہاں آبادی کی مشہور نظم "بدھوا کی پرارتھنا" یا "سوز بیوگی" بھی ہے، منشی درگا سہائے سرور کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، وہ ہماری زبان کے بے مثال شاعر تھے، مناظر قدرت کی عکاسی، اور واقعات کی نقاشی میں انھیں کمال حاصل تھا، وہ نیچرل شاعری پر فریفتہ تھے، ان کی زبان میں انتہا درجہ کی حلاوت اور شیرینی نظر آتی ہے، لیکن "سوز بیوگی" ان خوبیوں کو اپنے دامن میں رکھنے کے باوجود اس "سوز" سے خالی ہے، جو مناجات میں ہے۔

حالانکہ مسلمانوں کے نزدیک بیوگی کی زندگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی، کیونکہ یہاں نکاح بیوگان ایک مذہبی فریضہ، اور اسلام کی بنیادی تعلیم کا انمول سرمایہ ہے لیکن مولانا حالی ہندوستان میں پیدا ہوئے، اس لیے

انھوں نے ہندوستان کی تہذیب ہندوستان کی معاشرت، اور ہندوستان کے رسم و رواج اور برادران وطن کے سماجی بندھنوں پر پوری نظر رکھی سماجی الجھنوں میں ایک اہم مسئلہ کم عمری کی شادی اور بیوہ کا مسئلہ تھا" اس مسئلہ پر مولانا حالی سے زیادہ منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی کی نظر ہونا چاہیے تھی، لیکن جب ہم ان کی اس نظم کو دیکھتے ہیں تو ہمیں صاف محسوس ہوتا ہے کہ سرور جہاں آبادی نے بیوہ کی زندگی کو مرد کی نگاہ سے دیکھا ہے، زبان و بیان میں نسوانیت کا کوسوں پتا نہیں، پوری نظم میں دو چار الفاظ ضرور ایسے نظر آتے ہیں، جو عورت کی دنیا میں مستعمل ہیں، اور اس کی سب سے بہتر مثال یہ سامنے آتی ہے وہ

تیرے درد نہاں کو آہ تو بیدرد کیا جانے
گزرتی ہے جو مجھ دکھیا پہ وہ تیری بلا جانے

سے سامنے آتی ہے۔

حالانکہ اہل زبان حضرات سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اس زبان نے مرد و عورت کے فرق کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے، اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنی گھریلو زندگی اور ماحول پر نظر ڈالتے ہیں اور عورتوں کے محاورات اور طرز بیان سے دو چار ہوتے ہیں، اس لطیف فرق کو ہمارے بڑے بڑے اہل قلم حضرات محسوس نہیں کرتے، لیکن مولانا حالی نے اس فرق کا بہت زیادہ خیال رکھا، اور" مناجات بیوہ "لکھ کر اس بات کا سبق دیا کہ واقعات نگاری کے موقع پر اس حقیقت کو نظرانداز نہ

نہیں کرنا چاہیئے۔

مولانا نذیر احمد تو اُن کے معاصر تھے، سید احمد دہلوی، اور راشد الخیری مرحوم نے ان کی پوری اتباع کی اس لیے ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی زبان میں کہنا پڑتا ہے کہ

"اس زمانہ میں نذیر احمد، حالی، سید احمد دہلوی، راشد الخیری اور بعض دوسرے اصحاب کی بدولت صنف نازک کی اس پاکیزہ زبان کا اکثر حصہ ہمارا مشترکہ سرمایہ ہو گیا ہے، اس کے اضافے سے ہماری زبان میں شگفتگی اور حُسن ہی نہیں پیدا ہوا، بلکہ اسے مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔" (خطبات عبدالحق)

شاید اسے تعلّی سمجھا جائے، اور مولانا حالی کی پچھے داری پر محمول کیا جائے تو نہ تو یہ شاعرانہ تعلّی ہے اور نہ پچھے داری، آپ "سوز بیوگی" اٹھایئے اس نظم میں کل چار بند ہیں، جو چالیس اشعار پر مشتمل ہیں، اس کا پہلا بند ہے۔

عجب رقت بھری لے چارہ گر ہے داستاں میری
جگر میں چٹکیاں لیتی ہے رہ رہ کر فغاں میری
پسند آئی نہ آرائش تجھے او آسماں میری
اتاریں بدھیاں بیدرد توڑیں چوڑیاں میری
مبدّل غم سے شادی ہو گئی او جاں جاں میری
کہ ٹپکی بن کے خوں آخر شراب ارغواں میری

فلک نے چھین لیں مجھ سے شہابی چندریاں میری
پہنتی سرخ جوڑا! ایسی قسمت تھی کہاں میری
کہاں کا شوق زینت جل رہی ہیں ہڈیاں میری
گراتی مجھ پہ اب برق ستم ہیں بجلیاں میری
ہوا کیا اے جوانی! وہ لڑکپن کا مرے زیور
کدھر ہے طوق منت کا کدھر ہیں ہنسلیاں میری
لگائی آگ آرائش کو آخر سوز نالہ نے
اڑی ہونٹوں کی مسی بن کے آہوں کا دھواں میری
بہا جاتا ہے آنکھوں سے جو خون آرزو ہو کر
یہ رونا ہے، رہے گی بیکسی یارب کہاں میری
بنایا ہے یہ کس کے سوگ نے ماتم نشیں مجھ کو
تمنا نالہ کش میری ہے حسرت نوحہ خواں میری

وہ نقش نامرادی ہوں، سراپا درد ہوں، غم ہوں
مرقع میں جہاں کے آہ، میں تصویر ماتم ہوں

اس کے دیکھنے سے یہ تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ سرور کی زبان کتنی شستہ تھی؛ اور انداز بیان کتنا لطیف، بندشیں کتنی چست اور تشبیہیں کتنی دلکش اور حسین، لیکن اس نظم میں اگر کسی بات کی کمی ہے تو وہ عورت کی زبان کی کمی ہے، اور نظم کی بحر بھی ایک ایسی بحر ہے کہ جس بحر میں مختلف شعرا کی نظموں اور غزلوں کے علاوہ علامہ اقبال کی ایک مشہور نظم موجود ہے جس کا پہلا شعر ہے کہ

نہیں منت کش تاب شنیدن داستاں میری
خموشی گفتگو ہے، بے زبانی ہے، زباں میری

اس شعر کے نقل کرنے کا یہ مقصد نہیں کہ "سرور" اقبال سے متاثر تھے، یا اقبال، سرور، سے مستقل موضوع ہے، اور دونوں کے کلام کا جائزہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اس وقت میرے سامنے صرف مناجات بیوہ ہے، یہ مناجات بطرز مثنوی لکھی گئی ہے اس مثنوی میں تیرہ بند، اور چار سو اڑتالیس اشعار ہیں ہر بند کا آغاز ایک انوکھے طرز کی دعا سے ہوتا ہے، اس دعا کی اثر آفرینی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ پھر اسی دعا کے ساتھ بیوگی کی زندگی اور اس کی الم ناکیوں کا نقشہ اس طرح کھینچا جاتا ہے کہ جس کو پڑھ کر صرف دل کا سکون ہی نہیں ہلتا۔ بلکہ آنکھیں بھی بھر آتی ہیں، اور بیوہ کی چلتی پھرتی تصویر سامنے آجاتی ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بیوہ نگاہوں کے سامنے ہے اور یہ مناجات ہمارے سامنے پیش کر رہی ہے۔ اور اس کا ہر ہر شعر دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جا رہا ہے، اور ایک ایسا نقش قائم کر رہا ہے جو کسی طرح بتایا نہیں جا سکتا۔

رہا اس نقش کے مشاہدہ کا سوال، تو وہ کسی کو دکھلایا نہیں جا سکتا ہاں اگر کوئی ویسے ہی نقوش اپنے قلب پر بنانا چاہتا ہے، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی ایسی بیوہ کو چشم تصویر میں لائے۔ کہ جس کا دل بھر آیا ہو، آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری ہو، آواز بھرائی ہوئی ہو، دامن صبر چھوٹتے دکھلائی دے رہا ہو،

دوسری طرف جوانی پھٹی پڑ رہی ہو، جذبات میں ہیجان ہو، بیوی کے طلسم سے ظاہری طور پر چھٹکارے کا سامان بھی موجود! لیکن اس کے سامنے "عورت" کا تصور ہو، اور وہ عورت کہ جس کے دامن عفت و عصمت کی قسم کھائی جاتی ہو، اور جو خاندانوں کی عزت اور نسل انسانی کی لاج سمجھی جاتی ہو، اس کو مناجات کرتے دیکھئے، تو وہ نقوش خود بخود قائم ہو جائیں گے، اور کہنا پڑیگا کہ "مناجات بیوہ" اپنی اثر آفرینی اور منظر کشی کے اعتبار سے ایک ایسا مکمل شاہکار ہے کہ جس کی کوئی دوسری مثال ہماری زبان اور لٹریچر پیش نہیں کر سکتا۔

دوسری زبانوں سے کوئی تحبیث نہیں۔

باتوں باتوں میں خط کافی طویل ہو گیا، بس اسی کو شرکت سمجھئے، عنوان "آپکے ذمہ" شاید اس سے محترم شمس صاحب کی خفگی بھی دور ہو جائے۔ اور رضی صاحب کو بھی شکایت کا موقع نہ رہے۔

اور

بس

والسلام

محمد یونس خالدی

سلسلہ کیلئے فروغ اردو کا حالی نمبر حصۂ اول ضرور ملاحظہ فرمائیے

قیمت ہر دو حصۂ کامل رعایتی لعہ ر

سید احتشام حسین

مقدمہ شعر و شاعری

(مقدمۂ دیوان حالی کی حیثیت سے)

شعر و شاعری پر خواجہ الطاف حسین حالی کا مقدمہ، اُن کے دیوان کے ساتھ پہلی دفعہ سنہ ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا۔ اُس کے بعد کسی طرح اُسے ایک آزاد اور خود مکتفی تصنیف کی حیثیت حاصل ہو گئی اور وہ برابر دیوان سے الگ شائع ہوتا رہا۔ پڑھنے والوں نے بھی ہمیشہ اسے دیوان سے الگ ہی کر کے پڑھا یہاں تک کہ بہت سے لوگوں کے لیے وہ دیوان کا مقدمہ نہیں ایک باقاعدہ تنقیدی کتاب ہے جس کی بنیاد پر حالی کو اُردو کا پہلا باقاعدہ نقاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ اُسے اگر اس کے اصلی مقصد یعنی مقدمۂ دیوان کی حیثیت سے دیکھا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا ناقدانہ پہلو ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ اصلاً مقدمہ محض دیوان کا مقدمہ ہے اور اس کا مطالعہ اسی روشنی میں کرنا چاہیے۔ یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ اتنے طویل مقدمہ میں مولانا حالی نے صراحتہً اپنی شاعری کا ذکر نہیں اور نہ مثال میں اپنے وہ اشعار

پیش کئے جنھیں وہ حقیقی شاعری خیال کرتے تھے۔ لیکن نظرِ غائر سے مطالعہ کرنے والے کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ گو حالی نے اپنے مزاج کی مناسبت سے اپنی شاعری کو مثال میں پیش کرنے سے گریز کیا ہے لیکن مقدمہ کو دیوان کے ساتھ شائع کرنے میں ان کا مقصد یہی تھا کہ جب لوگ نفسِ شاعری، شاعری میں اصلیت، سادگی اور جوش، نیچرل شاعری، اخلاق کی قائم مقام شاعری، نئی غزل، نئے قصیدے، نئے مرثیے اور نئی مثنوی کا مطالعہ کرنا چاہیں تو اس مقدمہ کو ختم کرنے کے بعد انھیں فوراً اُس کے نمونے دیوانِ حالی میں مل جائیں۔ اس دیوان میں حالی کے نقطۂ نظر سے لکھی ہوئی غزلیں بھی ہیں، قصیدے، مرثیے اور مثنویاں بھی، اس میں وہ اخلاقی تصورات بھی ہیں جو حالی کو عزیز تھے، اُس زبان کا استعمال بھی جو حالی کے خیال میں شاعری کے لیے مناسب تھی۔

اس طرح اگر مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ مقدمۂ دیوان کی حیثیت سے کیا جائے تو اُس کو اس اعتراض سے بھی محفوظ کیا جا سکتا ہے کہ اس میں باقاعدہ اصولِ شاعری اور نقدِ شعر سے بحث کر کے تنقیدی اصول اخذ نہیں کئے گئے ہیں، حالی کا اصل مقصد تنقید کی کتاب لکھنا تھا ہی نہیں وہ تو اپنی شاعری کے سمجھنے اور اُس سے لطف اندوز ہونے کے لیے کچھ ضروری اشارے کر رہے تھے۔ مقدمۂ شعر و شاعری کی یہ حیثیت بھی غور و فکر کی مستحق ہے۔
حالی نے نثر و نظم میں اور بھی بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جن کی بنیاد پر ان کی تنقیدی بصیرت زیرِ بحث لائی جا سکتی ہے لیکن یہ مقدمہ اُن کے مربوط اور

مبسوط خیالات کا آئینہ ہے۔ اگر اُن کے تصورات میں خامیاں اور غلطیاں ہیں تو وہ بھی یہیں ملیں گی اور اگر خوبیاں ہیں تو اُن کی جستجو بھی یہیں کی جاسکے گی اور ان کی روشنی میں خود اُن کے زادہ ہائے فکر کی خامیوں اور خوبیوں کا مطالعہ کیا جاسکے گا۔ اس وقت مقدمہ کی یہی حیثیت پیش نظر ہے، اُس میں جو تنقیدی مسائل اور خیالات ظاہر کئے گئے ہیں ان کا محاکمہ مقصود نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ مقدمہ میں نفس شعر کے متعلق کچھ اصولی باتیں بھی کہی گئی ہیں لیکن ان کا مقصد اُن نتائج کا پیش کرنا ہے جن کو اُنکی شاعری پر منطبق کیا جاسکے۔

اس کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ مقدمہ شعر و شاعری میں ہے کیا؟ کم سے کم اہم پہلوؤں کو تو سامنے رکھنا ہی چاہیئے۔ آسانی کیلئے مقدمہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ —— (۱) اصول اور تصورات کی تشکیل اور (۲) ان کی روشنی میں اُردو شاعری کی اہم اصناف کا جائزہ اور اصلاح کے متعلق مشورے۔ پہلے حصے میں شاعری کو عطیہ فطرت ظاہر کرنے کے بعد یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ شعر کا ملکہ بیکار نہیں۔ اس کو توضیح اور تشریح میں یونانی اخلاقیات کے بعض تصورات کا سہارا لیا گیا ہے۔ پھر ایک اہم بحث یہ ہے کہ شعر میں انفرادی اور اجتماعی طور سے متاثر کرنے کی صلاحیت دوسرے فنون لطیفہ کے مقابلہ میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ یہاں بھی یونانی علوم کے وہی اثرات کارفرما ہیں جو علوم اسلامی کا جز بن چکے تھے اور جن کی وجہ سے

مشرق و مغرب میں کس قدر یکسانی پیدا ہو رہی تھی۔ اس کے بعد حالی سماج اخلاق اور شاعری کے تعلق سے بحث کرتے ہیں۔ یہ بحث اس لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ یہاں ادب میں مقصدیت کے اس عام خیال سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو انیسویں صدی کے آخری پچیس تیس سال میں ہندوستان کے ادبی تصورات کا جزٔ بن رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی اسی بات کو ذہن نشین کرانا چاہتے تھے تاکہ ان کی مقصدی اور اصلاحی شاعری کے لیے وجہ جواز پیدا ہو سکے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جاتی ہے کہ شاعری سماج کو متاثر کرتی ہے اور قوم کی تعمیر میں ایک آلۂ کار کی حیثیت اختیار کر سکتی ہے تو پھر حالی کی جدید شاعری سے مخالفت کی کوئی حصہ باقی نہیں رہے گی کیونکہ انھوں نے بھی تو اپنے وقت کی آواز ہی کو اپنے اشعار میں بند کرنے اور اپنے ہم قوموں کو جگانے کی کوشش کی ہے۔ ان تمہیدی لیکن ضروری خیالات کے بعد حالی نے شعر کی ماہیت سے بحث شروع کی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بحث کو نتیجہ خیز اور قابل قبول بنانے کے لیے فلسفہ، منطق، نفسیات اور شعریات سے جتنی واقفیت کی ضرورت تھی وہ پوری طرح حالی کے پاس موجود نہیں تھی۔ اپنے مقصد کے مطابق کچھ باتیں مشرق و مغرب سے یکجا کر کے انھوں نے اس بحث کو بہت وقیع بنا دیا ہے لیکن بہت سے گوشے تشنہ بھی رہ جاتے ہیں تاہم شعر کے ضروری اجزا، شعر کی خوبیاں، نیچرل شاعری، زبان و بیان کے لحاظ سے فن شعر گوئی کے لوازم سبھی زیرِ غور آئے ہیں اور حالی

مقدمہ کا مطالعہ کرنے والوں کو اپنے ساتھ یہاں تک لائے ہیں کہ لوگ ان کی یہ بات قبول کرنے میں جھجک محسوس نہ کریں:۔

"جن ذریعوں سے ایشیار کی شاعری ہمیشہ ترقی پاتی رہی ہے وہ اردو کی شاعری کے لیے فی زماننا مفقود ہیں اور ہرگز اُمید نہیں ہے کہ زمانہ آئندہ میں ایسے ذریعے مہیا ہو سکیں .... پس ایسی حالت میں اردو شاعری کی ترقی کا خیال پکانا گویا زمانہ ناسازگار سے مقابلہ کرنا ہے خصوصاً ایسے زمانے میں جب کہ اُردو سے بہایت اعلیٰ اور اشرف زبانوں کی شاعری بھی معرضِ زوال میں ہو، سائنس اُس کی جڑ کاٹ رہا ہو اور سویلزیشن اس کا طلسم توڑ رہی ہے اور اس کے جادو کو حرف غلط کی طرح مٹا رہی ہے. لیکن چونکہ یاس اور امید دونوں حالتوں میں اخیر وقت تک ہاتھ پاؤں مارنا جاندار کا طبعی اقتضا ہے .... اس لیے جو کچھ ہم لکھنا چاہتے ہیں اُس سے یہ جتانا مقصود نہیں ہے کہ کچھ ہوگا بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ کاش ایسا ہوتا۔"

اس کے پیچھے جو منطق کام کر رہی ہے وہ بہت واضح ہے۔ لوگوں کو یہ یقین دلانا ہے کہ گزرا ہوا زمانہ واپس نہیں آسکتا، وہ شاعری پنپ نہیں سکتی جس نے قدماء کے دل گرمائے تھے اس لیے اب شاعری کا تصوّر بدلے ہوئے حالات کی روشنی ہی میں کرنا چاہیئے۔ اس کے لیے قدیم شاعری میں اصلاح کی ضرورت بھی ہوگی اور نئے اسالیب کا تجربہ بھی کرنا ہوگا۔

حالی پڑھنے والے کے ذہن کو زینہ بہ زینہ اس منزل تک لائے ہیں کہ وہ اصلاح کے متعلق اُن کے مشوروں کو قبول کرے۔

یہیں سے کتاب کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جس میں حالی نے اپنے نظریات کو اور غزل، قصیدے، مرثیے اور مثنوی پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو شخص دیوانِ حالی کا مطالعہ مقدمہ کے خیالات کو اچھی طرح سمجھنے کے بعد کرے گا وہ دیکھے گا کہ مقدمہ میں جو اصلاحات پیش کی گئی ہیں اُن کے عملی نمونے حالی کی غزلوں، قصیدوں، مرثیوں اور مثنویوں میں مل جاتے ہیں۔ مقدمہ کے دوسرے حصے میں انھیں چار اہم اصناف کا جائزہ لیا گیا ہے اور انھیں کے دائرے کو وسیع کرنے اور انھیں اقتضائے وقت کے مطابق بنانے کے متعلق مشورے دیے گئے ہیں۔ حالی نے ان باتوں کا ذکر کرتے وقت اپنی ہی شاعرانہ کاوشوں کو پیش نظر رکھا ہے اور ایسا کرنا فطری بھی تھا لیکن کچھ تو اپنے افتاد مزاج کی وجہ سے اور کچھ مصلحتاً انھوں نے اپنے شاعرانہ اصولوں کا تو ذکر کیا لیکن اپنے اشعار مثال میں پیش نہیں کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں جس اندازِ نظر اور مقصدیت کے وہ مبلغ تھے، کھل کر اس کا تذکرہ بھی انھوں نے مقدمہ میں نہیں کیا ہے لیکن کون ایسا ہے جو مقدمہ کو پڑھے گا اور اُن کی "پیروی مغربی" کے مفہوم کو نہ سمجھے گا! سارے مقدمہ میں صرف ایک مقام ایسا ہے جہاں حالی کا مقصد بہت واضح ہے اور ایک خاص سوز آرزو کے ساتھ انھوں نے جدید شاعری کے

قبول کرنے اور سمجھنے کی اپیل کی ہے۔ سماج کے زوال کی وجہ سے شاعری کس طرح زوال پذیر ہو جاتی ہے، اس کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

"جب فنِ شعر اس حالت کو پہنچ جاتا ہے تو اس کی اصلاح قریب ناممکن کے ہو جاتی ہے۔ اول تو شعرا کو قدیم الف و عادت کے سبب اس بات کا شعور ہی نہیں ہوتا کہ جس راہ پر وہ جا رہے ہیں اس کے سوا کوئی اور بھی رستہ ہے، اور اگر بالفرض کسی نے قوم کا شارع عام چھوڑ کر دوسری راہ اختیار بھی کی تو اس کو دو نہایت سخت مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اول تو طریق غیر مسلوک میں قدم رکھنا اور اس کے تمام مرحلوں سے عبور کر کے منزلِ مقصود تک پہنچنا ہی نہایت کٹھن اور دشوار کام ہے دوسری مشکل اس سے بھی زیادہ سخت یہ ہے کہ موجودہ سوسائٹی کا مذاق چونکہ اس نئی روش سے بالکل بیگانہ ہوتا ہے اس لیے نہ کوئی اس کی مشکلات کا اندازہ کر سکتا ہے اور نہ کہیں اس کی محنت کی داد مل سکتی ہے پس کوئی شخص جب تک زمانے کی قدر دانی سے بالکل دست بردار ہو کر اس دہقان کی مانند جو اخیر عمر میں کھجور کا پودا اپنی زمین میں لگائے، محض ایک امید موہوم پر آئندہ نسلوں کی ضیافت طبع کا منصوبہ نہ باندھے، اس کوچہ میں ہرگز قدم نہیں رکھ سکتا اگرچہ یہ ممکن ہے کہ نئی روش پر چلنے والا شاعر کوئی مضمون زمانہ کی

ضرورت اور مقتضائے حال کے موافق شعر کے لباس میں جلوہ گر کرکے ملک کے جدت پسند لوگوں میں کچھ شہرت یا قبولیت حاصل کرلے اور ایک خاص حیثیت سے اس کے کلام کی داد توقع سے زیادہ اس کو مل جائے مگر شاعری کی حیثیت سے نہ توفی الواقع وہ اس کے کلام کی ہوتی ہے اور نہ وہ اس داد کو داد سمجھتا ہے شعرائے ہم عصر کچھ تو قدیم شاعری کے تعصب سے زیادہ تر اجنبیت اور بیگانگی مذاق کے سبب اس کی روش کو اس حجت سے کہ وہ شارع عام سے الگ ہے تسلیم نہیں کرتے اور بعضے اپنے نزدیک اس کی ہجو ملیح اس طرح فرماتے ہیں کہ فلاں شخص نے شاعری نہیں کی بلکہ مفید اور اخلاقی مضامین لکھ کر اپنے لیے زادِ آخرت جمع کیا ہے۔ لیکن اگر وہ فی الواقع موجودہ نسل کی قدر شناسی سے قطع نظر کرچکا ہے تو اس کو ایسی باتوں کی کچھ پروا نہ کرنی چاہیئے بلکہ یہ امید رکھنی چاہیئے کہ اگر قوم کی زمین میں کچھ اَل باقی ہے تو تخم اکارت نہ جائے گا........... نئی شاعری کی نیاز ڈالنے کے لیے جس طرح یہ ضروری ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کے عمدہ نمونے پبلک میں شائع کئے جائیں، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ شعر کی حقیقت اور شاعر بننے کی جو شرطیں درکار ہیں اُن کو بھی کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔"

اس اقتباس کا اعتذارانہ انداز حالی کے اصل مقصد کی غمازی کر رہا ہے (جب انھوں نے جدید شاعری کے کوچے میں

قدم رکھا، قوم کی بہبودی اور فلاح، درستی اخلاق اور اقتضائے زمانہ کی موافقت کا ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا تو مختلف حلقوں سے اُن کی مخالفت ہوئی۔ جو سرسید کے مخالف تھے انھوں نے ان کی شاعری کو سرسید کے مشن کا پروپیگنڈہ قرار دے کر رد کر دیا، جو قدیم شاعری کے چٹخارے کی تلاش میں انھوں نے اسے خشکی اور بے کیفی کی بنا پر رد کر دیا اور جو شاعری کو محض لفاظی قرار دیتے تھے انھوں نے الفاظ کی نئی معنویت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ لامحالہ حالی کو اس سے تکلیف تھی کہ ان کی ساری کوشش رد کی جا رہی ہے لیکن وہ یہ سوچ کر کسی حد تک مطمئن تھے کہ آج نہیں تو کل ان کی محنت کی داد ضرور ملے گی۔ حالی کا یہ اندازہ غلط نہ تھا اور گو مختلف وجوہ سے ان کے نقطۂ نظر کی مخالفت آج بھی کی جا رہی ہے لیکن جس سمت وہ شعر و ادب کو لے جانا چاہتے تھے اُس کی مخالفت اب تقریباً ناممکن ہو گئی ہے۔

بہر حال مقدمہ کو دیوان حالی کے مقدمہ کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اس کی اہمیت کے بعض دوسرے پہلو بھی نظروں کے سامنے آئیں گے۔ اسی کے مطالعہ سے اُن کے نظریہ شاعری کے وہ رُخ متعین کئے جا سکیں جن پر انھوں نے اپنی ابتدائی غزل گوئی کے بعد عمل کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۶۸ء کے بعد جب غالب اور شیفتہ نہیں رہ گئے تھے، حالی نے نئی بنتی ہوئی دنیا کو دیکھا۔ تھوڑے ہی

دنوں میں وہ سرسید کے زیر اثر آ گئے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بڑے خلوص اور بڑی دردمندی سے اُن کے مشن کے مبلغ بن گئے کچھ تو "دل زندہ" اور "ریعان جوانی کی بہار" نے ساتھ چھوڑ دیا تھا، کچھ بدلے ہوئے حالات کا ضرورت سے زیادہ شدید احساس تھا کہ حالی نے اپنے شعور کی پوری قوت سے نئی راہ پر چلنے کا فیصلہ کر لیا اور عدم مقبولیت اور بدنامی سے بے پروا ہو کر نئی دُھن میں مست ہو گئے۔ ان کے لیے شاعری دلفریبی کا سامان نہیں رہی قومی تعمیر کا ذریعہ بن گئی۔ اُنھوں نے جو مختصر سی نظم شعر سے خطاب لکھی ہے اُس کے چند شعر اس حقیقت کو ذہن نشین کر دیں گے:-

اے شعر دلفریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں
تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو

تونے کیا ہے بحر حقیقت کو موج خیز
دھوکے کا غرق کرکے رہے گا جہاز تو

چپ چاپ اپنے سچ سے کئے جا دلوں میں گھر
اونچا ابھی نہ کر علم اِمتیاز تو
عزت کا بھید سلک کی خدمت میں ہے چھپا
محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو
اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا
اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل
بڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

اس نظم کو غور سے پڑھنے والا دیکھے گا کہ اس میں بھی سادگی، اصلیت اور جوش کے علاوہ اور کسی بات پر زور نہیں دیا گیا ہے کیونکہ حالی اسی نقطۂ نظر کی پیروی کر رہے تھے

شاعری کے متعلق اس عقیدے نے اُن سے مسدس اور مقدمہ دونوں لکھوایا، اس لیے میرا خیال ہے کہ چاہے فلسفہ نقد کے لحاظ سے مقدمہ میں خامیاں ہوں اور شاعری کے متعلق تمام مسائل اس دائرے میں نہ آتے ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ حالی نے اپنی شاعری کے جواز میں اس مقدمہ سے بڑا کام لیا کم سے کم اپنی نئی انداز کی غزلوں، نئی مدحیہ نظموں نئے رنگ کے مرثیوں اور نئے طرز کی مثنویوں کے متعلق وہ اصلاحی نقطۂ نظر پیش کر دیا ہے جس کا اظہار وہ ضروری سمجھتے تھے۔

غزل اُردو شاعری کی مقبول صنف تھی، اس میں حالی نے بھی کچھ

دلکش گوشے نکالے تھے، انھیں خود اپنی جادو بیانی کا احساس تھا لیکن حالی اُس کے رسمی موضوعات، مبالغہ آمیزی، غیر اخلاقی تصوّرات سے بیزار تھے اور جب ان میں انقلاب پیدا ہوا اُس وقت بھی انھوں نے غزل کو برقرار رکھنے کی سفارش کی اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ چند اصلاحات بھی پیش کیں یہ وہی اصلاحات ہیں جن پر انھوں نے خود اپنی بعد کی غزلوں میں عمل کیا تھا۔ نئے خیالات کے تحت ان کے یہاں غزلوں کا دائرہ اس قدر وسیع ہوا کہ کبھی کبھی ان میں وہ اشعار بھی جگہ پانے لگے جن کے لیے دوسرے اصناف موجود تھے۔ تاہم حالی نے مقدمہ میں اپنے خیالات اُن غزلوں کی روشنی ہی میں پیش کیے ہیں جو انھوں نے ۱۸۷۴ء کے بعد کہیں۔

مولانا حالی نے قصائد بھی لکھے ہیں لیکن انھیں بدلے ہوئے حالات میں اس بات کا احساس تھا کہ قدیم قصیدہ نگاروں کی پیروی نہیں کی جا سکتی اس لیے انھوں نے قصائد میں بھی اصلاح کا مشورہ دیا اور خود جو چند قصیدے لکھے انھیں مدحیہ نظموں ہی کی شکل دی۔ مبالغہ اور غلو آمیز مدح سرائی سے پرہیز کیا اور مدح میں خوشامد کا شائبہ پیدا نہیں ہونے دیا۔

جہاں تک مرثیہ کا تعلق ہے حالی اُسے اخلاقی شاعری کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس نئی طرز کی نظم سے اردو شاعری میں بہت وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن نئے مرثیے میں وہ بہت سے اُن پہلوؤں کو چھوڑ دینا چاہتے ہیں جنھیں میر انیس اور دوسرے مرثیہ گویوں نے کمالِ فن قرار دیا تھا۔ حالی سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں

کہ مرثیہ کو صرف واقعہ کربلا تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے۔ اب اگر حالی کے مراثی دیکھے جائیں تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے مقدمہ میں جو کچھ لکھا ہے اس پر عمل بھی کر رہے تھے حکیم محمود خاں، ملکہ وکٹوریہ، سر سید اور خواجہ امداد حسین کے مرثیوں میں ان کے اسی نئے تصور کو دخل ہے یہاں پر مرثیہ غالب کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے اگرچہ وہ نئے خیالات سے کچھ پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ حالی نے محض اندرونی مماثلتوں کی وجہ سے قصیدہ، ہجو اور مرثیہ کو ایک ہی دائرہ میں رکھا ہے چنانچہ آخر میں وہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ مدح و ذم کا طریقہ یورپ کی شاعری سے اخذ کرنا چاہیئے اور آئندہ قصائد کی بنیاد اسی طریقہ پر رکھنا چاہیئے

مثنویوں میں تسلسلِ خیال کو فطری طور پر برقرار رکھنے کی جو خوبی ہے حالی اسکی وجہ سے مثنوی کو سب سے زیادہ کارآمد صنف شاعری قرار دیتے ہیں وہ شاعری سے جو کام لینا چاہتے تھے اس لئے مثنوی سب سے زیادہ مناسب تھی اس لئے حالی نے غزل ہی کی طرح مثنویوں پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے، یہاں بھی مبالغہ سے بچنے اور اصلیت کو برقرار رکھنے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے لیکن فنی حیثیت سے حالی نے کوئی خاص بات نہیں کہی ہے مثنوی کے سلسلہ میں بھی ان کا مطمع نظر یہی ہے کہ اسے وسعت دی جائے اور مفید مضامین کے لیے استعمال کیا جائے۔ چنانچہ حالی نے حب وطن، برکھا رت مثنوی حقوق اولاد اور مناجات بیوہ میں اس نئے انداز کی مثنوی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں۔

انھیں باتوں کو پیش نظر رکھ کر میرا خیال ہے کہ مولانا حالی نے (غالباً ورڈسورتھ کے لیریکل بیلڈس کے اہم مقدمہ سے متاثر ہو کر) اپنی شاعری کے متعلق ایک طویل مقدمہ لکھنے کا خیال کیا اور چونکہ بہت دنوں سے وہ

مسلمانوں کی شاعری پر ایک مفصل اور مبسوط مقالہ بھی لکھنا چاہتے تھے اس مقدمہ میں دونوں ایک ہو گئے اور حالی نے یہ احتیاط برتی کہ اس کو اپنی شاعری کی کھلی ہوئی تشریح بنانے کے بجائے ایک علمی اور اصولی بحث بنا کر پیش کیا جس کے دائرے میں خود اُن کی شاعری کی خصوصیات بھی شامل تھیں اس لیے مقدمہ شعر و شاعری کا مطالعہ کرتے وقت اس حقیقت کو ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہیے کہ جس وقت یہ شائع ہوا، دیوانِ حالی بھی اس کا جزو تھا بلکہ اس طرح کہنا درست ہو تا کہ یہ مقدمہ دیوان حالی کا جز تھا جسے اب اصول تنقید شعر پر ایک مبسوط تصنیف قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کا سراغ اسی حقیقت پر نگاہ رکھنے سے مل سکے گا۔

اس مقام پر ایک خیال ضرور پیدا ہو سکتا ہے، جس کا ذکر ضمناً ان صفحات میں آچکا ہے لیکن مسئلہ کی واضح کرنے کے لیے کسی قدر اور تشریح ضروری ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ مقدمہ ۱۸۹۳ء میں لکھا گیا اور دیوان حالی میں اُن کی بہت سی نظمیں پہلے کی شامل ہیں، اس لیے ضروری نہیں کہ ان سارے خیالات کا اطلاق ان کی شاعری پر ہو سکے یہ ایک طرح کا مغالطہ ہے، (حالی نے مقدمہ میں جن تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے وہ برسوں کے ارتقائی غور و فکر کا نتیجہ ہیں اور حالی کے خطوں اور دوسری تحریروں میں اُن کا سراغ بہت پہلے سے لگایا جا سکتا ہے) اس لیے ایسا نہیں ہے کہ ایک کا دوسرے سے

تعلق نہ ہو، پھر بھی یہ بات غور طلب ہے کہ دیوان حالی میں غزلوں اور مرثیہ غالب کے سوا شاید ہی کوئی اور ایسی نظم ملے جو ۱۸۷۰ء سے پہلے لکھی گئی ہے۔ نظموں میں ایک نامکمل نعتیہ قصیدہ اور ایک نعتیہ خمسہ کے سوا اور کسی نظم کی تصنیف کا پتہ نہیں ملتا۔ اُن کی پہلی مکمل اور غیر معمولی نظم مرثیہ غالب ہے جو ۱۸۶۹ء میں لکھی گئی اس کے بعد کی تمام نظمیں اور غزلیں نئے اثرات کے تحت ہی لکھی گئی ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ بیس سال تک حالی شاعری اور زندگی کے تعلق پر جن حیثیتوں سے غور کرتے رہے تھے اور انھیں جن شکلوں میں اپنی نظموں میں جگہ دے رہے تھے انھوں نے کسی حد تک منظم ہو کر مقدمہ شعر و شاعری کی شکل اختیار کی۔ بیج بہت پہلے بویا جا چکا تھا، یہ تصورات فضا میں چکر لگا رہے تھے، مولانا محمد حسین آزاد انھیں اپنے لکچروں، نظموں اور دوسری تصنیفوں میں ظاہر کر چکے تھے، سرسید اظہار خیال کر چکے تھے، خود حالی ان پر غور کر رہے تھے۔ جب وہ انھیں باقاعدہ پیش کرنے بیٹھے تو ساری باتیں یکجا کر دیں حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بہت سی نظمیں ان نئے تصورات کی روشنی میں لکھی گئیں اور بہت سے تصورات انھیں نظموں سے اخذ کیے گئے۔ اس طرح حالی کے یہاں شعر کی تنقید کے متعلق مخصوص خیالات کا ارتقا ہوا۔

ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ رائے قائم کرنا غلط نہ ہوگا کہ مقدمہ کی اولین حیثیت مقدمہ دیوان کی ہے، اس کی ساری بحثیں سب سے

پہلے خود حالی کی شاعری کا جو از پیش کرنے کے لیے علمی انداز میں بیان کی گئی ہیں، تنقید کی ایک اصولی تصنیف کی حیثیت سے بھی اس کی اہمیت ہے لیکن یہ حیثیت ثانوی ہے۔

قندِ مکرّر

از مولانا عبدالماجد۔ بی۔ اے دریابادی

اُردو کا واعظ شاعر

آج سے کوئی ۲۴ سال اُدھر کی بات ہے الہلال، افق کلکتہ سے نیا نیا طلوع ہوا تھا، اور ملک کی ساری فضا، ابو الکلامی ادب و انشاء کے غلغلہ سے گونج رہی تھی، کہ ایک روز اُس کے کسی مقالہ کے ذیل میں، یہ شعر نظر سے گزرا

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

پڑھتے ہی طبیعت بے چین ہو گئی۔ لطف لے لے کر خدا جانے کتنی بار پڑھا۔ درج صرف شعر تھا۔ شاعر کا نام نہ تھا۔ دل نے کہا اور اس کہنے میں کچھ بھی سوچ بچار کی ضرورت نہ سمجھی، کہ شعر یقیناً غالب کا ہے، یاد نہیں پڑتا، نہ سہی، دیوان مطبوعہ میں موجود نہیں، نہ ہو رہ گیا ہوگا۔ لیکن ہے شعر غالب ہی کا۔ اُس مسلّم استاد کے سوا، اور کہہ کون سکتا ہے؟ ——
حاضری اس درمیان میں ایک روز مولانا شبلی کے ہاں ہوئی۔ ذکر اس شعر کا آیا، ارشاد ہوا، کہ غالب کا نہیں، مولانا حالی کا ہے۔

ہائیں! یہ کیا ارشاد ہوا؟ کہاں مولوی حالی اور کہاں یہ شعر؟ بیچارے سیدھے سادے سے آدمی، روکھے پھیکے اشعار نظم کر دینے والے، انھیں غزل کے پھڑکتے ہوئے شعر سے مناسبت کیا؟ شعر کے سارے تیور استاد غالب کے۔ تخیل وہی، بندش وہی، زبان وہی۔ حالی غریب میں نہ یہ حسن بیان، نہ یہ لطف زبان۔ اُن کے کلام میں نہ یہ رنگ نہ یہ جان! نہ تخیل کی یہ رعنائی، نہ طرزِ ادا کی یہ زیبائی! ان کی تو ترکیبیں بھی بودی اور بندشیں تک پھس پھسی! غرض دل نے، کچھ جھنجھلا کر، اور کچھ خفیف ہو کر یہ ساری جرحیں کر ڈالیں، لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہی رہتی ہے۔ دیوان حالی اٹھا کر دیکھا، تو غزلیات کی ردیف دال میں شعر اپنی جگہ پر موجود!

کون حالی؟ وہی جن کے تغزل و تشبیب کی کوئی وقعت دل میں تھی ہی نہیں۔ بس شروع سے خیال یہ جما ہوا تھا کہ غزل کی رنگینیوں اور رنگین بیانیوں سے انھیں واسطہ کیا۔ ایک خشک سے آدمی ہیں کلام پست، عاشقانہ مضامین کا قحط، بندشیں سُست — خدا غریق رحمت کرے، دور اول کے ادھر پنچ کو، اور بھلا کرے اُس کے نقادان فن اور شہسواران سخن کا۔ یہ اُسی کا فیض تھا کہ ایک عامی اور مبتدی طالب علم ہی کے نہیں، خدا جانے کتنے پڑھے لکھوں، پختہ کار دل لائق فائق زبان دانوں کے دل میں بس یہی رچا ہوا تھا! ادھر حالی کا نام آیا اُدھر کلام کی بے اثری، روکھے پن، پھیکے پن کی تصویر آنکھوں کے

سامنے پھر گئی!

بات دل سے نکلتے ہی نکلتے نکلتی ہے۔ اس ایک شعر سے ہوتا کیا ہے شعر ہو کیسا ہی بامزہ، ہے تو ایک ہی ــــ اور دو ایک بامزہ شعر کس کے ہاں نہیں ملتے؟ مشق کرتے کرتے، ادنیٰ سا ادنیٰ شاعر بھی دوچار شعر تو اچھے نکال ہی لاتا ہے۔ اچھا تو آج کی صحبت میں یہی نہ ہو، کہ ہم آپ مل کر دیوان حالی کے اوراق، اُلٹ پلٹ، اِدھر اُدھر سے دیکھ ڈالیں، عجب نہیں کہ کچھ اور چیزیں بھی ہاتھ آجائیں۔ اور یہ گھنٹہ پون گھنٹہ کی محنت رائیگاں نہ جائے!

دیوان کا صفحہ ۴۵ نکالیے۔ ردیف الف میں ایک مطلع یہ ملیگا۔

فطرت میں تیری صوفی، گر نور صفا ہوتا
تو سب سے ملا رہتا اور سب سے جدا ہوتا

اس غزل میں فرماتے ہیں۔

ہم وقت وداع اُن سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو روتے بھی تو کیا ہوتا

وداع و رخصت کے بڑے بڑے رقت انگیز مضمون آپ کی نظر سے گزر چکے ہوں گے، لیکن حسرت و یاس کی جو تصویر، اس رونے میں نہیں ہنسی میں دکھادی گئی ہے، اس کا بھی کوئی جواب ہے؟ اور پھر فرماتے ہیں۔

جو جان سے در گزرے وہ چاہے سو گزرے
گر آج نہ تم آتے، کیا جانیے کیا ہوتا!

عاشق کی جانبازی کے افسانے بھی سب دہراتے چلے آئے ہیں، لیکن اس "کیا جانیے کیا ہوتا" کے کنایہ کے اندر جو بات ہے وہ کسی تصریح کے بعد بھی پیدا ہونی ممکن ہے؟

ناصح اور عاشق کی مڈبھیڑ دنیائے شاعری کی بڑی پرانی حکایت ہے، حالی بھی ایک بار ملتے ہیں۔

جو دل پہ گزرتی ہے، کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

حالی نہ لڑتے ہیں نہ جھگڑتے۔ ایک آہ سرد بھر کر، صرف اتنا کہتے ہیں، اور کہہ کر چپکے ہو جاتے ہیں، کہ

کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا!

ناصح کو بے درد، بے حس، سب نے مانا ہے۔ یہاں عاشق کو اپنی داستانِ درد کی درد انگیزی پر اس درجہ اعتماد ہے کہ اس کے خیال میں وہ ناصح کے دل پر اثر کیے بغیر رہ نہیں سکتی۔ پتھر آخر کیسے موم ہو کر نہ رہے گا۔ کوئی فولاد اتنا گرم ہو بھی تو۔

"نشان نہ تھا"، "گمان نہ تھا" اس زمین میں بھی خوب گل بوٹے کھلائے ہیں۔

آتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا!

رونا یہ ہے کہ آپ بھی ہنستے تھے ورنہ یاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اُس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا

کہئے! خشک نظم نگاروں کا کلام ایسا ہی ہوتا ہے؟ اور آگے چلئے۔

بزمِ دشمن میں نہ جی سے اُترا ۔۔۔ پوچھنا کیا تری زیبائی کا

بدگمانی کے لیے تو غیر کا سایہ پڑ جانا بھی کافی ہوتا ہے۔ یہاں عین بزمِ رقیب میں، رونقِ محفل بنا ہوا دیکھتے ہیں، اور یہ کمال دلربائی ہے کہ جی پھر بھی نہ ہٹا! کمال اپنا نہیں، اپنے وفورِ عشق کا نہیں، تمامتر اُنھیں کا، انھیں کے حسن بے مثال کا۔ "پوچھنا کیا تری زیبائی کا"! گویا جمال بھی انھیں کا، اور کمال بھی انھیں کا۔

غالب کا مشہور مطلع ہے۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

یہی زمزمہ ذرا حالی کی زبان سے سنئے، اور واہ واہ کرتے رہ جائیے۔

تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں
ہر خارِ نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا!

تجلیات حق کہاں نہیں؟ دکھائی نہ دیں، تو قصور اپنی نظر کا ہوا، یا حسن نامحدود کا؟

شعر یہ کہا ہے، اور اپنی ساری متانت و ثقاہت کے باوجود حضرت زاہد کے دامن پر چھینٹے ڈالتے چلے گئے ہیں۔

جانی نہ قدر رحمت حق، پارسا نے کچھ
ٹھہرا قصوردار، اگر بے قصور تھا

زاہدوں کی قسمت میں تو مُژدہ ہی مُژدہ ہے۔ محض رحمت حق کا نزول ظاہر ہے کہ اُنھیں پر ہوگا، جو اپنی سیہ کاریوں کے باعث، حقدار اس رحمت کے ذرا سے بھی نہ ہوں گے!

شوخی اور طراری، درحقیقت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اور ظرافت کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں، کہ اُس کے ڈانڈے، عریانی وفحاشی سے مل جائیں۔ حالی شریف ہیں اور متین۔ اول بھی متین آخر میں بھی متین اور درمیان میں بھی متین۔ ذہانت شوخی، ظرافت، طنز، موجود ان کے ہاں سب کچھ، لیکن متانت کی شان سب پر غالب، گویا حضرت اکبر الہ آبادی کا پورا جواب۔ یہاں ہر منظر پر متانت کا پردہ پڑا ہوا، وہاں ہر چہرہ پر ظرافت کا غازہ لگا ہوا۔ انکا یہ رنگ، کہ روتے ہوئے کو بھی گدگداتے جاتے ہیں۔ ان کا یہ ڈھنگ کہ کسی کو ہنسی آئے بھی، تو پہلے اُس کے منھ پر رومال رکھا لیتے ہیں ایک

کے ہاں تمامتر شوخی و رنگینی، دوسرے کے ہاں ایک ذرا اُداسی اور غمگینی! ایک کے ہاں قہقہوں اور تالیوں کی چاٹ، دوسرے کے ہاں بات بات پر ادب اور قاعدہ کا لحاظ۔ ایک کی مجلس طرب افروز، دوسرے کی صحبت سبق آموز۔ اُن کے دسترخوان پر شراب و کباب ان کے دواخانہ میں یخنی اور عرق گلاب۔

باتیں سب عاشقوں والی کہے جاتے ہیں، لیکن وہی۔

نالہ رکتا ہوا تھمتی ہوئی فریاد رہے!

زبان سے جو بول ادا ہوتا ہے، نیچی نظروں، شرمیلی نگاہوں کے ساتھ۔ لغزش مستانہ کے بجائے، ہر قدم سلامت روی کی تصویر لیکن کلام میں حلاوت اس درجہ کہ پڑھتے جائیے، اور دل ہی دل میں مزے لیتے جائیے۔

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائیگا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائیگا

مطلع تو معمولی ہے۔ لیکن آگے گلکاریاں ملاحظہ ہوں۔

تم کو ہزار شرم سہی، مجھ کو لاکھ ضبط
اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائیگا

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے
پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا

ذرا حالی کی کم گوئی ملاحظہ ہو۔ کچھ نہ کہنے پر سب کچھ کہہ جاتے ہیں۔ رات کے نہ ملنے کی وجہ ظاہر ہے، وعدہ تھا کس سے اور پورا جا کر کہاں ہوا! وہی "ہر کجا می نماید کجا می زند" کی پرانی داستان۔ کوئی دوسرا شاعر ہوتا، تو کھل کھیلتا، اور "معاملہ" کے پہچان جانے کی علامتیں خدا جانے کیا کیا بیان کر جاتا۔ ایک حالی کی متانت ہے کہ صراحت الگ رہی کسی اشارہ کے بھی روادار نہیں۔ وہی نیچی نگاہیں، اور زبان پر صرف اسقدر کہ
"پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائیگا!"

ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر
کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائیگا

یہاں اُستاد مومن کا بھی ایک مطلع یاد کر لیجئے ــــ

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

خاکساری کے مضامین آپ نے بارہا سنے ہوں گے۔ کیسی کیسی نازک خیالیاں اس میں صرف ہو چکی ہیں۔ اور تعلّی تو ہمارے حضرات شعراء کی گویا جاگیر ہی ہے۔ اب ذرا دیکھئے کہ اُردو کا واعظ شاعر، ان دونوں اضداد کو کس بلاغت سے جمع کرتا ہے، اور ایک مختصر سے شعر کے

اندر، کس نادر اور اچھوتے انداز سے تعلی سے خاکساری پیدا کر رہا ہے
اور خاکساری سے تعلی نکال رہا ہے۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا　　خاکساری اپنی کام آئی بہت!

بیت الغزل سن چکے، تو اب مطلع اور ایک آدھ شعر اور بھی ملاحظہ
میں آجائیں۔

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینھ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت

آرہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

کہیے، اب یہی حالی وہی نرے کھرّے واعظ رہے؟ وہی خشک
اور بے مزہ، پھیکے اور بے اثر، نظم گو رہے؟ اور پھر اس غزل کے
معاً بعد یہ غزل۔

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت نہ وہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

واعظو آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

مقطع سے متعلق ایک لطیفہ، مولانا شبلی کی زبان سے سنا ہوا عرض کرنے کی اور اجازت دیجئے، علی گڑھ کے طلب علموں کی شوخیاں سارے زمانے میں مشہور رہیں۔ حالی کی یہ غزل جب اوّل بار شایع ہوئی تو کالج کے ایک نوجوان داؤد احمد امروہی مرحوم کو اس پر تضمین کی سوجھی سننے کے قابل مقطع کا بند ہے۔

چاہیے جب کہ ارادہ کرے کوئی انساں
دیکھ لے خوب کہ ہے شوق وہ اس کے شایاں
سن کے لوگوں سے کہ آئے تھے وہ داؤد کے ہاں
اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

تعزیر جرم عشق والا شعر، شروع مضمون میں عرض ہو چکا اب دو شعر اور اسی غزل کے پیش ہیں۔

گر درد دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا
آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد

مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر
بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

عاشقی میں بجز رسوائی اور بدنامی کے اور رکھا کیا ہے۔ عاشق کا کمال یہ ہے کہ وہ زمانے بھر کی رسوائی سے مغموم نہیں ہوتا، بچنا نہیں چاہتا۔ الٹا خوش ہوتا، اور اس کی طلب و تلاش میں نکلتا ہے! معرفت کے رنگ میں یہ مطلع چھوڑتے نہیں بنتا۔

ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر　　وہی اصرار ہے خطاؤں پر!

اکبر نے بھی ایک مصرع میں یہی مضمون ادا کیا ہے۔

اُسی کی عظمت سے کوئی خائف، اسی کی رحمت پہ کوئی غافل!

شاعر اُردو کے تھے، لیکن کہیں کہیں عربی مصرعہ اس بے تکلفی، سلاست اور برجستگی کے ساتھ لگا گئے ہیں، کہ جیسے شعر اپنی ہی زبان میں کہہ رہے ہیں۔

یاد میں تیری سب کو بھول گئے
کھو دیے ایک دکھ نے سب امراض
دیکھئے تو بھی خوش ہے یا ناخوش
اور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض

کہتے کہتے، کہتے ہیں۔

لا اُبالی بِاَن یَّغا تبنی　　کُلّ ناسٍ دَّ انت عَنّی رَاضٍ

یہ وہی مضمون ہے، جسے محمد علی جوہر اپنے رنگ میں یوں باندھ

گئے ہیں۔

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

ایک اور عربی مصرعہ اسی غزل میں۔

ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزاع   ہل لنا فی نزاعنا من قاض

لیجئے دیوان کی جلدی جلدی ورق گردانی کرتے کرتے ہم اب، ردیف میم تک پہنچ گئے ایک غزل پر نظر جم کر رہ گئی۔ معاملہ بندی کی ساری نزاکتوں کے ساتھ ساتھ یہ متانت، یہ احتیاط، یہ ضبط، حالی ہی کا حصہ ہے۔

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشق بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

جنت میں تو نہیں اگر اے زخم تیغ عشق
بدلیں گے تجھ کو زندگی جاوداں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کے طرز بیاں سے ہم

یہ اشعار اگر حالی کے دیوان سے نکال کر، مومن یا شیفتہ کے دیوان میں لگا دئے جائیں تو کسی کو کچھ پتہ بھی نہ چلنے پائیگا۔؟

"گرانیاں ہیں" "کہانیاں ہیں" والی غزل اس زمانے کی ہے جب حالی شاعر، حالی واعظ کے قالب میں آچکے تھے۔ اس پر بھی ذیل کے دونوں شعر دیکھئے۔ شعر کی زمین ہے کہ آسمان سے باتیں کر رہی ہے۔

کہتے ہیں جس کو جنت وہ اک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگین بیانیاں ہیں

روتے ہیں چار ہم پر، ہنستے ہیں چار ہم پر
یاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں

غزلوں کے متفرق اشعار کثرت سے گزر چکے۔ اب ایک پوری غزل نمونہ کے طور پر ملاحظہ میں آجائے، کہ انتخاب اشعار میں بددیانتی کا شبہ نہ رہے۔ فرماتے ہیں، اور ہر ہر شعر پر پڑھنے والے سے داد وصول کیے جاتے ہیں۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کہاں

ہیں دور جام اول شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھئے ہم کو سحر کہاں

یارب اس اختلاط کا انجام ہو بہ خیر
تھا اس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں

اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

بس ہو چکا بیان، کسل و رنج راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں

کون و مکاں سے ہے دل وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

حالی نشاط نغمۂ و مے ڈھونڈھتے ہو اب
آئے ہو وقت صبح، رہے رات بھر کہاں

غزل نو شعر کی ہے۔ مراتب کا فرق یقیناً ان کے درمیان ہے لیکن فرمائے، اس میں پست و لغو شعر، نکال ڈالنے کے قابل کون سا ہے؟ کلام کی وخشکی، اگر اسی کا نام ہے، تو آخر، تری، کے نمونے کہاں ملیں گے؟ ردیف "رے" میں دو مختصر غزلیں گمان رہے، نشان رہے، کی زمین میں ہیں۔ اس زمین کے متعدد شعر ایسے صاف اور ڈھلے ہوئے ہیں کہ بے تکلف زبانوں پر چڑھ گئے ہیں، اور تحریروں و تقریروں میں کثرت سے استعمال ہونے لگے ہیں۔

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اس کی کاٹتے رہے اور ہم زباں رہے

دیر و حرم کو تیرے فسانوں سے بھر دیا
اپنے رقیب آپ رہے ہم جہاں رہے

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

دریا کو اپنے موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حسن قبول اگر ایسے کلام کو حاصل ہو جائے، تو اس پر حیرت کیوں کی جائے۔ مغز و معنی سے قطع نظر، سلاست، شستگی، روانی، بے ساختگی، کسی حیثیت سے بھی یہ کلام کسی بلند سے بلند نمونہ سے پست ہے۔؟

کہنے والوں نے کہا ہے کہ حالی جب تک قدیم رنگ پر قائم رہے، اچھی اچھی غزلیں کچھ نہ کچھ بہرحال نکالتے ہی رہے، مگر جب سے جدید رنگ پر پڑ گئے اپنی شاعری کو غارت کر کے رکھ دیا۔ یہ قول کسی حد تک تو شاید صحیح ہو، لیکن تمام تر صحیح تو یقیناً نہیں۔ ابھی ابھی جو جو نمونے کلام کے گزر چکے، ان میں اگر دس شعر دور قدیم کے تھے، تو چار دور جدید کے بھی۔ دونوں میں کوئی فرق و امتیاز مطلق محسوس نہیں ہوتا کلام جدید کے بہت سے نمونے اوپر گزر چکے، اب دو چار شعر اس دور کی ایک اور غزل کے ملاحظہ ہوں۔

جنوں کار فرما ہوا چاہتا ہے   قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے

بہت کام لینے تھے جس دل سے ہمکو — وہ صرفِ تمنا ہوا چاہتا ہے

ندرت قافیہ ملاحظہ ہو۔

وفا شرطِ الفت ہے لیکن کہاں تک — دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے
غمِ اشک کو تلخ سمجھے تھے ہمدم — سو وہ بھی گوارا ہوا چاہتا ہے
فزوں تر ہے کچھ ان دنوں ذوقِ عصیاں — درِ رحمت اب وا ہوا چاہتا ہے

خشکی اگر متانت بیان ہی کا دوسرا نام ہے، تو یقیناً یہ اشعار بھی خشک ہیں۔ لیکن اگر متانت بیان عیب نہیں ہنر ہے، تو خدارا کوئی بتائے کہ خشکی کا اطلاق ایسے کلام پر کس طرح کیا جائے؟

غزلیات کا حصہ اب اچھا خاصہ ہو چکا۔ عجیب نہیں کہ اہلِ بزم مقالہ نگار کی آشفتہ بیانی و ژولیدہ نگاری سے افسردہ و ملول ہو چلے ہوں اس لیے اب صرف ایک غزل اور اسی دورِ جدید کی سن کر یہ ورق الٹ دیجئے۔

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے
آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے

اے دل اب آزمائش تقدیر کا ہے وقت
وہ امتحانِ تیزیٔ شمشیر کر چکے

کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے

بھولے رہے تصورِ مژگاں میں چند روز
دیکھا تو دل کو ہم ہدفِ تیر کر چکے

دل لیکے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ
گویا کہ اک جہاں کو تسخیر کر چکے

حالی اب آؤ پیرویِ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

اور تو جو کچھ ہے، خیر ہی ہے، خود شوخی کے نمونوں سے یہ کلام کب خالی ہے؟ تیسرے شعر کے اندر لطیف شوخی کی جو کیفیت ہے اُسے لفظوں میں کوئی کیوں کر بیان کر ڈالے؟ بس بات کیا ہے۔ وہی کہ نرم مخملیں پنجہ، آہنی دستانہ کے اندر چھپا ہوا! شوخی حدود متانت سے قدم باہر نہیں نکال سکتی اور اپنی لطیف ترین صورتوں ہی میں محدود رہ جاتی ہے۔

قلم کا مسافر اب ذرا دم لے۔ شعراب ایک آدھ نہیں رہا، دس بیس بھی نہیں، سو پچاس شعر ہو چکے۔ کوئی تیر، کوئی نشتر۔ اب بھی اس کلام سے وہی بدگمانی چلی جائیگی کہ خشک اور نرا واعظانہ ہے؟ خیال اب بھی یہی قائم رہیگا کہ حالی غزل گوئی میں ہیٹے ہیں؟ غالب اور مومن اور شیفتہ آسمان شعر کے آفتاب و ماہتاب ہوئے ہیں انھیں کے معیار پر کسیئے، جانچ لیجئے، پرکھ لیجئے۔

یہ سب کچھ ہے، لیکن اس پر بھی حالی کا اصلی میدان، غزل کا میدان نہیں۔ اُن کی شاعری "واہ" کی نہیں "آہ" کی ہے، جوش و ولولہ کی نہیں، حزن و حسرت کی ہے۔ نو عمری میں جو کچھ بھی رہے ہوں، لیکن عمر کی پختگی کے بعد تو گُل و بلبل کے افسانے چھوڑ، اور زلف و ابرو کے جنجال سے نکل، بس "قوم" کے ہو رہے تھے، اور اب وہ تھے، اور قوم کے اقبال کا ماتم۔ ساز کوئی سا بھی ہوتا، نغمہ یہی ایک نکلتا! کسی بڑے سے بڑے زندہ دل ظریف کا جوان، چہیتا بیٹا، آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہا ہو، اُس وقت باپ کے دل پر کیا گزر کر رہے گی؟ منھ قہقہوں کے لیے کھلے گا، یا آہ و بکا کے لیے؟ زبان پر حسرت و یاس کے کلمے ہوں گے، یا کوئی نئی پھبتی سوجھیگی؟ — بس جو حال ہمارا آپ کا، ساری دنیا کا، بیٹوں کے لیے، بھائیوں کے لیے رہتا ہے، حالی کا وہی حال ساری اُمت اسلامیہ کے لیے۔ ساری ملت کے لیے، ساری قوم کے واسطے تھا۔ یہی حال ان آنکھوں نے بہت بعد کو، مشہور قومی لیڈر محمد علی جوہر کا دیکھا۔ فرق یہ تھا، کہ محمد علی کے ہاں طبیعت میں غضب کی تیزی تھی۔ حالی کے ہاں آہ سرد بھی آئین و ضابطہ کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی۔ ایک کے ہاں تمامتر جوش اور شوریدگی، دوسرے کے ہاں ضبط و تحمل سے ملی ہوئی سنجیدگی۔ محمد علی جدھر سے گزرتے، ایک عالم تہ و بالا کر دیتے حالی دلوں میں اندر حزن و غم کی پھانس چبھو کر رہتے۔ محمد علی چیخیں مار مار کر خود روتے ہیں، بین اس غضب کے کرتے ہیں، کہ سننے والوں کو

رُلا مارتے ہیں۔ حالی سر جھکائے۔ چپکے چپکے بیٹھے کلمہ پڑھتے جاتے ہیں کبھی کبھی ٹھنڈی سانسیں، اور جب آنکھیں بے اختیار نم ہونے لگتی ہیں، تو جھٹ جھٹ آنسو پونچھ ڈالتے ہیں۔

طبیعت پر حسرت، اداسی اور غمگینی مستقل طور پر غالب ہوگئی تھی جو بات بھی منہ سے نکلتی، درد کی کسک سے خالی نہ ہوتی۔ دہلی کے طبیب اعظم، حکیم محمود خاں کا مرثیہ لکھنے بیٹھے، تو لگے بجائے فرد کے قوم کا ماتم کرنے۔ غم نصیب، ماتم زدہ بوڑھیوں کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ کہ جب دل پر تازہ داغ کھاتی ہیں، تو معاً پچھلے داغ بھی تازہ ہو جاتے ہیں، بین اپنے وآج، ہی پر نہیں، گزرے ہوئے 'کل'، اور بھولے بسرے ہوئے، 'پرسوں' پر بھی کرنے لگتی ہیں۔ حالی کا سینہ بھی داغوں سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ محمود خاں کے مرثیہ کے آخری بند ملاحظہ ہوں، اپنے سارے مذاق طبیعت کی تصویر ہی خود ہی کر دی ہے۔ پڑھتے جائیے اور کلیجہ تھامے ہوئے سرد آہیں بھرتے جائیے۔ البتہ دل کا درد مند ہونا شرط ہے۔

اک زمانہ تھا کہ تھا ہم سے موافق روزگار\
اہل علم و فضل و دانش کا نہ تھا ہم میں شمار\
ایسے حاصل خیز دنیا میں نہ ہونگے کشت زار\
جیسے مردم خیز تھے اسلام کے شہر و دیار\
مرتا تھا کامل تو کامل نظر آتا تھا یاں\
سورج آتا تھا نکل جب چاند چھپ جاتا تھا یاں

شاید اب پہنچی ہے ہم میں نوبت قحط الرجال
ایک اُٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال

دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اُس کی مثال
ذات باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بے مثال

ظاہر اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخنور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی

داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی
اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی

گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدہ پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم

نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم
کوئی یاں رنگین ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم

سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

"ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا" اس ایک مصرع میں

واعظ شاعر کی پوری آپ بیتی آگئی ۔

یہ نہ تھا کہ ظرافت کر نہیں آتی تھی ۔ طنز تو ایسا کر جاتے اور اس کثرت سے کر گئے ہیں کہ ہمارے رشید صدیقی صاحب ، اگر طنزیات حالی کو جمع کرنے پر آجائیں ، تو اپنے 'طنزیات و مضحکات' کا اچھا خاصہ ایک نیا حصہ تیار کر لے جائیں ۔ لیکن وہی متانت کا طبعی رنگ ظرافت پر بھی چھایا ہوا ہے ۔ کھل کھلا کر ہنسنا تو جانتے ہی نہیں ۔ جب دوسروں کو ہنسانا چاہتے بھی ہیں ، تو خود محض زیر لب مسکرا کر رہ جاتے ہیں ۔ گوروں اور کالوں کی قسمت کے فرق کا تماشا اسی اپنے وطن کی سرزمین پر آپ بارہا دیکھ چکے ہوں گے ، اب ذرا ایک یہ منظر ' مرقع حالی میں بھی دیکھتے چلئے ۔

دو ملازم ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل ، مگر پہلا سوار رہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونوں رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونوں خواستگار
راہ میں دونوں کے باہم ہوگئی کچھ ہشت مشت
کوکھ میں کالے کی اک مکا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلی کو بہت مسکین کی
آکے گھوڑے سے لیا سائیس نے اس کو اتار

ٹھونک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہنچ جا کے دونوں پیش و پس
ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آکے دونوں کی سنی جب سرگزشت
تہہ کو جا پہنچا سخن کی سن کے قصہ ایک بار
دی سند گورے کو لکھ، تھی جس میں تصدیق مرض
اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکّے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار
ایک کالا پٹ کے گورے سے جو فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اُس کی بیماری کا کیوں کر اعتبار

اب کون ایسا بے انصاف ہوگا، جو اس کے بعد بھی حالی کی خشک نگاری کا شکوہ سنج رہے چلا جائیگا؟

مشاعرے کی محفل گرم ہے، بڑے بڑے کاملین فن جمع ہیں۔ دہلی کے دور آخر کے اُستادوں کا مجمع ہے۔ لوگ منتظر ہیں کہ غالب و شیفتہ

کے شاگرد رشید کی زبان سے کوئی پھڑکتی ہوئی مزیدار سی غزل سننے میں آئے گی، رندی و ہوسنا کی روح تازہ ہو جائے گی۔ نفس کو ایک نئی زندگی ہاتھ آجائے گی۔ شاعر کا منھ کھلا، تو یک بیک یہ معلوم ہوا کہ مشاعرہ کا کمرہ کیا ہے، گویا مجلس عزا ہے، اور غزل نہیں، نوحہ پڑھا جا رہا ہے۔ اگلے پیارے سب ایک ایک کرکے یاد آرہے ہیں اور نام لے لے کر دل کی بھڑاس نکالی جا رہی ہے۔ نوحہ آج بھی دل والوں کے لیے موثر ہے، چالیس پچاس برس پیشتر جیسا کچھ رقت انگیز رہا ہوگا، ظاہر ہے خصوصاً جس وقت قدردانوں کے بھرے مجمع میں خود مصنف کی زبان سے ادا ہوا ہوگا۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
ڈھونڈھتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور، ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینہ پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا اُن پہ جہاں روتا ہے
ان کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغ و مجروح کو سُن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

آج اگر ہمارے آپ کے آنسو نہیں نکلتے تو ہمیں دہلی مرحوم کے ماضی کا احساس ہی کب ہے؟ آنکھوں میں تو اب نئی دہلی، بسی ہوئی ہے، راے سینا کے آگے شاہجہاں آباد کو پوچھتا کون ہے؟ وائسریگل لاج کے سامنے، لال قلعہ کو جھانکنے ہی کون جاتا ہے؟ اور شیکسپیئر اور ملٹن کے ہوتے، غالب و شیفتہ کی قدر رہی کس کے دل میں؟ افسانۂ ماضی کو تو ہم ماضی کے حوالہ کر ہی چکے، اب رونا آئے بھی، تو کس بات پر؟ باپ اور بھائی کی تازہ میت پر سب روتے ہیں، بھولے بھالے ہوئے پر دادا اور نگر دادا پر آنسو نکلتے کس کے دیکھے ہیں؟

"مسدس"، فرط شہرت سے محتاج نہ کسی تعریف کا نہ کسی تعارف کا، نہ کسی نئی مدح و توصیف کا، نہ کسی جدید نقد و تبصرہ کا۔ ایک داستان درد شروع سے آخر تک ہے۔ آخر میں بہ طور ضمیمہ ایک قصیدہ لگا ہوا ہے شاعر مسلمان ہے اور مسلمان کی حیثیت سے، اسلام اور مسلمانوں کا

حال زار، دربار رسالت میں عرض کر رہا ہے۔ اس عرض و معروض میں 'اللہ اکبر'، کس قدر اخلاص ہے اور کس قدر نیاز۔ کس درجہ تعلق خاطر ہے، اور اصلاح حال کے لیے کس درجہ اضطرار؟

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

۱۰، ۲۰ شعروں میں اپنے 'حال' کا عبرت انگیز مقابلہ اپنے ماضی سے کرتے چلے گئے ہیں اس کے بعد کہتے ہیں۔

گو قوم میں تیرے نہیں اب کوئی بڑائی
پر نام تری قوم کا یاں اب بھی بڑا ہے
ڈر ہے کہیں یہ نام بھی مٹ جائے نہ آخر
مدت سے اُسے دَورِ زماں میٹ رہا ہے

آگے پھر وہی مد و جزر، اقبال و زوال کی داستان سرائی ہے۔ لیکن پھر سنبھلتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اس میں شکوہ کس کا اور شکایت کس کی؟

جو کچھ ہے وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت
شکوہ ہے زمانہ کا نہ قسمت کا گلا ہے

مزید عرض حال کے بعد پھر فریاد شروع ہوتی ہے۔

اے چشمۂ رحمت بابی انت و اُمی
دنیا پہ ترا لطف سدا عام رہا ہے
جس قوم نے گھر اور وطن تجھ سے چھڑایا
جب تو نے کیا نیک سلوک اُن سے کیا ہے

اس متن کی تھوڑی سی شرح کے بعد، پھر متوجہ ہوتے ہیں -

برتاؤ ترے جبکہ یہ اعدا سے ہیں اپنے
اعدا سے غلاموں کو کچھ اُمید سوا ہے
امت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن دلدادہ ترا ایک سے ایک ان میں سوا ہے

اُمت کا جو تعلق رسول کے ساتھ ہے، اس کا مقابلہ دنیا کا کوئی تعلق کر سکتا ہے؟

جو خاک ترے در پہ ہے جاروب سے اُڑتی
وہ خاک ہمارے لیے دارو ے شفا ہے
جو شہر ہوا تیری ولادت سے مشرف
اب تک وہی قبلہ تری اُمت کا رہا ہے
جس شہر نے پائی تری ہجرت سے سعادت
کعبہ سے کشش اُس کی ہر اک دل میں سوا ہے

آخر میں دل کھول کر سامنے رکھ دیتے ہیں -

ہم نیک ہیں یا بد ہیں پھر آخر ہیں تمھارے
نسبت بہت اچھی ہے اگر حال برا ہے

خود جاہ کے طالب ہیں نہ عزت کے ہیں خواہاں
پر فکر ترے دین کی عزت کی سدا ہے
گر دین کو جوکھوں نہیں ذلت سے ہماری
اُمت تری ہر حال میں راضی برضا ہے
عزت کی بہت دیکھ لیں دنیا میں بہاریں
اب دیکھ لیں یہ بھی کہ جو ذلت میں مزا ہے

اس منزل پر پہنچکر معاً یاد پڑ جاتا ہے کہ موقع نازِ یوسفی کا نہیں نیاز یعقوبی کا ہے۔

ہاں حالی گستاخ نہ بڑھ حد ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے
ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب
یاں جنبش لب خارج از آہنگ خطا ہے

یہ دل کی شاعری اُس کی تھی، جس کے محض ایک خشک وعظ گو ہونے کا ڈھنڈھورا کس بیدردی کے ساتھ ایک عالم میں پٹ گیا تھا۔

واعظ شاعر کی عام وعظ گوئی اور عام شاعری کے نمونے آپ نے دیکھ لیے۔ غزلیات کے حصہ کو چھوڑ کر باقی شاعری ایک مسلمان شاعر کے دل کی آواز تھی۔ ماتم تمامتر زوال اُمت اسلامیہ کا، مصوری تمامتر جذبات ہی کی۔ اب ختم صحبت پر، ایک نظر حالی کی انسانی شاعری پر

بھی ہو سکے تو بہتر ہے۔ انسانی شاعری، اسلامی شاعری سے الگ اور متغائر کوئی چیز نہیں، اسی کے بلند ترین مقام کا نام ہے۔ بندہ اور پروردگار کے تعلق سے بڑھ کر وسیع عالمگیر تعلق اور ہو کیا سکتا ہے؟ شاعر نے جب براہ راست رب العالمین سے آہ و فریاد شروع کر دی، اور شاعری میں قیود و تعینات کی جگہ، وحدت مطلق نے لے لی، بس وہیں سے انسانی شاعری شروع ہو گئی۔ یہ ہیچمداں تو یہ عرض کریگا کہ حالی نے عمر بھر بجز ایک "بیوہ کی مناجات" کے، اگر ایک شعر بھی نہ کہا ہوتا، تو اُن کے لیے یہی ایک نظم دنیا و عقبیٰ دونوں میں بس تھی۔ باتیں اتنی سچی اور روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی کہ آسمان کے فرشتے بھی وجد میں آ آ کر رہیں۔ بول اتنے میٹھے کہ خود معصومیت، بے اختیار لپٹ لپٹ کر بلائیں لینے لگے۔ ذرا سنیے لیکن سننے سے قبل دل کو خوب مضبوطی سے تھام لیجیے۔

اے سب سے اول اور آخر — جہاں تہاں حاضر اور ناظر
اے بالا ہر بالا تر سے — چاند سے سورج سے امبر سے
سب سے انوکھے سب سے نرالے — آنکھ سے اوجھل دل کے اُجالے
ناؤ جہاں کی کھینے والے — دکھ میں تسلی دینے والے
جب اب تب تجھسا نہیں کوئی — تجھ سے سب تجھسا نہیں کوئی
بید، نرا سے بیماروں کا — گاہک منددے بازاروں کا
سوچ میں دل بہلانے والا — بپتا میں یاد آنے والا

حمد باری صدہا بار آپ سن چکے ہوں گے، اتنی سادہ، اتنی

معصومانہ، ساتھ ہی اتنی موثر حمد کا کوئی جواب، دوسری زبانوں کی تو خبر نہیں، لیکن اُردو کے خزانے میں کہیں ہے؟

اے اٹکل اور دھیان سے باہر — دھیان سے اور پہچان سے باہر
عقل سے کوئی پا نہیں سکتا — بھید ترے حکموں میں ہیں کیا کیا
ایک کو تو نے شاد کیا ہے — ایک کے دل کو داغ دیا ہے
کھیتی ایک کی ہے لہراتی — ایک کا ہر دم خون سکھاتی
حال غرض دنیا کا یہی ہے — غم پہلے اور بعد خوشی ہے
رنج کا ہے دنیا کے گلا کیا — تحفہ یہی لے دیکھ ہے یاں کا

مناجاتیں آپ نے بہتوں کی سنی ہوں گی۔ بڑے بڑے عابدوں زاہدوں کی سنی ہوں گی۔ اب فریاد اس بے کس و بے بس، بے آس اور نامراد دکھیارِی کی بھی سنتے چلیے۔

یاں نہیں بنتی رنج سہے بن — رنج نہیں سب ایک سے لیکن
تو ہی اگر انصاف لے مرے مولا — کون ہے جو بے آس ہے جیتا
خواہ دکھی ہے خواہ سکھی ہے — جو ہے اِک اُمید اس کو بندھی ہے
کھیتیاں جنگی کھڑی ہیں سوکھی — آس وہ باندھے بیٹھے ہیں مینھ کی
ایک ہے اس اُمید پہ جیتا — اب ہوئی بیٹی اب ہوا بیٹا
پر نہیں اُٹھ سکتی وہ مصیبت — آئیگی جس کے بعد نہ راحت
شاد ہو اُس رہ گیر کا کیا دل — مر کے کٹیگی جس کی منزل
اُن اُجڑوں کو کل پڑے کیونکر — گھر نہ بسیگا جن کا جنم بھر

آگے بڑھنے سے قبل، اگر خدانخواستہ آپ کے قرب وجوار میں کوئی بپتا کی ماری نوجوان بیوہ ہو تو اس کا تصور ذہن میں جما لیجئے۔ نوعمری کا زمانہ شوخی و شرارت کا ہوتا ہے۔ کھیلنا، کھانا، دوڑنا بات بات پہ ہنسنا ہنسانا۔ ماں باپ نے بیاہ کس شوق، کس خوشی سے رچایا۔ ہاتھوں پیروں میں مہندی لگی، نئے نئے زیور گہنے، طرح طرح کی رنگینیاں نت نئی شوخیاں دل میں کیسے کیسے ارمان بھرے ہوئے نظروں میں کیا کیا نقشے جمے ہوئے! اتنے میں یک بیک یہ سب غائب! سارا منظر محض خواب وخیال! یہ ہاتھ اب عمر بھر چوڑیوں کو ترسیں گے، یہ کپڑے اب کسی خوشبو سے آشنا نہ ہوں گے! اور یہ دل! ہائے کیا ہے، کیا ہو کر رہ گیا! دنیا اپنے عیش میں مصروف محلہ میں شادیوں کی دھومیں خاص اپنے گھر میں برسات کی ملاریں۔ جھولے پڑ رہے ہیں کھیل پر کھیل ہو رہے ہیں۔ ساتھ کی کھیلنے والیاں، ساتھ کی مانگی بیاہی ہوئیں، نئی نئی ساڑیاں باندھے، شوخ رنگ کے کپڑے پہنے کیسے کیسے طرحدار ڈوپٹے اوڑھے، انھوں نے سامنے لوٹی ہنس رہی ہیں، اور ایک مصیبت کی ماری ہے۔ جلی ہے کہ اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔

آئیں بہت دنیا میں بہاریں | عیش کی گھر گھر پڑیں پکاریں
پڑے بہت باغوں میں جھولے | ڈھاک بہت جنگل میں پھولے
گئیں اور آئیں چاندنی راتیں | برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہر گز نہ کھلے گی | وہ جو کلی مرجائی تھی دل کی
آس ہی کا یاں نام ہے دنیا | جب نہ رہی یہ ہی تو رہا کیا

ستم ہے تیرے پر نہیں چارا   کڑوی میٹھی سب ہے گوارا
تجھ سے کہیں کر بھاگ نا چاہیں   بندھیں چاروں کھونٹ کی راہیں
تو مارے اور نوازے   پڑی ہوں میں تیرے دروازے
تجھی کو اپنا جانتی ہوں میں   تجھ سے نہیں تو کس سے کہوں میں

سہیلیاں زیوروں سے لدی ہوئی ہیں، کس شوق سے، کس چاؤ سے ایک دوسرے کو اپنے اپنے زیور دکھائے جا رہے ہیں۔ ہاتھوں میں مہندیاں رچی ہوئی ہیں۔ پھولوں کے گہنے سر اور گلے کو زینت دے ہوئے ہیں۔ نازک نازک بدن عطر کی خوشبوؤں سے مہک رہے ہیں۔ کہیں ذکر میاں کی اچاہ پیار کا ہو رہا ہے۔ کہیں تذکرے سسرال کی ناز برداریاں کے ہو رہے ہیں۔ کہیں کسی پر فقرے کسے جا رہے ہیں۔ قہقہوں کا غل ہے، رنگ رلیاں منائی جا رہی ہیں۔ ادھر ایک بیچاری، اللہ کی بندی ایسی ہے جس کے ہاتھ بھی ننگے، کان بھی، جسم رنڈاپے کی سفید چادر سے چھپا ہوا ہے۔ سن اس کا بھی آخر وہی ہے، کیا اس کے دل میں کوئی ارمان نہیں رہا ہے؟ اس کا قلب اُمنگوں سے، حوصلوں سے ولولوں سے خالی بنایا گیا ہے؟ کیا اس دکھیاری کا جی نہیں چاہتا کہ اس کا بھی ناز بردار ہوتا؟ یہ بگڑتی اور کوئی ہنساتا؟ یہ اٹھتی اور کوئی گدگداتا؟ یہ مچلتی اور کوئی مناتا؟ یہ فرمائشیں کرتی، اور کوئی دل و جان سے انھیں پوری کر کے دیتا؟ روتی جاتی ہے اور کہتی جاتی ہے۔

اے میرے زور اور قدرت والے   حکمت اور حکومت والے

میں لونڈی تیری دکھیاری — دروازے کی تیری بھکاری
موت کی خواہاں جان کی دشمن — جان پہ اپنی آپ اجیرن
اپنے پرائے کی دھتکاری — میکے اور سسرال پہ بھاری
بیاہ کے دم پائی نہ لینے — لینے کے یہاں پڑ گئے دینے
ایک خوشی نے غم یہ دکھائے — ایک ہنسی نے گل یہ کھلائے
رو نہیں سکتی تنگ ہوں یاں تک — اور روؤں تو روؤں کہاں تک
دن بھیانک اور رات ڈرانی — یوں گزری یہ ساری جوانی
بہنیں اور سہیلیاں میری — ساتھ کی تھیں جو کھیلیاں میری
مل نہ سکیں جی کھول کے مجھ سے — خوش نہ ہوئیں ہنس بول کے مجھ سے
جب آئیں رو دھو کے گئیں وہ — جب گئیں بے کل ہو کے گئیں وہ
آگ کھلی دل کی نہ کسی پر — گھل گئی جان اندر ہی اندر
دیکھ کے چپ جانا نہ کسی نے — جان کو پھونکا دل کی لگی نے
قوم میں وہ خوشیاں بیاہوں کی — شہر میں وہ دھومیں ساہوں کی
تہواروں کا آئے دن آنا — اور سب کا تہوار منانا
وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں — وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں
وہ گرمی کی چاندنی راتیں — وہ ارمانوں بھری برساتیں
کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں — خیر کٹیں جس طور سے کاٹیں
رہ گیا دیکر چاند دکھائی — چاند ہوا پر عید نہ آئی
رت بدلی پر ہوئی نہ برکھا — بادل گرجا اور مینھ نہ برسا

ریت میں ذرے دیکھ چمکتے   دوڑ پڑی ہیں جھیل سمجھ کے

حسرت نصیب اپنے دن سن کو دیکھتی ہے، اور آسمان کی طرف دیکھ کر رہ جاتی ہے! پھر بلک بلک کر اپنے اُسی مالک و مولی سے کچھ عرض کرنے لگتی ہے!—— آہ! جو کسک اُس کی آواز میں ہے، وہ بڑے بڑے مرتاض زاہدوں کو بھی کہاں نصیب؟ عمر بھر کی عبادتیں ریاضتیں، مشقتیں ایک طرف، اور ایک گھڑی کی یہ شکستگی، یہ بیچارگی، یہ اپنی بندگی کا مشاہدہ دوسری طرف! کہتی جاتی ہے، اور سننے والوں کے دل ہلا ہلا کر رکھتی جاتی ہے۔

اے دین اور دنیا کے مالک   اے راجا اور پرجا کے مالک
پورب، پچھم، دکھن، اُتر   بخشش تیری عام ہے گھر گھر
سب پر کھلا ہے در رحمت کا   برس رہا ہے مینھ نعمت کا
سب کو تیرے انعام تھے شامل   میں ہی نہ تھی انعام کے قابل
اگر کچھ آتا بانٹ میں میری   سب کچھ تھا سرکار میں تیری
تھی نہ کمی کچھ تیرے گھر میں   نون کی ترسی میں سانبھر میں
پھر دل یہ سوچتی ہوں جی میں   آئی تھی میں کیوں اس نگری میں
رہی اکیلی بھری سبھا میں   پیاسی رہی بھری گنگا میں
قسمت نے جب منہ نہ موڑا   آدمیوں کا ہو گیا توڑا
باپ اور بھائی چچا بھتیجے   سب رکھتی ہوں تیرے کرم سے

پر نہیں پاتی ایک بھی ایسا — جس کو ہو میری جاں کی پروا
تیرے سوا اے رحم کے بانی — کون سنے یہ رام کہانی
کوئی نہیں لاگو اب میرا — باپ نہ بھائی ساس نہ سسرا

شاعر کی تخئیل آرائی نہیں ہے۔ واقعات لکھ رہا ہے واقعات
کہتے ہیں کہ شاعر وہ ہے جو جھوٹ کو سچ بنا کر دکھائے۔ حالانکہ شاعری
کا سب سے بڑا کمال واقعہ نگاری ہے مشاہدات سے، واقعات سے
بڑھ کر موثر شے اور کون ہو سکتی ہے۔

روئیے تو سب روتے ہیں گھر کے — رونے نہیں دیتے جی بھر کے
ہنسئے تو ہنسنا عیب ہے ہم کو — کیونکر الٰہی کاٹیے غم کو
سو نچ میں میرے سارا گھر ہے — میرے چلن پر سب کی نظر ہے
مہندی میں نے لگانی چھوڑی — پی میں نے جانی چھوڑی
کپڑے مہینوں میں ہوں بدلتی — عطر نہیں ہیں بھول کے ملتی
سرمہ نہیں آنکھوں میں لگاتی — بال نہیں برسوں گندھواتی
دو دو چاند نہیں سر دھوتی — اٹھواروں کنگھی نہیں ہوتی
کان میں پتے ہاتھ میں کنگن — پہن چکی سب جب تھی سہاگن
آپ کو یاں تک میں نے مٹایا — پر دنیا کو صبر نہ آیا
وہم نے ہے اک ایک کو گھیرا — جب دیکھو تب ذکر ہے میرا

ان دکھیاریوں پر جو ظلم ابھی چند سال اُدھر تک ہو چکے ہیں،
اور بہت جگہ اب بھی جاری ہیں۔ کس سے مخفی ہیں؟ کن آنکھوں نے

وہ جگر خراش منظر نہیں دیکھے ہیں! کس کان نے وہ فریادیں نہیں سنی ہیں؟ ——— آن پر مٹ جانے والی، شرافت پر جان دینے والی کمسن بیوہ، اپنی عزت پر گواہ آسمان کے چھٹکے ہوئے تاروں، اور گھر کے دروں، دیواروں سب کو رلاتی ہے۔

اے امبر کے چمکتے تارو — اے گھر کے در اور دیوارو
اے جانی پہچانی راتو — تنہائی کی ڈرانی راتو
اک دن اس گندی دنیا سے — جانا ہے مالک کے آگے
جب وہاں پوچھ ہو میری تیری — تم سب دیکھو گواہی میری
میں نیکی کا دم نہیں بھرتی — پاکی کا دعویٰ نہیں کرتی
پر یہ خدا سے ڈر کے ہوں کہتی — منھ پر یہ آئے بن نہیں رہتی
خواہ بری تھی خواہ بھلی میں — بات سے اپنے نہیں ٹلی میں
ساتھ نہ قوم اور دیس کا چھوڑا — اور نہ خدا کے عہد کو توڑا
اے ایمان کے رکھنے والے — اے نیت کے پرکھنے والے
میں نہیں رکھتی کام کسی سے — چاہتی ہوں انصاف تجھی سے
حکم پہ چلتی تیرے اگر میں — چین سے کرتی عمر بسر میں
لیکن ہٹ پیاروں کی یہی تھی — مرضی غمخواروں کی یہی تھی
اپنے بڑوں کی ریت نہ چھوٹے — قوم کی باندھی رسم نہ ٹوٹے
جان کسی کی جائے تو جائے — آن میں اپنی فرق نہ آئے
تجھ پہ ہے روشن اے میرے مولا — دقت یہ کیسا مجھ پہ پڑا تھا

روکنے تھے حملے مجھے دل کے — تھا مجھے جینا خاک میں مل کے
آن سنبھالے جان تھی جاتی — جان بچائے آن تھی جاتی
طے کرنے تھے سات سمندر — حکم یہ تھا ہاں پانوں نہ ہو تر
کولہ چاروں کھونٹ تھا پھیلا — حکم یہ تھا پلو نہ ہو میلا
جان نہ سمجھا جان کو اپنی — دیا نہ جانے آن کو اپنی
اسے اچھے اور برے کے بھیدی — کھوٹے کے اور کھرے کے بھیدی
بھید دلوں کے جاننے والے — پاپ اور پُن کے پہچاننے والے
عیب اور گُن سب تجھ پہ ہیں روشن — پاپ اور پُن سب تجھ پہ ہیں روشن
کان اور آنکھیں ہاتھ اور بازو — جن جن پر تھا یاں مجھے قابو
سب کو بدی سے میں نے بچایا — سب کو خودی سے میں نے ہٹایا
روک کے اور یوں تھام کے آپا — میں نے یہ کاٹا اپنا رنڈاپا
دھوپ تھی تیز اور ریت تھی تپتی — مچھلی تھی اک اس میں تڑپتی
جان نہ مچھلی کی تھی نکلتی — اور نہ سر سے دھوپ تھی ٹلتی
تو ہے مگر اس بات کا دانا — میں نے کہا دل کا نہیں مانا
تھا منانا دل کا کام تھا میرا — اور تھامنا کام تھا تیرا
بگڑے اگر تو دل کی خطا پر — میں راضی ہوں تیری رضا پر

اپنی تو خیر جیسی بھی گزری، گزر گئی۔ اب دھیان ہے تو اس کا کہ
اور بہت سی بہنوں پر بھی یہی وقت پڑا ہوا ہے۔ ان بیچاریوں کی تو

مشکل کسی طرح آسان ہو۔ بندی اپنے چاہنے والے مالک اور مولا سے کہتی ہے۔

اے غمخوار ہر ایک بیکس کے — حامی ہر عاجز بیکس کے
ہے اپنے عاجز بندوں پر — پیار ترا ماں باپ سے بڑھکر
جس نے لگی میں تجھ کو پکارا — سامنے تیرے ہاتھ پسارا
پھرا نہ خالی اس چوکھٹ سے — گیا نہ پیاسا اس پنگھٹ سے
گھر بسنے کی آس نہ رہنی — ساری عمر جدائی سہنی
ہے وہ بلا جو سہی نہ جائے — بپتا ہے جو کہی نہ جائے
قدر اس کی یا تو پہچانے — یا جس پر گزری ہو وہ جانے
اے خاوند خداوندوں کے — مالک خاوند اور بندوں کے
واسطہ اپنی خداوندی کا — صدقہ اپنی خداوندی کا
تو یہ کسی کو داغ نہ دیجو — کسی کو بے وارث مت کیجیو
جس دکھیا پر پڑے یہ بپتا — کر اسے تو پیوند زمیں کا
یا عورت کو پہلے بلا سے — یا دونوں کو ساتھ اُٹھالے

اس سوز دل سے نکلی ہوئی دعائیں کہیں بالکل بے اثر رہ سکتی تھیں۔ کم از کم جہاں تک ہندی مسلمانوں کا تعلق ہے، رانڈوں کی بپتا اس وقت کے دیکھتے، یقیناً بہت کچھ ہلکی ہوگئی ہے۔ اور کچھ نہ کچھ اصلاح تو بہر حال ہمسایہ قوموں کی بھی ہو کر رہی ہے۔

خاتمہ پر واعظ شاعر نے وہی کہا ہے، جو آج تک سارے واعظ،

اور سارے حقیقی شاعر برابر کہتے چلے آئے ہیں۔ کیسی بیوگی اور کہاں کا سہاگ، نہ اِس کو قیام نہ اُس کو ثبات۔ ساری لذتیں فانی اور سارے عیش آنی۔ کسی کی پھولوں کی سیج پر لیٹ لیٹ کے گزری تو کیا، اور کسی نے کانٹوں پر لوٹ لوٹ کے کاٹی تو کیا، بشریت کا تقاضا تھا، جو زبان پر اتنی بھی حکایت و شکایت آگئی۔ پیار ہو تو اسی من موہن کا، جسے کبھی فنا نہیں۔ دل میں لگن ہو تو اُسی ایک کی، جس کا عہد کبھی ٹوٹنے والا نہیں، جس کی خاوندی کبھی ختم ہونے والی نہیں۔ بیوہ کی یہ مناجات واعظ شاعر کی وعظ گوئی اور شاعری دونوں کا نچوڑ ہے۔

دکھ سے یہاں کے گھبرانا کیا
سکھ پر یہاں کے اترانا کیا
عیش کی یاں مہلت ہے نہ غم کی
سب یہ نمائش ہے کوئی دم کی
آنی جانی چیز ہیں خوشیاں
چلتی پھرتی چھاؤں ہے ارماں
منگنی بیاہ برات اور رخصت
میل، ملاپ سہاگ اور سنگت
ہیں دو دن کے سب بہلاوے
آگے چل کر ہیں پچھتاوے

ریت کی سی دیوار ہے دنیا
اوچھے کا سا پیار ہے دنیا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے
اس نگری کی ریت یہی ہے
خواہ ہو رانڈ اور خواہ سہاگن
موت ہے سب کی جان کی دشمن
ایک ہے گو آج ایک سے بہتر
مر گئیں جب دونوں ہیں برابر
اور کوئی گر انصاف سے دیکھے
مر کے اُسے نسبت نہیں اس سے
عیش گئی وہ چھوڑ کے یاں سے
قید گئی یہ کاٹ کے یاں سے
اس کو پڑی کل اُس کی گئی کل
یہ گئی ہلکی وہ گئی بوجھل

شاعر کا آخری پیام وہی ہے، جو عارفوں کا ہمیشہ رہا ہے۔ یہ سوز کبھی اگر کسی دل میں آگ لگا کر نہ رہے تو یقیناً وہ دل نہیں ہے، پتھر کا ٹکڑا ہے

تیرے سوا یاں اے میرے مولیٰ
کوئی رہا ہے اور نہ رہے گا

پڑی تھی سونی جب یہ نگریا
تیری ہی تھی یاں کھڑی اٹریا
چاہتی ہوں ایک تیری محبت
اور نہیں رکھتی کوئی حاجت
گھونٹ ایک ایسا مجھ کو پلا دے
تیرے سوا جو سب کو بھلا دے
آئے کسی کا دھیان نہ جی میں
کوئی رہے ارمان نہ جی میں
دل میں لگن بس اپنی لگا دے
سارے غم اپنے غم میں کھپا دے
وہاں سے اکیلی آئی ہوں جیسی
ویسی ہی یاں سے جاؤں اکیلی
دل نہ پھرے دنیا میں بھٹکتا
کوئی رہے کانٹا نہ کھٹکتا
جی سے نشان پیاروں کا مٹا دوں
پیار کے منہ کو آگ لگا دوں
تو ہی ہو دل میں تو ہی زباں پر
مار کے جاؤں لات جہاں پر

پاؤں تجھے اک اک کو گنوا کر
خاک میں جاؤں سب کو ملا کر

یہ مناجات تو وہ ہے، جس پر اگر در و دیوار بھی جھوم جھوم کر، اپنی بولی میں آمین کہہ اٹھیں تو کچھ عجب نہیں۔ انسان کا دل تو پھر آخر انسان کا دل ہی ہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب

حالی ایک محبِّ وطن کی حیثیت سے

دنیا کے جن ملکوں کا حال کچھ بھی ہم جیسا رہا ہے ان کے ممتاز محبانِ وطن کا خیال آتے ہی سولی کے تختے، پھانسی کی رسی، محبس کی تیرہ و تار کوٹھریوں اور سلاسل کی جھنکار، تنہائیوں اور رسوائیوں، ناکامیوں اور بدنامیوں، دشت نوردی اور آبلہ پائی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ حالی اس قسم کے محب وطن نہ تھے

پھر محبانِ وطن کی وہ صف سامنے آتی ہے جنھوں نے اپنے وطن کی خاطر دوسروں کے وطن فتح کئے، اپنی آزادی کو مستحکم کرنے کے لئے دوسروں کی آزادی سلب کی، اپنے دیس کی رونق کے لئے دوسرے دیسوں میں خون کی ندیاں بہائیں، اپنوں کے عیش و آرام کے لئے دوسروں کو بے گھر بے در کیا، اپنی تہذیب کو ترقی دینے کے واسطے دوسروں کے تمدن تباہ و برباد کئے، حالی ان محبانِ وطن میں بھی نہ تھے۔

ان کی تو کہاں کو چھوڑ کر اہلِ فکر میں محبانِ وطن کو تلاش کیجئے تو بڑے بڑے بلند پایہ ادیب اور شاعر اور فلسفی مل گئے اپنی خاکِ وطن کا جن کو ہر ذرہ دیوتا ہے جن کے نظامِ اخلاق میں وطن قدرِ اعلیٰ ہے اور وطن کا مفاد حق و باطل، خیر و شر کا معیار ہے جنھیں اپنی ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے اور دوسرے کا سب کچھ بُرا۔ حالی ان محبانِ وطن میں کبھی نہ تھے۔

اور کیا تعجب ہے؟ حالی غریب جان دیتا تو کس وطن کے لئے یا دوسروں کی جان لیتا تو کس کی خاطر، اور جس وطن کا وجود ہی نہ تھا اس کے مفاد کو معیارِ خیر و شر بنانا چاہتا بھی تو کیسے بناتا۔ حالی نے جس وطن میں زندگی شروع کی وہ زیادہ سے زیادہ ایک جغرافیائی تصور تھا۔ اس کے باشندوں میں نہ کوئی اتحادِ مقاصد تھا، نہ یکجہتی اغراض، نہ کوئی مشترک مطمحِ نظر تھا نہ کوئی سیاسی تنظیم حالی کی نسل کے لوگوں کا کام پہلے تو وطن کو وجود میں لانا تھا کہ جب محفل میں آئے تو محفل ہی درہم برہم ہو چکی تھی۔ انحطاط و انتشار کے آثار مدتوں سے موجود تھے پر ۱۸۵۷ء کے انقلاب نے بساط ہی اُلٹ دی۔ مدت کے فتنہ و فساد کی مصیبت کے بعد امن و آشتی کا منہ دیکھا تو اس سے کیوں متاثر نہ ہوتے اور اس خلفشار کے بعد اس امن کو قومی شیرازہ بندی کی مہلت کیوں نہ سمجھتے؟

حالی نے بھی اپنے مرشد سید احمد خاں اور دوسرے ممتاز

ساتھیوں کی طرح انگریزی تسلط کو اسی نظر سے دیکھا۔ اسی لئے اس پر اطمینان کا اظہار اور اسی وجہ سے اس کے ساتھ تعاون کی تلقین کی۔

میرا خیال ہے کہ اگر حالی آج زندہ ہوتے تو بھی برطانیہ اور ہندوستان کے اس تعلق کو جو اس ہنگامہ خیز عہد میں پہلی مرتبہ مستحکم ہوا تھا۔ اچھا ہی جانتے اور ذمہ داری اور وفاق کی خوش آیند توقعات کی وجہ سے وہ حالات کے تغیر کے باوجود بھی شاید دونوں قوموں کیلئے اس تعلق کے برقرار رہنے کے متمنی ہوتے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اگر ان توقعات کے پورا ہونے کے قرائن نہ ہوتے اور محکومیت مطلق کی جگہ شریک حکومت ہونے کی امید قوی نہ ہوتی جاتی تو حالی کا وطن دوست دل اس تعلق کی ذلت کے احساس سے خالی اور اس کی زبان اس احساس کے اظہار سے محترز نہ رہتی۔ اس لئے کہ اس وقت بھی جب اور سب کو اس تعلق کے برکات ہی نظر آتے تھے اور خود حالی کی عقل اس تعلق کے افادہ کی مقر تھی اس کے دل میں ضرور ایک کانٹا سا کھٹکتا تھا جس کے دکھ کا اظہار عقل کی پاسبانی کے باعث رک رک کر ہی سہی مگر ہوتا ضرور تھا۔

آپ ان کے کلام کو غور سے پڑھئے۔ جگہ جگہ اور اکثر غیر متوقع طور پر ایسے شعر ملیں گے جن میں صاف اس تکلیف کا اظہار ہوتا ہے کالے اور گورے کی صحت کے طبی امتحان والا قطعہ آپ سب نے پڑھا ہوگا۔ دو شخص ایک کالا ایک گورا سول سرجن کے پاس

بیماری کا صداقت نامہ لینے جا رہے ہیں۔ راستہ میں تکرار ہو گئی۔ گورے نے کالے کو مارا، کالا غریب بے ہوش ہو گیا۔ ڈولی میں پڑ کر ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ گورا یوں ہی پہنچا۔ دونوں نے ڈاکٹر صاحب سے روئداد بیان کی، تو انھوں نے

دی سند گورے کو لکھ کر جس میں تصدیق مرض
اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار

یعنی اک کالا نہ جب گورے کے مکّے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت منہ پر وہ زینہار

اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جاندار

ایک کالا ہٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

دیوان میں غزلیں پڑھتے پڑھتے یہ شعر سامنے آجائے کہ

روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا
دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمہارا

یا یہ :-

داد طلب سب غیر ہوں جب تو ان میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانہ نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصاب چراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اس کو سارے تمہارے آ گئے یاد احسان ہمیں
تو آپ کیا سمجھیں گے؟

زمزمہ قیصری کے نام سے جو ایک انگریزی نظم کا ترجمہ کیا ہے اس کے ایک طویل حاشیہ میں کس دکھ کے ساتھ اس بربادی کا ذکر کیا ہے جو متمدن مغربی اقوام کے ہاتھوں اکثر غیر یورپی ممالک میں برپا ہوئی۔ لکھتے لکھتے یہ کہکر کہ کسی نے کیا خوب کہا ہے، خود اپنے دو شعر نقل کرتے ہیں۔

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر اس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گلچینی ہے یا لٹس ہے گلچیں یا ہے قزاقی

تدبیر قیام سلطنت والا قطعہ پڑھیئے کہ

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح
واں پاؤں جمانے کے لئے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اس کے تھی یہ مشورہ دیتی
یہ حرف سبک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر
مانو اسے، اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو

کرنے سکے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن
جو بات سبک ہو اسے منہ سے نہ نکالو

تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حالی کی نظر ہماری سیاسی بے بسی کے ان گوشوں سے بے خبر نہ تھی اور اس کا دل تعبد کی ان تکلیفوں سے نا آشنا نہ تھا۔ مگر حالی کی زندگی اور حالی کی تصانیف پر غور سے نظر ڈالیے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ عنصر ان کے حب وطن کے جذبہ میں کچھ بہت اہم اور موثر چیز نہ تھا۔

جذبہ حب وطن کا یہ پہلو نہایت شدید قسم کی منفی کیفیات نفسی پیدا کر دیتا ہے، حالات سے بیزاری یا تو بے عمل غصّہ کی شکل اختیار کر کے ہر نئی چیز سے انکار اور نفرت کو سب مشکلوں کا حل بتانے لگتی ہے یا اگر قوائے عمل شل نہیں ہوئے ہیں تو نجات کے لئے تخریب کی راہ سمجھاتی ہے۔ اچھے اچھے اس کا شکار ہو کر بے اثر و بے نتیجہ زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ یہ کڑھتے اور جلتے ہیں۔ مگر وطن کے دل کو ان سے کوئی ٹھنڈک نہیں ملتی۔ یہ غصہ اور نفرت میں اپنا خون سکھاتے ہیں، پر اس سے وطن کی رگوں میں خون نہیں دوڑنے لگتا۔ یہ اپنی سمجھ میں وطن کے لئے جان کھپاتے ہیں پر وطن کی روح کو اس سے بالیدگی حاصل نہیں ہوتی۔ اپنا تو کوئی عیب انھیں دکھائی دیتا نہیں۔ اور سب عیبوں کا ذمہ دار دوسرے کو ٹھہرا کر اپنی اصلاح کی تدبیر کیسے نکل سکتی ہے؟ حقیقت کی ناگواری اور تلخی سے بھاگ کر یہ اپنی تنہائیوں میں دور

دور کے منصوبے گانٹھتے ہیں۔ حکومتیں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ انقلاب کے خاکے بناتے ہیں۔ اور یوں آج کے کام کو ان منصوبوں کی موہوم تکمیل تک کے لئے ٹالنے کا عذر نکال لیتے ہیں۔ وطن جلتی روٹی کو ترستا ہے اور یہ اپنے خیالی پلاؤ سے اس کی ضیافت کرتے ہیں۔ حالی ان لوگوں میں نہ تھے۔

وہ ان میں تھے جن کی طبیعت میں مصائب و آلام سے غصہ کی آگ کی جگہ سوز دل کی دھیمی دھیمی گرمی اور درد کی میٹھی میٹھی کسک پیدا ہوتی ہے، دوسروں سے نفرت کی جگہ اپنوں سے محبت بڑھتی ہے، جو بے صبری سے جھلانے اور بپھرنے کی جگہ سعی پیہم کا عزم کرتے ہیں جو تخریب کی سہل اور ڈھلوان سڑک کی جگہ تعمیر کی دشوار گزار راہ اختیار کرتے ہیں۔ اور دور از کار اگرچہ بظاہر شاندار منصوبوں کی خیالی تخلیق کی جگہ ان پیش پا افتادہ اور بظاہر حقیر کاموں کو پورا کرنے میں لگ جاتے ہیں جو ان منصوبوں کے روبراہ آنے کی شرط اول ہیں۔ جو ہمہ گیر سیاسی اور معاشی اداروں کو قوم کی عام اخلاقی اور ذہنی حالت کا آئینہ دار سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان اداروں میں تغیر سے پہلے اس اخلاقی اور ذہنی حالت کو بدلنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ جو نئی دنیا کے بنانے کے لئے نئے آدم کی تخلیق اور نئی تعمیر کے لئے نئے معماروں کی تربیت لازمی جانتے ہیں۔ جو اس راز سے واقف ہوتے ہیں کہ بظاہر عظیم الشان ادارے اخلاقی احساس کی

کمزوری سے دیکھتے دیکھتے متزلزل ہو جاتے ہیں اور بظاہر کمزور اخلاقی قوتیں اپنی غیر منطقی توسیع صلاحیتوں کے باعث عظیم الشان اور غیر متوقع تبدیلیاں پیدا کر سکتی ہیں۔ خوب کہا ہے :-

نہ علیش کیخسروی رہے گا، نہ صولت بہمنی رہے گی
رہے گی اے منعمو تو باقی دئے کی کچھ روشنی رہے گی

اگر مزاجوں اور طبیعتوں کی یہ تقسیم جو ہم نے بیان کی ذہن نشیں ہو جائے تو حالی کو بہ حیثیت محب وطن سمجھنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔ کہ حب وطن کا جذبہ ان مختلف المزاج لوگوں میں الگ الگ شکلیں اختیار کرتا ہے۔ چنانچہ حالی نے جب اپنے وطن کو انتہائی انحطاط اور انتشار کے عالم میں دیکھا، خصوصاً ۵۷ء کے ابتلا رعظیم میں جسے ایک جگہ " دریائے عتاب ذو الجلال کی موجزنی" اور ایک جگہ "نظم عالم میں خلل" سے تعبیر کیا ہے۔ جب ان سب چیزوں کو جو ان میں عزیز تھیں درہم برہم ہوتے دیکھا۔ اور اس حالت کا خود مشاہدہ کیا "نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا ..... اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا بتا تھا۔ باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جدا"

آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا سب کو خطر
جل نہ جائیں اس کے شعلہ سے کہیں سب خشک و تر

اور اس ہنگامہ میں جسے بعض لوگ نادانی سے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کہتے ہیں اور بعض غدر، اس نے خود غرضی و نفس پرستی

بے ترتیبی اور بدنظمی کا مایوس کن منظر دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو بہائے اور دوسری طرف ایک نئی تہذیب اور ایک نئے تمدن کی آمد آمد کا شور سنا، اس نو وارد کے بے حساب مادی وسائل دیکھے اور ان مادی قوتوں کی مستحکم علمی اور اخلاقی بنیادوں کو سمجھا تو اس کا دل کانپ اٹھا کہ یہ اس کے وطن کے لئے جینے مرنے کی بات تھی، نہ جانے وطن اس حادثہ سے جانبر ہو گا کہ نہیں۔ ایک جگہ لکھا ہے:

کہتے ہیں مغرب سے جب ہو گا برآمد آفتاب
عرصۂ آفاق میں ہو گی قیامت جلوہ گر
دوستو، شاید وہ نازک وقت آ پہنچا قریب
آ رہی ہے روشنی مغرب سے اک اٹھتی نظر
رو ترقی کی چلی آتی ہے موجیں مارتی
اگلے وقتوں کے نشاں کرتی ہوئی زیر و زبر
دستکاری کو مٹاتی، صنعتوں کو روندتی
علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر
ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی
غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

انھیں غافلوں میں حالی کا وطن بھی تھا۔ مگر حالی کا وطن تھا کیا! پہلے تو حالی کا وطن ان کا گھر اور کنبہ پانی پت تھا، جس کے ساتھ ان کی شیفتگی کا حال میں پانی پت میں کیا سناؤں، یہ محبت

ایسی تھی کہ دل کی محبت بھی ان سے پانی پت نہ چھڑا سکی۔ اس کے بعد حالی کا وطن بڑھ کر دہلی ہوا جس کا ذکر جہاں کرتے ہیں تو اس طرح کہ سخت سے سخت دل پسیج جائے۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز
سیکڑوں داغ آئے گا سینہ میں بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز
چپہ چپہ پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز
مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

مگر سلطنتوں کی فکر، حکومت کی تبدیلی، تمدنوں کے تصادم نے اس کے وطن کے تصور کو وسیع کیا اور اب ہندوستان اس کا وطن ہوگیا۔ اس کے کوہ وصحرا اور آسماں وزمیں اس کی دل لگی کی شکلیں بنیں، وہ اس کے عنادل کے نغمہ سحری اور اس کی تاروں بھری راتوں کو یاد کرتا، اس کی خاک کو پاک جانتا، یہاں تک کہتا ہے کہ۔ ع

تیری اک مشت خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

اور کیوں نہ ہوتا۔ جو شاعر داخلیت سے بجگر اپنے ماحول سے چلے، وہ طبعی ماحول ہو چاہے تاریخی اپنے فن کا مصالہ حاصل کرتا ہے اس کے لیے وطن کی یہ دل پسند چیزیں اور بھی دلربا ہو جاتی ہیں۔ لیکن حالی پانی پتی، حالی دہلوی، بس خاک پاک ہند کے مظاہر مادی پر رک نہ گئے کہ وطن کو بہ حیثیت قطعہ زمین محبوب بنانے سے ہی اور خاک وطن کے ذرہ ذرہ کو دیوتا مان لینے سے ہی اس وطنیت کی بنیاد پڑتی ہے جو ایک غیر عقلی مذہب بنکر دوسروں کے وطن سے نفرت اور دوسرے دیس والوں سے جدال وقتال کی طرح ڈالتی ہے حالی مسلم تھے اور اسلام کی عالمگیر برادری کی ہوا لگنے کے بعد اس تنگ وطنیت کا زہر ان پر اثر نہیں کرتا حالی نے اس الحقلی وطن پرستی کے حق نما مظہر میں بھی خود پرستی و خود غرضی کے پوشیدہ جھوٹ کو پہچان لیا اور ان گھر کی چوکھٹ کے چومنے والوں کے لیے وہ صحیح تصور قائم کیا جس میں وطن کے معنی اہل وطن کی بے غرض خدمت اور بے لا بجہ سیوا کے ہیں کہ پہلی وطنیت تو انسان اور حیوان میں مشترک ہے اور دوسری وطن دوستی انسان کا امتیازی شرف۔ میرا تو خیال ہے کہ ہندوستان کے ادب میں پہلی مرتبہ حالی ہی نے حب وطن کے اس صحیح تصور کی تلقین کی ہے اور انفرادی اغراض کی بندگی سے

ظلمت کدہ میں بے لوث جماعتی خدمت کا دیا انھیں نے روشن کیا ہے اور جب تک ہمارے دیس کی مشترکہ قومی زبان اردو زندہ ہے اس کی نظر فروز روشنی میں صحیح حب وطن کی راہ ہندیوں کو ملتی رہے گی۔ وطن کے مظاہر مادی کی محبت کا اظہار نہایت دلکش انداز میں کرتے کرتے ٹھٹکتا ہے جیسے کسی نے غلطی پر ٹوک دیا ہو، اور کہتا ہے :۔

اے شراب خودی کے متوالے — گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے
نام کیا ہے اسی کا حُبِ وطن — جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے — کبھی یاروں کا غم ستاتا ہے
کیا وطن کی یہی محبت ہے — یہ بھی الفت میں کوئی الفت ہے

. . . .

ٹکڑے ہوتے ہیں سنگ غربت میں — سوکھ جاتے ہیں رُدکھ فرقت میں
مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے — ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے
گائے یا بھینس اونٹ یا بکری — اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی

کہئے حب وطن اسی کو اگر
ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کمتر

پھر کس وضاحت سے خدمت قوم کا مرادف بتا کر اس حب وطن کو ممتاز کیا ہے جو انسان کا مخصوص شرف ہے۔

ہے کوئی اپنی قوم کا ہمدرد — نوع انساں کا جس کو سمجھیں فرد

جس پہ اطلاق آدمی ہو صحیح　　　جس کو حیواں پہ دے سکیں ترجیح
قوم پر کوئی زد نہ دیکھ سکے　　　قوم کا حال بد نہ دیکھ سکے
قوم سے جان تک عزیز نہ ہو　　　قوم سے بڑھ کے کوئی چیز نہ ہو

اور یہی نہیں کہ وطن کے مادی جغرافی تصور سے آگے بڑھ کر حالی نے اس کا ایک انسانی تصور قائم کیا بلکہ اس انسانی تصور کی امکانی تنگیوں سے بھی اسے منزہ کر دیا ہے۔ حالی جب قوم کی خدمت کو وطن کی محبت بتاتا ہے تو اس کی قوم صرف نفع جو مالداروں اور سرمایہ داروں کا گروہ نہیں ہوتا جو جونک کی طرح دوسرے طبقوں کا خون چوسیں نہ صرف ان غریبوں کا جو سب سے جلنا اور اپنے سوا سب کو گالیاں دینا ضروری سمجھتے ہیں اسکی قوم خالی مسلمان نہیں، نہ صرف ہندو، بلکہ دینی اور معاشی امتیازات و تفریقات سے بری وہ سب کی خدمت کی تلقین کرتا ہے اور یہ اس تصور کی وہ بلندی ہے جس تک ہمارے ملک میں عمل تو کیا خیال بھی خال خال ہی پہنچا ہے۔ کہتا ہے:-

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو　　　اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
مرد ہو تو کسی کے کام آؤ　　　ورنہ کھاؤ پیو چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ　　　دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
پہنو جب عمدہ کوئی تم پوشاک　　　کرو دامن سے تا گریباں چاک
کھانا کھاؤ تو جی میں تم شرماؤ　　　ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار　　　زندگی سے ہے جن کا دل بیزار

نوکروں کی تمہارے ہے جو غذا — ان کو وہ خواب میں نہیں ملتا
جس پہ تم جوتیوں سے چلتے ہو — وہاں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو
کھاؤ تو پہلے لو خبر ان کی — جن پہ بنتا ہے نیستی کی پڑی
پہنو تو پہلے بھائیوں کو پہناؤ — کہ ہے اُترن تمہاری جن کا بناؤ

....

مقبلو مدبروں کو یاد کرو — خوش دلو غم زدوں کو یاد کرو
جاگنے والو غافلوں کو جگاؤ — تیرنے والو ڈوبتوں کو تراؤ

ایک اور جگہ اسی چیز کو یوں لکھتے ہیں۔

ان کی کیا عزت ہے یارو قوم ہے جن کی ذلیل
ان کو کیا راحت ہے جن کی قوم ہے سب خستہ
ہے وہ ایسا غول میں قبیلوں کے جیسے ایک میت
ہے ہزاروں مفلسوں میں ایک اگر آسودہ حال
شال گدڑی سے وہاں سو مرتبہ بدتر جہاں
ہوں ہزاروں گدڑیاں اور ایک کے کاندھے پہ شال
کہتے ہیں غیر اس کو ہم جنسوں میں اُجلا دیکھ کر
یہ وہی کوا ہے لیکن ہنس کی چلتا ہے چال

اور یہی نہیں کہ حالی نے قوم کے وسیع تصور میں صرف امیر غریب ہی کو شامل کیا ہو اور دل میں یہ چاہ ہو کہ پڑھنے والے سمجھیں کہ

اس سے مراد لیں مسلمان امیر و غریب ہیں۔ حالی مسلمانوں کی قوم میں تو طبقات معاشی کو ضرور قریب تر لانا چاہتے تھے مگر ایک ہندوستانی قوم کا تصور ان کے ذہن میں نہ تھا۔ سچ پوچھو تو یہ خیال خود ہمارے دل کے میل کا پتہ دیتا ہے۔ حالی کا شیشۂ دل ان کدورتوں سے پاک تھا۔ ایک جگہ نہیں بار بار اس نے اس خیال کی تکرار کی ہے کہ "عزت کا بھید ملک کی خدمت میں چھپا" کہیں دیس والوں کی تنگ نظری اور تعصب کے مہلک مظاہر سے دل برداشتہ ہوتا ہے تو درد محبت سے مجبور کس انداز سے اپنی تکلیف کا اظہار کرتا ہے۔

بلبل و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

بھائیوں کے آپس کے ٹنٹوں سے جب ثالثوں کو خوش ہوتے اور ان کی تفرقہ اندازیوں کو کامیاب ہوتے دیکھتا ہے تو رہا نہیں جاتا۔ بول اٹھتا ہے کہ :-

راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائیگا

اور جب ان جھگڑوں میں ایک تنگ نظر بھائی کے مقابلہ میں دوسرے کوتاہ اندیش بھائی کی مدد کوئی دوسرا کرتا ہے تو اس کے عواقب بھی اس کی ژرف نگاہی سے چھپ نہیں سکتے اور یہ

کہہ دیتا ہے :-

ہیں اگر بے دردیاں اپنوں کی دل کو ناگوار
ناگواران سے سوا غیروں کی ہیں غمخواریاں

پھر جب کبھی یہ بھائی گلے ملنے لگتے ہیں تو اس محبِّ وطن کا غنچۂ دل کھل جاتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں جب ہندو مسلمانوں کو ملتے دیکھا تو لکھا ہے۔

صد شکر وطن سے کوچ نفرت نے کیا
گھر اہل وطن کے دل میں الفت نے کیا
تقریروں سے ہو سکا نہ تحریروں سے
جو کار نمایاں کہ مصیبت نے کیا

اور پھر :-

تائید میں حق کی جو بلا آتی ہے — ساتھ اپنے بہت سی برکتیں لاتی ہے
بچھڑے ہوئے دوستوں کو ملاتی ہے — رُوٹھے ہوئے بھائیوں کو منواتی ہے

اور اگر آپ کو اصرار ہو کہ یہ بات حدیثِ دیگراں اور رمز و اشارہ میں صاف نہیں ہوتی تو حبِ وطن کے یہ شعر سن لیجئے۔

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر — نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ہو مسلمان اس میں یا ہندو — بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہو وے یا کہ ہو حنفی — جین مت ہو وے یا ہو ویشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو — سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو

ملک ہیں اتفاق سے آزاد　　شہر ہیں اتفاق سے آزاد

اور اس سے زیادہ وضاحت چاہتے ہیں تو سنئے:۔

ہند میں اتفاق ہوتا اگر　　کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیونکر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی　　اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
ایک کا ایک ہو گیا بدخواہ　　لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ
پھر گئے بھائیوں سے جب بھائی　　جو نہ آئی تھی وہ بلا آئی

اور مسلمان حالی کے حب وطن پر شبہ کرنے والے سنیں:۔

پاؤں اقبال کے اکھڑنے لگے　　ملک پر سب کے ہاتھ پڑنے لگے
کبھی تورانیوں نے گھر لوٹا　　کبھی دُرّانیوں نے زر لوٹا
کبھی نادر نے قتل عام کیا　　کبھی محمود نے غلام کیا

یہ متعصب مسلمان کی آواز ہے یا شیدائے وطن سچے ہندی کی؟

ہاں، اوروں سے پہلے، قوم کو حب وطن کا یہ وسیع تصور دے کر اور اپنے شعر کی دل نشینی اور گھلاوٹ سے اسے تاثیر کا دائی سرچشمہ بنا کر حالی نے اس عملی آدمی کی طرح جو اپنی آواز کو بے نہایت دستوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔ زیادہ تر مسلمانوں کو مخاطب رکھا۔ انھیں جگانے میں ساری زندگی کھپا دی، ان میں اجتماعی زندگی کا احساس پیدا کرنا چاہا۔ اخلاقی قدروں کی اہمیت انھیں سمجھائی۔ ان کی معاشرت پر نکتہ چینی کی۔ ان کے تمدن پر اعتراض کئے، ان کے امیروں کو شرمایا ہے اور ڈرایا ہے۔ ان کے غریبوں کو ہمت

دلائی ہے۔ ان کے علماء کو اپنے فرائض یاد دلائے ہیں۔ ان کے شاعروں کی بے مغز بکواس کا تمسخر کیا ہے انھیں تحصیل علم کی رغبت دلائی ہے۔ تجارت کا شوق دلایا ہے محنت اور مشقت پر آمادہ کیا ہے۔ ننگ بندگی کا احساس پیدا کیا ہے۔ غیرت دلائی ہے ہمت بندھائی ہے۔ خود خون کے آنسو بہائے ہیں اور انھیں بھی رلایا ہے۔ پھر محبت کے ہاتھوں سے ان کے آنسو پونچھے ہیں اور یہ سب کچھ اس تاثیر کے ساتھ کیا ہے کہ ان کی تاریخ سیاسی ہیں، تاریخ تعلیمی ہیں، تاریخ معاشرت ہیں، تاریخ ادب ہیں جہاں کہیں پچھلی نصف صدی میں کسی صحیح حرکت کی روانی دکھائی دے تو اس کا سلسلہ اس ادیب شاعر مصلح محب وطن اور سب سے زیادہ اس صاف دل اور فرشتہ خصائل انسان کی کاوش ذہنی کے چشمہ صافی سے جا ملتا ہے

لیکن کیا مسلمانوں کی اس خدمت کی وجہ سے حالی کو محب وطن کہنے کا حق ہمیں باقی نہیں رہتا؟ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں اور افسوس کہ بعض لوگ ایسا سمجھتے ہیں انھیں خود اپنے دل اور اپنی نظر کا علاج کرنا چاہیے۔ وہ حالی جس نے ملک میں سب سے پہلے (یعنی خود انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے کئی سال پہلے) حب وطن کا ایسا وسیع تصور ہندوستانیوں کے سامنے پیش کیا جس میں اس دیس کے سب باسی شامل ہو سکیں، جس نے انفرادیت اور خود پرستی کو اجتماعی خدمت کا

سبق سکھایا جس کی زبان قلم سے (جس نے کونسا ادارہ اور کونسا طبقہ ہے جس کے دل پر نشتر کا کام نہیں کیا ہے) ، جس سے ایک حرف ہاں ایک حرف ایسا نہ نکلا جس سے کسی ہم وطن کا دل اس سے دکھا ہو جو کسی دوسرے مذہب پر چلتا ہے جس نے اپنی شخصی زندگی میں مختلف المذاہب لوگوں سے محبت و مودت کی وہ وضع بنائی جس کے نمونے اس قوم پرستی کے دور میں مفقود ہوتے جاتے ہیں۔ وہ صرف اس جرم میں محب وطن نہیں باقی رہتا کہ وہ اپنی قوتوں کا بیشتر حصّہ مسلمانان ہند کی خدمت اور انھیں بیدار کرنے میں صرف کرتا ہے جو ایسا سمجھتا ہے وہ یا تو عمل میں تاثیر اور کمال کے لئے حدود مقرر کرنے کے گر سے نا آشنا ہے یا غریب مسلمانوں کو ہندوستانی ہونے کا شرف نہیں بخشنا چاہتا اور یہ دونوں صورتیں قابلِ افسوس ہیں۔

پہلی صورت میں وہ لوگ ہیں جو کسی کام کو چاہے ذہنی ہو، چاہے عملی اس کے پورے آداب کے ساتھ کرنے کی نہ خواہش رکھتے ہیں نہ صلاحیت مگر مشیخت بگھارے بغیر رہ بھی نہیں سکتے۔ یہ لوگ چند الٹی سیدھی تقریریں کر کے اور اخبارات میں موقع بے موقع بیانات شائع کرا کے سمجھتے ہیں کہ بس محبان وطن کی صفِ اول میں آ گئے اور اب ہر کسی کو محب وطن ہونے کی سند ان سے حاصل کرنی ہو گی۔ ان کا بیان چھپ گیا اور قوم کی اصلاح ہو گئی اور

وطن کی نجات کا سامان۔ انھیں نہ کسی کو جگانا ہے نہ کسی کو سدھارنا، یہ ساری دنیا کو مخاطب کر سکتے ہیں، دقت صرف ذرا سی ہے کہ دنیا ذرا اونچا سنتی ہے اور جب سننے پر مجبور ہوتی ہے تو ایک کان سے سنکر دوسرے سے نکال دیتی ہے ان محبان قوم کی تعداد کا اندازہ روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے چند شعر حالی کے ان کی شان میں یاد آ گئے۔

بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں
ہیں مے ناب کے دلال قدح خوار نہیں
شہر میں ان کے نہیں جنس وفا کی بکری
بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے یہ خریدار نہیں
بوالہوس، کام طلب، بندۂ نفس، اہل ہوا
ایک عالم ہے اسی رنگ میں دو چار نہیں
دعوئے عشق و محبت پہ نہ جانا ان کے
ان میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

ان بیچاروں کو کیا خبر کہ جس کے دل کو کسی کام کی تکمیل کی لگی ہوتی ہے وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنی تاثیر کے حلقہ کو اپنی قوتوں کا اندازہ کر کے محدود کرے۔ حالی کے سامنے وطن کے بے شمار مہتم بالشان کاموں میں سب سے قریب مسلمانوں کی اصلاح کا کام تھا کہ یہ بھی تو اسی ہندی قوم کا نہایت اہم جزو ہیں۔ اور اس قوم کی

تاریخ میں ان کا بھی کچھ کم حصہ نہیں رہا۔ یہ خود اتنا بڑا کام تھا اور آج تک اس قدر کام باقی ہے کہ اگر حالی پھر پیدا ہوں تو صحیح طور پر پھر اپنی ساری عمر انھیں کے سدھارنے میں صرف کر دیں اور ضرورت ہے کہ مدتوں تک ہزاروں مخلص خادمان قوم و وطن انھیں کی خدمت میں اپنی زندگیاں کھپا دیں۔ حب وطن کا وہ کون مالک مطلق ہے جو کسی مسلمان محب وطن کو جس کی محبت وطن کے لئے کسی طرح کسی دوسرے سے کم نہ ہو اس بات سے منع کر سکے کہ وہ اپنی قوتیں مسلمانوں کی ترقی اور اصلاح میں صرف کرے تاکہ ان کی درستی اور قوت سے ہندوستانیوں کی درستی اور قوت ہو اور ان کی ترقی سے دلیس کو چار چاند لگیں۔

اور وہ دوسرے لوگ جو نہایت بلند آہنگی سے اپنی حب وطن کا اعلان فرماتے ہیں لیکن ہندوستانی زندگی سے ان تمام چیزوں اور نشانوں کو رفتہ رفتہ مٹانے کے درپے ہیں۔ جو اس زمانہ کی یادگار ہیں جبکہ اس دلیس کے مسلمان باشندوں کے ہاتھ میں اس کی سیاسی باگ تھی۔ انھیں اپنی تنگ دلی پر شرمانا چاہیے۔ قومیں یوں نہیں بنتیں کہ کوتاہ بیں لوگ اپنے تعصبات کو اندھے پن میں اس کی تمدنی زندگی کے نہایت قیمتی عہد کو کالعدم کر دیں۔ جو لوگ ہندوستانی زندگی کا یہ تصور رکھتے ہیں کہ اس میں سے اسلامی عناصر یک قلم خارج کئے جا سکیں گے۔ اور جو ایسا کرنے کی تھاک اور وطن دشمن

مساعی میں مصروف ہیں.......... انھیں چاہیے کہ تربینی پر جہاں گنگا جمنا کا سنگم ہوتا ہے اور گنگا کے مقدس مگر ذرا گدلے گدلے اچھلتے دھارے میں جمنا کا گہرا صاف نیلگوں دھارا آکر ملتا ہے اور پھر دونوں ملکر آگے ہمارے عزیز ملک کے سب سے آباد اور زرخیز حصہ کو سیراب کرتے ہیں، اس سنگم پر جاکر ان دونوں دھاروں کو جنھیں قدرت نے اپنے مصالح سے ملایا ہے۔ جدا کرنے کی کوشش کریں۔ جب تک یہ اس دشوار کام کو انجام دیں مسلم محبان وطن اور بہی خواہان قوم و ملک کو وطن کی خدمت کا یہ طریقہ اختیار کرنے کی بھی اجازت ہو کہ وہ مسلمانوں کو جگائیں کہ ان کے فروغ سے بھی وطن کا فروغ اور ان کی تباہی میں بھی وطن ہی کی تباہی ہے۔ اور جب حب وطن کا کوئی برخود غلط اجارہ دار انھیں اس راہ سے ہٹانے پر مصر یا ان کی حب وطن کے تسلیم کرنے سے منکر ہو تو اسے حالی کا یہ شعر زمی سے سنا دیا جائے۔

قیس ہو، کوہکن ہو، یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب

مکاتیب حالی

دنیا میں بڑے آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کا ہم ادب و احترام کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جن سے ہم محبت کرتے ہیں ادب ہم ان اولوالعزم اور عالی حوصلہ و مدبر دل اور وطن پرستوں اور باکمال حکیموں اور ادیبوں کا کرتے ہیں۔ جن کی حیرت انگیز جد وجہد قربانیوں اور عظیم الشان کاموں اور تدبیروں نے اور جن کے علم و کلام نے عالم کو فیض پہونچایا اور روشن سورج کی طرح تاریکی کو مٹایا محبت ہم ان سے کرتے ہیں جن کی پاک سیرت خوش اطواری اور خوش اخلاقی دل کے موہنے میں وہی کام کرتی ہے جو چودھویں رات کی چاندنی۔ ان کے پاس سے جو اٹھا کچھ لے کر اٹھا۔ اور ان کے پاس جو گیا کچھ بنکر آیا مولانا حالی ان پاک نفوس میں سے ہیں جن کا ہم ادب بھی کرتے ہیں اور ان سے محبت بھی۔ ان کے کلام نے اردو شاعری میں ایک انقلاب

پیدا کر دیا۔ اور یہ اسی کا طفیل ہے کہ آج اردو شاعری کا قدم ترقی کی طرف نظر آتا ہے اور اسی طرح ان کی متین اور دلچسپ نثر اور تنقید نے اردو ادب میں ایسا بے بہا اضافہ کیا ہے کہ جس کا اعتراف ہر صاحب ذوق کرتا ہے یہ چیزیں ہمارے دل میں ان کا ادب و احترام پیدا کرتی ہیں دوسری طرف ان کی سیرت ہے ان کے پاکیزہ اخلاق و اطوار۔ ان کی دلسوزی اور ہمدردی کا دلوں پر اثر پڑتا تھا وہ کوئی بہت بڑے جادو بیان یا خوش تقریر نہ تھے مگر ان کی باتوں میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ لوگوں کے دل خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتے تھے وہ کبھی کسی کی مذمت یا برائی سے اپنی زبان آلودہ نہ کرتے تھے، بلکہ دوسروں کو بھی نرمی اور خوش اسلوبی سے روکتے تھے یہاں تک کہ جن لوگوں نے ان پر سخت اور بے جا تنقیدیں کیں ان کو بھی انھوں نے سراہا۔ اگر کوئی شخص ایسا کام کرتا اور کوئی ایسی چیز لکھتا جس میں ذرا بھی خوبی کا پہلو ہوتا تو اس کی دل افزائی فرماتے اور خوش ہو کر تعریف کرتے تھے۔ ہمدردی کا یہ حال تھا کہ دوسرے کا درد دیکھ کر خود تڑپنے لگتے تھے۔ باوجود ایک اعلیٰ پایہ کے ادیب و شاعر ہونے کے مزاج میں بے حد انکسار اور فروتنی تھی۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جو دلوں میں گھر کر لیتی تھیں اور ان کی طرف سے محبت پیدا کرتی تھیں اگرچہ خطوں کے اس مجموعہ میں جو اب چھپ کر شائع ہوا۔ زیادہ تر خط ایسے ہیں جو عزیز و اقارب کے نام ہیں اور جن میں زنانہ زمرہ کی

معمولی باتیں۔ آئے دن کے آلام و افکار اپنی اور دوسروں کی بیماری کا ذکر ہے مگر ان میں بھی ایک بات پائی جاتی ہے۔ علاوہ ان کے بہت سے خط احباب اور ہمسروں کے نام ایسے بھی ہیں جن میں ان کے دلی خیالات اور ان محاسن کا پتہ لگتا ہے جن کا ذکر ہم نے کیا۔

ان میں سے اکثر اس وقت کے ہیں جب وہ سرسید مرحوم کی سوانح عمری لکھ رہے تھے اس قابل قدر اور بے مثل کتاب کے لکھنے میں انھوں نے بے حد محنت اور جانفشانی اور کاوش سے کام کیا اور باوجود اپنی بیماری، خانگی پریشانیوں اور جھگڑوں اور ایک نواسے کے لاعلاج مرض کے جس نے ان کی زندگی تلخ کر دی تھی۔ وہ برابر اس سے لپٹے رہے اور کئی سال تک خون جگر کھانے کے بعد اسے تمام کیا جو کتاب اس قدر دماغ سوزی اور زحمت اور مسلسل کوشش اور جگر کاوی کے بعد لکھی گئی تھی، جب وہ شائع ہوئی اور ان لوگوں کی طرف سے بے اعتنائی ظاہر ہوئی جن سے خاص طور پر یہ توقع تھی کہ وہ اس کی قدر کریں گے اور جو سرسید مرحوم کے فدائی، ساتھی اور ہمدرد تھے تو معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو اس کا قلق ہوا۔ چنانچہ وہ ایک صاحب کو جو نواح علی گڈھ کے رئیس اور روشن خیال اور صاحب ذوق اور صاحب علم ہیں۔ یہ لکھتے کہ ڈیڑھ مہینے سے زیادہ عرصہ ہو چکا کہ حیات جاوید کی جلدیں تینوں قسم کی ڈپوٹی شاپ میں پہونچ گئیں۔ مجھے یقین تھا کہ آپ نے ضرور وہاں سے منگوائی ہوں گی کیونکہ اگر مصنف قابل وقعت

نہ تھا۔ تو ہیرو بلاشبہ ایسا تھا کہ اس کی بائیوگرافی دیکھنے کا خاص کر آپ جیسے لوگوں کو ضرور مشتاق ہونا چاہیے تھا مگر جہاں تک خیال کیا جاتا ہے مصنف کی بے دقعتی نے ہیرو کی بھی قدر گھٹا دی ہے جن لوگوں سے یہ امید تھی کہ اس کتاب نے منگوانے میں ایک دوسرے پر سبقت کریں گے ان کی طرف سے سرد مہری کے سوا اب تک کچھ نہیں دیکھا۔ اگرچہ اس قلیل عرصہ میں کتابیں توقع سے زیادہ فروخت ہو گئی ہیں۔ مگر ایسی قدردانی سے وہی خوش ہو سکتا ہے جو تجارت کے سوا تصنیف و تالیف کا اور کوئی مقصد خیال نہیں کرتا۔ بلاشبہ میں نے کسی سے اشتہار یا ریویو لکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ مگر میرا خواہش نہ کرنا اس بات کا ہرگز مقتضی نہ تھا کہ سرسید کا کوئی دوست اس کتاب کا بالکل نوٹس نہ لے اور اخباروں کو جانے دیجیے۔ علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جس کو سرسید کی یادگار کہا جاتا ہے اور جس کا اہتمام محمڈن کالج کے آنریری سکریٹری اور سرسید کے جانشین اور ان کے زبدۂ احباب کے ہاتھ میں ہے۔ آجتک "حیات جاوید" کی نسبت اس میں ایک حرف نہیں لکھا گیا۔ اگرچہ میں صدقِ دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سرسید کی لائف جیسی کہ چاہیے تھی ویسی مجھ سے نہیں لکھی گئی۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی ناقابلیت کے اس بارگراں کو اپنے ذمہ لیکر سرسید کے تمام احباب اور حواریوں کو ایک فرض کفایہ سے سبکدوش کیا ہے اور اس لئے اپنے زعم میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ سرسید کے احباب اگر اس

تصنیف کو لپسند نہ کریں گے تو اس کی اشاعت میں ضرور مدد دیں گے
مگر آج تک کسی نے اس کی بات بھی نہ پوچھی بلکہ بجائے امداد کے بعض اصحاب
متوقع ہیں کہ ان کی خدمت میں ایک ایک کاپی ہدیۃً پیش کی جائے۔
..... صاحب نے سرسید کی زندگی میں وعدہ کیا تھا کہ پانچسو روپے
کی کتابیں خرید کر کالج کو دوں گا مگر میں سرسید کو اور اپنے تئیں بڑا
خوش قسمت سمجھوں گا جب یہ سنوں گا کہ انھوں نے کوئی کاپی ڈیوٹی
سے خرید فرمائی ہے اور اس کو مطالعہ کے لائق سمجھا ہے۔ آپ یقین
جانیے کہ میں اس زمانہ کی لٹریری ترقی کے آگے ایسے لوگوں کی تحریرات
جو میری طرح محض اردو فارسی کے مرد میدان ہیں۔ لاشے محض جانتا
ہوں مگر مکڑی جو اپنا جالا پورنے میں منتہائے طاقت صرف کرتی ہے
وہ اسی کو حریر و اطلس بلکہ ان سے بھی زیادہ گراں قدر تصور کرتی
ہے۔

مولانا کے انتہائی رنج و صدمہ اظہار ہے۔ ورنہ وہ ایسے نیک
مزاج اور شریف النفس تھے کہ تحریر میں تو کیا زبان پر بھی کسی کی شکایت
نہیں آتی تھی اور یہ بھی انھوں نے ایک خانگی خط میں لکھا ہے اور وہ
بھی ایک ایسے صاحب کو جو ان کے اور اچھی کتابوں کے قدر دان
تھے اور جن سے ایک حد تک بے تکلفی بھی تھی۔ اور پھر وہ ایک عام حالت
کا نقشہ ہے جس کا بیان کرنا کچھ ایسا معیوب نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اس خط
سے رنج و صدمہ کا اظہار ضرور ہوتا ہے اور ایک طرح کی شکایت بھی

پائی جاتی ہے لیکن دیکھا جائے تو کوئی ایسی بات نہیں ہے جو کسی کے لئے دل شکن ہو اور اگر ان کے بعض نامور ہمعصر مصنفین کی تحریریں یا خطوں سے مقابلہ کیا جائے جو انھوں نے ایسے موقعوں پر لکھے ہیں تو یہ تحریر کوئی حقیقت نہیں رکھتی اس سے ظاہر ہے کہ جس شخص کے صدمہ اور رنج کی انتہا یہ ہو وہ کیسا پاک سیرت ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سرسید کی دل سے قدر کرتے تھے اور سرسید کو مرے بھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا جب انھوں نے دیکھا کہ ابھی سے ان لوگوں کا جو سید کی محبت اور جاں نثاری کا دم بھرتے تھے تو انھیں بہت شاق گزرا تھا۔ تازہ تازہ پھوٹ پڑے

اس خط میں ایک دوسری حقیقت کو بھی آشکارا کر دیا ہے۔ جو بہت ہی قابل افسوس ہے۔ ہمارے یہاں کے متمول اور صاحب ثروت لوگ کسی کتاب کی قدر کرنا تو کجا خرید کر پڑھنا بھی نہیں جانتے اور اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ مصنف ان کی خدمت میں اس کا نسخہ ہدیتاً پیش کرے یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں کی بہتر سے بہتر کتاب کبھی اتنی نہیں بکتی جتنی کہ دوسرے ممالک میں معمولی درجہ کی کتابیں فروخت ہو جاتی ہیں۔ سرسید کے احباب کی اس بے اعتنائی کا ان کے دل پر اس قدر اثر تھا کہ انھیں تاریخوں میں ایک خط میں جو انھوں نے اپنے ایک نیاز مند کے نام لکھا ہے اس دکھڑے کو پھر دہرایا ہے۔ چونکہ یہ ایسی بپتا ہے جس میں ہم سب مبتلا ہیں۔ اس لئے اس خط کے ایک اور حصہ کے نقل کرنے کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

میں ہرگز یہ خیال نہیں کرتا کہ میں نے اس عجیب و غریب شخص کی بائیوگرافی لکھنے کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے بلکہ مجھے اپنی کمزوریاں اور لغزشیں بخوبی معلوم ہیں اور میں علی الاعلان اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے اس بائیوگرافی کا حق ادا ہو نہ سکا۔ لیکن میں نے اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کمی نہیں کی۔ اور چھ برس تک اس کام کے سوا دوسری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ کسی متنفس نے قلم یا درم سے براہ راست اس کام میں مجھے مدد نہیں دی۔ والحمد للہ ماشاء اللہ۔ میں اگرچہ یہ کام فی النفسہ کچھ قدر کے لائق نہ ہو مگر اس لحاظ سے کہ میں نے اس کے سرانجام کرنے میں اپنی پوری طاقت صرف کی ہے ضرور توجہ کے لائق ہے۔ ...... میں اس موقع پر آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں جب میں نے "مسدس مدوجزر اسلام" کا پہلا اڈیشن نکالا اور اس کی ایک جلد سرسید مرحوم کے پاس بھیجی تو بغیر اس کے کہ میں نے اس مرحوم سے کوئی درخواست کی ہو فوراً مجھ سے پوچھا کہ آپ نے اس کی کتنی جلدیں چھپوائی ہیں میں نے جواب لکھ بھیجا انھوں نے اسی وقت ایک فہرست اپنے احباب کی مجھے لکھ بھیجی کہ اتنی جلدیں فلاں دوست کو اور اتنی فلاں کو اور اتنی وہاں بھیجدو اور اپنے دوستوں کو لکھ بھیجا کہ کتابیں پہنچتے ہی قیمت مصنف کے پاس بھیجدیجیے۔ چنانچہ مہینے ڈیڑھ مہینے میں جس قدر جلدیں چھپوائی تھیں سب فروخت ہوگئیں اور دوسرا اڈیشن چھپوانے کی ضرورت ہوئی۔ افسوس ہے کہ یہ خیالات وہ شخص اپنے ساتھ لے گیا اب ان کے

بڑے بڑے ذی مقدور دوست اس بات کے متوقع ہیں کہ ان کی جناب میں کتابیں مفت نذر کی جائیں۔ بعضے قیمت بہت گراں بتاتے ہیں اور یہ توکسی سے بھی امید نہیں کہ مصنف کی محنت کی کچھ داد دی جائے یا کچھ قدر کی جائے۔

سوختیم و سوزش ما بر کسے ظاہر نشد
چوں چراغان شب مہتاب بیجا سوختیم

یہ خط بہت پر درد ہے۔ خط کیا ہے ہماری قوم کی ناقدردانی کا مرقع ہے۔ اگرچہ اس خط کو لکھے پورے چھبیس برس ہوئے ہیں اور ملک کے حالات میں بہت کچھ تغیر اور تبدل ہوگیا ہے لیکن علمی قدردانی میں کچھ انیس بیس ہی کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ جس چیز کی خریداری کا مدار زیادہ تر مسلمانوں پر ہوگا اس کا رونق اور فروغ پانا معلوم۔

علی گڈھ کالج اور ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انھیں کمال ہمدردی تھی۔ ان معاملات میں قلمے، درمے، قدمے ہر طرح کی مدد کرنے پر آمادہ رہتے تھے ان کی تائید اور ہمدردی میں ایسی بے مثل اور بے نظیر نظمیں لکھی ہیں کہ ان کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی۔ ان کا ایک ایک شعر ہزاروں اور لاکھوں روپیے کے چندہ پر بھاری ہے۔ ان خطوں میں بھی جابجا کالج اور کانفرنس کا بھی ذکر آتا ہے اور جو کچھ ان سے ہوسکتا ہے ان کے کرنے میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔ خود شریک ہوتے ہیں۔

دوسروں کو حرکت پر آمادہ کرتے ہیں چندے کرتے ہیں، دلاتے دیتے ہیں۔ دوسروں کو دلائے دیتے اور کام کرنے کی ترغیب دیتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں مسلمانوں کی تعلیم سے بے حد شغف تھا۔ اور ان کا یہ عقیدہ تھا کہ بغیر تعلیم کے یہ قوم کبھی نہیں پنپے گی۔ اپنے وطن پانی پت میں انھوں نے تعلیم کی بہت کچھ اشاعت کی، اپنے خاندان والوں کے سوا، دوسروں کو بھی تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔ اور ان کے لئے آسانیاں پیدا کیں اور ہر قسم کی مدد دی۔ پانی پت میں ایک اچھا کتب خانہ بھی قائم کیا۔

ان خطوں سے مولانا کی بعض عادتوں اور خصلتوں کا بھی پتہ چلتا ہے اور جو لوگ ان سے ذاتی طور پر واقف نہیں وہ بھی انھیں پڑھکر بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ان میں کس قدر ہمدردی اور شفقت تھی جب وہ اپنے کسی عزیز یا دوست کو دیکھتے تھے کہ اس سے کچھ لغزش ہوگئی ہیں یا کسی معاملہ میں ضرورت سے زیادہ سخت ہے تو وہ اس قدر نرمی اور محبت سے سمجھاتے تھے یا اس کا پیرایہ ایسا اختیار کرتے تھے کہ سننے والے کو کبھی برا نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ ان کے کہنے کا اثر ہوتا تھا مثلاً وہ اپنے ایک دوست اپنے فرزند کے متعلق لکھتے ہیں۔

"معلوم نہیں کہ انھوں نے میرے عرض کرنے پر کوئی مشغل اختیار کیا یا نہیں ان کو خدائے تعالیٰ ایسی لیاقت دی ہے کہ ملک و قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور جو کہ عنایت الٰہی سے تلاش معاش

کی ضرورت نہیں ہے اس لئے ان کے علمی مشغلوں میں کوئی چیز مزاحم نہیں ہو سکتی۔ ہاں میرے نزدیک صرف کتابوں اور اخباروں کا مطالعہ کرنا اور کوئی علمی کام نہ کرنا اپنے علم کی ناقدردانی اور اپنی قیمتی زندگی کو رائیگاں کھونا ہے۔ اس موقع پر اپنی ذیل کی رباعی لکھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ موصوف بھی اس کو پڑھیں۔ اور اگر درحقیقت وہ سودیشی تحریک کو دل سے پسند کرتے ہیں تو اس رباعی پر عمل کریں۔ رباعی یہ ہے

یارو نہیں وقت عیش و آرام کا یہ
موقع ہے اخیر فکر انجام کا یہ
بس حب وطن کا جب چکے نام بہت
اب کام کرو وقت ہے کام کا یہ

مولانا کا ایک نواسہ ہے جو ایک لاعلاج مرض میں مبتلا تھا اور جوں جوں اس کے دورے بڑھتے جاتے تھے اس کا مزاج نازک ہوتا جاتا تھا۔ مولانا اس کی اس طرح ناز برداری کرتے تھے کہ ماں باپ بھی نہیں کر سکتے۔ دنیا بھر کا کوئی علاج ایسا نہ تھا جو انھوں نے نہ کیا ہو۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کا تو کیا ذکر ہے ان میں سے تو کوئی شاید ہی کوئی چھوٹا ہو اگر کسی عطائی کو بھی سن پاتے ہیں کہ وہ اس بیماری کا علاج کرتا ہے تو وہاں پہنچتے ہیں اگر کسی عامل کو سن پایا تو اس کے پاس دوڑے پھرتے تھے کسی دوست نے کوئی نسخہ بتا دیا تو اس پر عمل کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ غرض اس کی وجہ سے

مولانا کی زندگی تلخ تھی۔ وہ ایک بار اپنے چچا کے یہاں جاتا ہے اس وقت مولانا نے اسے خط لکھا ہے جس میں انھوں ددھیال اور ننھیال والوں کے برتاؤ کا فرق بتایا ہے اور پھر کس کس طرح یہ سمجھایا ہے کہ اسے وہاں کس طرح رہنا چاہیئے۔ اس میں ایسے کام کی، تجربہ کی، دوراندیشی کی باتیں لکھی ہیں کہ پڑھنے کے قابل ہیں اور ایسی صاف ستھری سادہ زبان میں لکھی ہیں کہ ایک بچہ بھی پڑھ سکے اور سمجھے اور اثر قبول کرے۔ افسوس کہ یہ خط کسی قدر طویل ہے اور ہم اسے نقل نہیں کر سکتے۔ اگرچہ یہ معمولی باتیں ہیں لیکن انھیں چیزوں سے ایک انشا پرداز کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اپنے ایک نیازمند کو لکھتے ہیں "اسلام نمبر میں آپ کا مضمون پڑھ کر بہت لطف آیا۔ نہایت پرزور مضمون لکھا ہے ... آپ ہی کا حصہ تھا مگر برٹش فارن پالیسی پر اس میں جا بجا نوک جھوک کی گئی ہے۔ وہ سراسر خلاف مصلحت ہے ... میں نہیں جانتا کہ مضمون کا کس قدر حصہ باقی رہا ہے اس میں ہندوستان کی مسلمان ریاستوں کا ذکر ہوگا یا نہیں۔ اگر آپ کی یہی راست گفتاری رہی تو للّٰہ آپ اس سلسلہ کو چھیڑنے کی تکلیف گوارہ نہ فرمائیے۔" نصیحت کی تلخی کو کس طرح تعریف کی شیرینی سے گوارا کر دیا ہے۔

ایک دوست کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے۔ تعزیت کا خط لکھا ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں "اگرچہ یہ موقع نصیحت و تنبیہ

کرنے کا نہیں ہے مگر میں اس مقام پر خاموش نہیں رہ سکتا۔ خدا کے تمام حکمت اور مصلحت سے بھرے ہوتے ہیں۔ بہت سی باتوں کو ہم مکروہ جانتے ہیں۔ مگر وہ ہمارے حق میں اکثر کا حکم رکھتی ہیں۔ اتفاقات تقدیری سے جو آپ کو یہ آزادی حاصل ہو گئی ہے اس کی قدر کرنی چاہیئے اور اس سے کچھ کام لینا چاہیئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ سید احمد خاں صاحب نے جو اس قدر شہرت اور عزت ملک و قوم کی نظر میں حاصل کی اس کا کیا سبب ہے۔ میں یقیناً کہہ سکتا ہوں کہ صرف اس وجہ سے ان کو یہ رتبہ حاصل ہوا کہ ان کی اہلیہ ان کی جوانی میں مر گئی تھیں۔ بہت سے لوگوں نے ان کو دوسری شادی کی صلاح دی۔ مگر انھوں نے ایک نہ مانی اور اپنے بچوں کو اپنے کنار شفقت میں لیا اور ان کی تعلیم و تربیت میں کوشش کی اور اپنی دماغی طاقتوں سے جو بہ سبب تجرد اور زیادہ سرسبز اور شگفتہ ہو گئیں تھیں وہ کام لئے جنھوں نے آج ان کو تمام ہندوستان بلکہ تمام دنیا میں مشہور اور نامور کر دیا اور اگر وہ دوسری شادی کر لیتے تو ہرگز یہ رتبہ ان کو حاصل نہ ہوتا۔ آپ کے لئے یہ نہایت عمدہ موقعہ ہے کہ آپ ہمہ تن اور اولاد کی تربیت میں مصروف ہو جائیے اور نوکری بھی چاہے کرو چاہے نہ کرو اور اگر زیادہ ہمت ہے تو خود بھی تحصیل علم کرو اور ہرگز دوسرا خیال دل میں نہ لاؤ۔ میں سچ کہتا ہوں کہ پھر نہ اولاد کی تم کچھ خبر لے سکو گے اور نہ اپنی زندگی کا کچھ مزا اٹھاؤ گے بلکہ زندگی تلخ ہو جائے گی اور

اولاد بے علم رہ جائے گی اور ان کو آپ سے کچھ محبت و الفت نہ رہے گی اگر ان کو اپنا قوت بازو بنانا چاہتے ہو اور اپنی زندگی تلخ کرنا نہیں چاہتے اور اولاد کو علم و ہنر سکھانا چاہتے ہو تو کمال صبر و سکون اور عفت اور پاک دامنی کے ساتھ تجرد اور آزادی میں بسر کرو۔" جب کوئی ان کی تعریف و ستائش کرتا تو اس کا جواب یا شکریہ تو لکھتے مگر بڑی خوبی سے ٹال جاتے تھے۔ اور بعض اوقات اپنے متعلق بھی رائے دینے سے نہیں چوکتے تھے مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں: "میں آپ کے ریمارکس کا جو آپ نے میری نثر کی نسبت کئے ہیں دل سے شکریہ ادا ہوں مگر صحیح یہ ہے کہ ہماری اور ہمارے ہم عصروں کی نظم و نثر پر صحیح رائیں اس وقت تک جب تک کہ ہم اور ہمارے طرفدار یا ہمارے مخالف دنیا میں موجود ہیں قائم نہیں ہو سکتیں بلکہ خود ہم میں سے کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کے اسٹائل میں کونسی ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کو اوروں کی طرز پر ترجیح دے سکتا ہے۔

می گریم و از گریہ چو طفلم خبرے نیست
در دل ہوسے ہست و ندانم کہ کدام ست"

اسی شخص نے جب "حیات جاوید" پر تبصرہ کیا اور کتاب کی بہت تعریف کی تو اس کے جواب میں لکھتے ہیں: "حیات جاوید پر آپ کا پورا ریویو دیکھا جو کلمات بتقاضائے محبت، تصنیف اور مصنف کے حق میں بے اختیار آپ کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں۔ اگرچہ میں اپنے تئیں

ان کا مستحق نہیں سمجھتا لیکن بہر حال آپ کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض جانتا ہوں۔ یہ وہی خصلت ہے جس کو اہل ایران یار فروشی کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے اور ہماری زبان میں چھڑک چھڑک کر بیچنا کہتے ہیں۔

ایک عزیز کو اکسٹرا اسسٹنٹی کا عہدہ ملا تو انھوں نے مولانا کا شکریہ ادا کیا کہ یہ انھیں کی سعی اور محنت کی بدولت ہے مولانا اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں جو باتیں تم نے میری نسبت لکھی ہیں یہ محض تمہاری سعادت مندی اور کسی قدر تمہاری نادانی کی دلیل ہے اگر بالفرض محال میری کوشش کو تمہاری کامیابی میں کچھ دخل ہو بھی تو اس کو تقریباً ایسا ہی سمجھنا چاہیے جیسا کہ ایک باپ کی کوشش کو بیٹے کی کامیابی میں ہوتا ہے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ تعجب کی وہ باتیں ہیں جو آجکل دنیا میں لوگ کر رہے ہیں۔ غیروں کے بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں اپنی بساط سے زیادہ ان کی امداد کرتے ہیں۔ تمام قوم کے لئے ویسی ہی کوشش کرتے ہیں جیسی کہ خاندان کا سرپرست اپنے خاندان کے لئے کرتا ہے اپنی جان اور مال اور وقت اور دل و دماغ کو قوم کے لئے وقف کر رکھا ہے قوم کی طرف سے ان پر گالیاں پڑتی ہیں۔ مگر وہ قوم کا خیال نہیں چھوڑتے اور رات دن اسی دھن میں لگے ہوئے ہیں یہ لوگ ہیں جن کا ہم کو اور تم کو اور تمام قوم دل و جان سے شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ اور انھیں کا

صدقہ ہے کہ ہماری قوم میں کسی قدر آپس کی ہمدردی کا خیال پیدا ہو گیا ہے۔

مولانا کے مزاج میں مزاح بھی تھا۔ مگر بہت لطیف، چنانچہ ان خطوں میں بھی کہیں کہیں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ مثلاً وہ نواب محسن الملک مرحوم سے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں "ان کا ارادہ ایسا ہی ہے جیسا ہر مسلمان حج کا ارادہ رکھتا ہے" یہ وہ اپنے ایک نیاز مند کو لکھتے ہیں کہ "آپ کا آرٹیکل جو علی گڈھ کالج کی سورش کے متعلق روزانہ پیسہ اخبار میں نکلا ہے میں نے کئی دفعہ پڑھا اس کا زور اور سچائی اور فصاحت دیکھکر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔۔۔ کی حقیقت پر جو پردہ پڑا ہوا تھا آپ نے اس طلسم کو بالکل توڑ دیا۔ سب سے زیادہ سچی بات جو آپ نے لکھی ہے وہ ٹرسٹیوں کی غفلت اور بے پرواہی کا ذکر ہے۔ ایک دانشمند کا قول ہے کہ جب کسی بدصورت آدمی پر لوگ کوئی پھبتی کہیں اور قہقہے لگائیں تو وہ بھی ان کے قہقہوں میں شریک ہو جائے چونکہ میں بھی ننگ ٹرسٹیاں ہوں اس لئے میں بھی ٹرسٹیوں کی ندامت میں ان کے ساتھ شریک ہوتا ہوں۔

چونکہ مولانا ایک مشہور اور نامور شخص تھے اس لئے اکثر عزیز اور احباب انھیں سفارشوں کے لئے تنگ کرتے رہتے تھے ایک ایسی ہی فرمائش پر وہ لکھتے ہیں "شاید تم اور لوگ یہ

خیال کرتے ہوں گے کہ مجھے ہندوستان کے اطراف و جوانب میں ہزاروں آدمی جانتے ہیں۔ اکثر معززاور ذی اختیار لوگوں سے بھی مجھے تعارف ہے اور اکثر بزرگ میری عزت کرتے ہیں۔ پس میں جسکی جہاں کہیں سفارش کروں گا وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ لیکن اے عزیز یہ خیال بالکل غلط ہے دنیا دارالمعاوضہ اور دارالمکافات ہے جو شخص کسی کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے کسی نہ کسی عوض اور بدلہ کی توقع پر کرتا ہے میں تمہاری ایک سفارش اس لئے منظور کرتا ہوں کہ مجھے تم سے دس فرمائشیں کرنے کا موقع ملے پس ایک ایسے شخص کی سفارش جس سے کسی طرح کا عوض متوقع نہ ہو کیونکر کارگر ہو سکتی ہے جب میں زمانہ کی نگاہ میں اپنی قدر منزلت کا اندازہ کرتا ہوں تو اس سے زیادہ نہیں پاتا کہ ایک مشہور گو"یا جہاں کہیں جاتا ہے امرا اس کی خاطر کرتے ہیں اور اگر وہ خود نوکری چاہتا ہے تو تھوڑی بہت نوکری بھی اسے مل جاتی ہے لیکن اگر وہ گھر بیٹھے اپنے دوستوں اور عزیزوں کی سفارش کرنی اختیار کرے تو کوئی اس کی طرف اصلا والتفات نہیں کرتا۔ یہی میرا حال ہے۔

مولانا نے ایک "آل نامہ" بھی لکھا تھا جو ان کی زندگی میں شائع نہیں ہوا کیونکہ اس میں ہر فرقہ اور گروہ پر چوٹ ہے۔ چند جملے انھوں نے اپنے ایک خط میں لکھے ہیں مثلاً المذہب.. اعلان جنگ الدین تقلید۔ آباؤ اجداد العلم قسمیں از جہل مرکب الامتحان ـــ

آزمائش لیاقت ممتحنان - ایونیورسٹی، کارخانہ کلرک سازی العلی گڈھ پارٹی - شہید وفا العلی گڈھ کالج - پرورش گاہ طفلان بدست مانیدران انجیمشن وجہ موجد برائے فیصلہ یک طرفہ"

ان خطوں میں کہیں کہیں ادبی نکات بھی ملتے ہیں مگر بہت کم - یہ زیادہ تر کاتب یا پوچھنے والے پر منحصر ہے - کسی نے اگر کوئی بات پوچھی ہے تو اس کا جواب معقول دیدیا ہے علاوہ اس کے یہ مجموعہ کامل نہیں ہے - بہت سے ایسے خط ہوں گے جو تلف ہو گئے ہیں - یا قابل مرتب کے ہاتھ نہیں لگے -

ان خطوں سے ایک اور حقیقت بھی معلوم ہوئی کہ جواہرات حالی میں جو حال میں شیخ محمد اسمٰعیل صاحب نے پانی پت سے شایع کئے ہیں یہ بعض نظمیں چھوٹے بچوں کے لیے مولانا کے نام سے درج ہیں، ان میں اکثر نظمیں مولانا کی لکھی ہوئی نہیں اصل حقیقت یہ ہے کہ مولانا کے خلف الرشید خواجہ سجاد حسین صاحب سے ان کے انسپکٹر تعلیمات نے بعض انگریزی نظموں کے ترجمے کی فرمائش کی - انھوں نے حامی بھر لی - اور مولانا کو لکھا - مولانا کو طوعاً کرہاً قبول کرنا پڑا - لیکن اس زمانہ میں مولانا علیل تھے اور علالت نے طول کھینچا تو انھوں نے یہ نظمیں مولوی محمد سعید صاحب مرحوم مدرس اول عربی وفارسی بورڈ ہائی اسکول دہلی سے لکھوا دیں - اور کہیں کہیں مناسب اصلاح کر دی -

آخر زندگی میں مولانا خانگی جھگڑوں اور فکروں سے بہت

عاجز آ گئے تھے اور چاہتے تھے کہ فراغت اور اطمینان سے بیٹھکر کچھ علمی کام کریں لیکن افسوس کہ یہ فراغت کبھی نصیب نہ ہوئی، بلکہ اس پہ حیرت ہے کہ ان تمام حالات میں انھوں نے اتنا بڑا کام کیونکر کر لیا۔ اردو ادب کے متعلق دو ایک کام ان کے پیش نظر تھے جن کا مسودہ انھوں نے خوب غور کر کے اپنے دل میں قائم کر لیا تھا۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ اپنی زندگی میں انھیں پورا کر دیں۔ لیکن اس کا موقع نہ ملا اور وہ سارے مسودے دل کے دل ہی میں رہ گئے، آخر میں ان کا ارادہ تھا (جیسا کہ خطوں سے معلوم ہوگا) کہ اورنگ آباد میں کچھ کام کریں لیکن علالت نے مہلت نہ دی اور اسی علالت میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تاہم وہ اتنا کچھ اور ایسا کچھ کر گئے کہ کسی ملک اور کسی قوم میں ہوتے تو ان کی ہستی قابل فخر سمجھی جاتی۔ ان کی زندگی علمی اور اخلاقی دونوں لحاظ سے ایسی پاک و صاف، خالص اور بے ریا ہے کہ ہمیشہ اہل وطن کی رہنمائی کرے گی اور اردو زبان پر تو ان کا اتنا بڑا احسان ہے کہ اہل زبان اس سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

ادب میں سیکڑوں دلکشیاں ہیں اس کی بے شمار راہیں اور ان گنت گھاتیں ہیں۔ لیکن خطوں میں جو جادو ہے (بشرطیکہ خط لکھنا آتا ہو) وہ اس کی کسی ادا میں نہیں، نظم ہو، ناول ہو، ڈراما ہو یا کوئی اور مضمون ہو غرض ادب کی تمام صناف میں صنعت گری کرنی پڑتی ہے اور صنعت گری

کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے بناوٹ کی باتیں جلد پرانی اور بوسیدہ ہوجاتی
ہیں صرف سادگی ہی ایک ایسا حسن ہے جسے کسی حال اور کسی زمانہ میں
زوال نہیں بشرطیکہ اس میں صداقت ہو۔ اور ہم میں سے کون ہے
جس کے دل میں سچ کی چاہ نہیں۔ یہ ہمارے خمیر میں ہے یہ ہماری فطرت
کے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ جھوٹا بھی یہ نہیں چاہتا کہ کوئی اس سے جھوٹ
بولے اور یہی وہ فطری تقاضا ہے کہ بعض اوقات ہم ایک سادہ سی
صداقت کی خاطر دلکش سے دلکش نظم اور دلچسپ سے دلچسپ ناول
کو اٹھا کر الگ رکھ دیتے ہیں ہماری ہر تصنیف وتالیف، ہماری ہر علمی
اور ادبی کوشش جو قلم سے نکلکر کاغذ پر آتی ہے غیروں کے لئے ہے
اور یہ سمجھ کر لکھتے ہیں کہ غیروں کے ہاتھوں میں جائے گی اور
غیروں کی نظریں اس پر پڑیں گی۔ اس لئے مصلحت وقت کا بھی
خیال ہوتا ہے۔ عبارت آرائی بھی کرنی پڑتی ہے تکلف بھی برتنے
پڑتے ہیں۔ خیال کو صاف صاف لکھنے کے بجائے طرح طرح کے پیرائے
اختیار کرنے پڑتے ہیں لیکن جب انسان اپنے کسی عزیز دوست کو
خط لکھتا ہے تو وہاں کوئی خیریت باقی نہیں رہتی بلکہ لبا اوقات دوئی
کا پردہ بھی اٹھ جاتا ہے وہ ہر مسئلہ اور ہر شے کے متعلق جیسا کہ اس
کا خیال ہوتا ہے۔ صاف صاف اور سچ سچ لکھ دیتا ہے وہ اپنی رائے
میں آزاد ہوتا ہے وہ نہ دوسروں سے چوکتا ہے اور نہ اپنے آپکو
چھوڑتا ہے اس وقت نہ اسے خوف لائم ہوتا ہے اور نہ نکتہ چیں کا

کھٹکا۔ خطوں کی یہی سادگی اور بے ریائی ہے جو دلوں کو لبھا لیتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہو سکتا۔ ان خطوں میں وہ مکتوب الیہ سے بلکہ اکثر اوقات اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے جو خیال جس طرح اس کے دل میں ہوتا ہے اسی طرح قلم سے ٹپک پڑتا ہے نہیں بلکہ وہ اپنا دل کاغذ کے ٹکڑے پر نکال کر رکھ دیتا ہے اور اگر وہ دل ایسا ہو جو سراسر درد سے لبریز ہو جس میں ہمدردیٔ بنی نوع انسان کوٹ کوٹ کے بھری ہو۔ جو پریم کے رس سے سینچا گیا ہو تو بتاؤ اس دل کی تراوش کیسی ہوگی؟ اگر تم اس دل کی زیارت کرنی چاہتے ہو تو آؤ دیکھو کہ وہ پاک دل ان خطوں میں لپٹا ہوا ہے۔

سید عبداللہ

مولانا حالی کی کتب سوانح

اردو جیسی نوعمر زبان سے یہ توقع رکھنا کہ اس میں اعلیٰ درجہ کی بیاگرافیاں موجود ہوں گی۔ ایک بے بنیاد خواہش ہے۔ خود فارسی کی ہزار سالہ ادبیات میں ایسی کوئی مکمل بیاگرافی موجود نہیں۔ جو جدید اصول سیرت نگاری کے معیار پر پوری اترے۔ مولانا شبلی حضرت عمرؓ کی سیرۃ کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ع

زہ بردم تیغ است قدم را

اور یہ خیال تمام بیاگرافیوں کے متعلق صادق آتا ہے۔

عربی لٹریچر، اپنی عمر کے پہلے تین چار سو سال میں ایک زندہ لٹریچر تھا اس کی بنیاد، صداقت، سچائی اور حقیقت پر تھی۔ مصنف جو کچھ لکھتے تھے۔ ان میں سب سے پہلے یہ دیکھتے تھے کہ ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ کہاں تک حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رجال کی زندگیوں کی تلاش میں جو عظیم الشان کام ان علماء نے جرح و تعدیل نے انجام دیا ہے

وہ ہمیشہ حقیقت پسندوں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے گا۔ ان کی نگاہوں سے مناقب کے ساتھ ساتھ مثالب اور مساوی کو بھی دیکھا۔ بڑے بڑے ائمہ حدیث کے متعلق بے لاگ رائیں لکھیں اور قاضی، ملا، شیخ اور صوفی جو سامنے آیا۔ امتحان کے ترازو میں تولا گیا۔

ان تمام مساعی کی غرض کیا تھی؟ صرف یہی کہ ان حضرات کی "حقیقی شخصیت" سامنے آئے ان کی ظاہری عظمت، ان کی اندرونی "انسانیت" کو بے نقاب ہونے سے نہ بچا سکے۔ دنیا کی نظر ان کے عبا وقبا پر پڑتی تھی لیکن ائمہ جرح و تعدیل ان بیرونی مظاہر سے گذر کر ان کو ان کے خلوت کدوں میں پر دیکھتے تھے

جرح و تعدیل کی ان کوششوں کی غرض اگرچہ بیاگرافی کے اصول کی ترتیب نہ تھی اور اس کے مرتب کرنے والوں کا مدعا بالکل جداگانہ تھا۔ تاہم "شخصیت حقیقی کی تلاش" ایک ایسا عنصر تھا۔ جو ایک مکمل بیاگرافی کے لئے شرط اولین ہے۔ یقیناً ہمارے ان اکابر علماء نے اپنی اس تلاش و جستجو کے ذریعے سیرۃ نگاری کے اس اصول اولین کی دریافت کرتے ہوئے اولیت کا فخر حاصل کیا ہے۔

لیکن تاتاری فتنوں نے جہاں مسلمانوں کی سیاسی قوت کو تباہ و برباد کر دیا وہاں افسوس کا مقام ہے، کہ علوم اسلامیہ بھی "سائنٹفک سپرٹ" سے خالی ہو گئے جو عہد اول کا مخصوص وصف تھا۔ اسکے بعد اسلامی ملکوں میں جو انحطاط آیا۔ اس کے ساتھ علوم و ادبیات میں

بھی تصنع، بناوٹ اور ظاہریت زیادہ ہو گئی۔ اور "حقیقت" تقریباً ناپید ہو گئی
ان حالات میں یہ بات چنداں تعجب کے قابل نہیں کہ اس زریں زمانہ کے بعد
نہ صرف اردو میں بلکہ اس کے سرچشموں یعنی عربی اور فارسی میں بھی حقیقی
اور مکمل بیاگرافیوں کی تعداد بہت کم ہے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ اس
طویل عرصے میں سوانح اور سیر بالکل مرتب نہیں کی گئیں۔ نہیں بلکہ ہم
یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ بیاگرافیاں مفقود ہو گئیں۔ جن کا مقصد کسی موضوع
کی "حقیقی تصویر" کھینچنا ہو اور جن میں ذات مع اپنے تمام خد وخال
کے جلوہ گر ہو"

اس تلخ حقیقت کے اسباب بے شمار ہیں۔ لیکن سب سے اہم
یہ ہیں کہ حملہ چنگیزی کے بعد ادبیات میں تقلید اور تتبع کا عرض پیدا
ہو گیا۔ قوم اور ملت سے روح آزادی یکسر چھن گئی۔ زندگی کے اندرون
و بیرون میں ایک تفاوت پیدا ہو گیا۔ اور حقیقت، بناوٹ میں
متشکل ہو گئی۔ تقلید کے مرض نے "تنقید صالح" کو معدوم کر دیا۔ اور
حق پرستی کی جگہ عقیدت نے لے لی۔ نتیجہ یہ کہ معاشرت، ادب اور
شخصیت کی تنقید معیوب قرار دے دی گئی۔ اب اس حقیقت سے کیسے انکار
ہو گا کہ جب "شخصیت" کی تصویر کشی میں سے "بشریت" کے رخ و رخسار
کو نکال دیا جائے۔ تو وہ شخصیت حقیقت کی ترجمان نہیں ہو سکتی۔ یہی
وجہ ہے کہ بیاگرافیوں کا جو دفتر عظیم ہمارے پاس موجود ہے۔ ان میں
تلاش کرنے پر بھی کوئی زندہ اور حقیقی بیاگرافی، نہ مل سکے گی، جو کچھ ہے

یا تو اولیاء اللہ اور صوفیائے کرام کے مناقب و خوارق سے لبریز ہے یا بادشاہوں، امیروں اور سپہ سالاروں کے رزم و پیکار کے واقعات ہیں۔ یا پھر شاعروں اور ادیبوں کی بے مصرف زندگی کے بے نتیجہ حالات ہیں۔ جن کے ساتھ ان کے اشعار بغیر تنقید کے درج کر دیئے گئے ہیں اگر قارئین گستاخی نہ سمجھیں تو یہ عرض کروں کہ اس نگارخانہ بے معنی، میں ایک تصویر بھی ایسی نہیں جس کی "شخصیت" زندہ ہو ہو کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کر سکے، اور جس کی ظاہریت کے اندر سے کوئی "انسانی نفسیات" جلوہ گر ہو سکے۔

غرض یہ کہنا غلط نہیں کہ تمام سرمایہ زبان اردو میں کوئی مکمل "Pure Biography" کی کتاب موجود نہیں۔ خود یورپ میں یہ شعبہ بہت پرانا نہیں۔ تا بہ اردو چہ رسد۔ سر سید احمد خاں نے مغربی ذوق کو ہندوستان میں رواج دینے کی جو کوششیں کیں اس کی بدولت وہ تعصب اور مخالفت مغربی چیزوں کے متعلق نہ رہی اور علاوہ دیگر امور کے علوم و ادبیات بھی ان سے متاثر ہوئے چنانچہ خود بیاگرافی کے متعلق بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے لکھنے والوں نے مغربی اصول و مبانی پر اپنی کتابوں کی بنیاد رکھی۔

اس کے باوجود یہ محسوس ہوتا ہے کہ بیاگرافی کے متعلق مصنفین کو وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی جو تاریخ کے متعلق ہوئی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ہمارے اکثر سوانح نگاروں کا مطالعہ ادبیات یورپ

بہت کم تھا۔ نیز وہ ان اصُول تنقید سے گہری واقفیت نہ رکھتے تھے جبکی پیروی کا ان کو دعویٰ تھا۔ مزید برآں یہ کہ ان کی مشکلات ناقابل عبور تھیں سب سے بڑی رکاوٹ جو اس سلسلے میں پیش آئی۔ وہ یہی کہ مصنفین جو مشرقی روایات سے متاثر تھے۔ اور دراصل اس ماحول میں تربیت پاکر نکلے تھے۔ جلد جلد اپنے گرد وپیش کے اثرات کو ترک کرسکتے تھے اور انھیں اپنے مخاطب لوگوں میں کتابوں کو مقبول بنانے کے لئے مشرق و مغرب کا امتزاج کرنا ضروری تھا۔ جس طرح تمدن و معاشرت کے اکثر مسائل میں ہندوستانی عموماً اور مسلمان خصوصاً ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ آیا ہمیں خالص مغربی طرز وروش اختیار کرلینی چاہیئے یا مشرق و مغرب کا امتزاج کرنا ضروری ہے بعینہ اسی طرح ادبیات میں بھی ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوسکا کہ ہمیں اپنے علوم وفنون کو خالص جدید تنقید کے ترازو پر تولنا چاہیئے یا نہیں۔ یہ حالت آج بھی موجود ہے چہ جائیکہ اس وقت جبکہ ابھی ملک میں جدید اثرات کے نفوذ کی عمر بہت کم تھی اور جب کے مغربی اثرات کو قبول کرنے کے لئے ملک بہت زیادہ آمادہ نہ تھا۔

جو کچھ مندرجہ بالا سطور میں لکھا گیا ہے۔ اس کو صاف کرنے کیلیے صرف ایک ہی مثال کافی ہے۔ جدید تنقید کی ایک بڑی شرط یہ ہے کہ سوانح نگار اپنے موضوع یا ہیرو کے کیریکٹر پر لکھتے وقت جہاں اس کے محاسن کی تصویر بنائے۔

وہاں بتقاضائے بشریت اگر اس میں کچھ عیوب اور کمزوریاں بھی ہوں تو ان کو بھی بلارد و رعایت ظاہر کرے تاکہ موضوع کی پوری شخصیت ہمارے سامنے آجائے۔

اسی ایک اصول کے متعلق ہمارے ایک عالی ترین مصنف کی رائے مشرقیت اور مغربیت کے درمیان ہچکولے کھاتی نظر آتی ہے۔ حالانکہ ہمارا مصنف "تنقید" کا امام اور جرح تعدیل کا "رہنما" قرار دیا جاتا ہے مولانا حالی نے جب سرسید کی لائف حیات جاوید لکھی۔ تو مولانا شبلی نے اپنے ایک مکتوب میں اس کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی۔ "حیات جاوید میں مولانا (حالی) نے سید صاحب کی یک رخی تصویر دکھائی ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کسی کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بدطینتی ہے۔ لیکن یہ اگر صحیح ہے تو موجودہ یورپ کا مذاق اور علمی ترقیاں سب برباد ہو جائیں۔ پھر ایشیائی شاعری میں کیا برائی ہے۔ سوائے اس کے کہ وہ محض دعوی کرتے تھے واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے تھے۔ بہرحال حیات جاوید کو مدلل مداحی سمجھتا ہوں۔

مولانا شبلی نے یہاں جو رائے ظاہر فرمائی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہیرو کے معائب دکھانا "تنگ خیالی اور" بدطینتی نہیں بلکہ یہ یورپ کے "مذاق اور علمی ترقیوں" کی اصل اور بنیاد ہے۔ نیز یہ کہ جہاں یہ وصف موجود نہ ہو۔ وہاں پیروی کی "تصویر یک رخی" ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مولانا اس معاملے میں یورپ کی اصول پیروی پر

زور دیتے نظر آتے ہیں اور جہاں تک ہمارا خیال ہے مولانا شبلی مناقب عمر بن عبدالعزیز کے ریویو میں اس طریقہ سوانح نگاری کو "فریب دہ" زیادہ قابل اعتراض" بلکہ خطرناک" خیال کرتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ قدیم طریقہ صرف سکوت کا مجرم تھا۔ لیکن موجودہ طریقہ در حقیقت خیانت اور خداعی ہے جو واقعہ نگاری سے مراحل دور ہے۔ اسی خیال سے واضح ہو جائے گا کہ ہمارے مصنفین، مغربی اصول تنقید پر عمل پیرا ہونے میں کسی درجہ مذبذب تھے۔ وہ ایک طرف اس کو "یورپ کے مذاق اور علمی ترقیوں" کی بنیاد قرار دیتے تھے لیکن دوسری طرف اپنے ماحول کی رعایت سے اس کو "قابل اعتراض" بلکہ "خطرناک" بھی سمجھتے تھے۔

یہ "زبان اردو" کے عظیم الشان مصنف شبلی کا حال ہے۔ جس کی تصنیفات دوسرے الفاظ میں کل "سرمایہ ادبیات اردو" ہیں۔

اردو میں "معاصرین کی لائف" کی کتابیں خصوصاً زمانہ زیر تبصرہ میں بہت کم ہیں۔ جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مصنفین میں وہ اخلاقی جرأت موجود نہ تھی۔ جو معاصرین کے محاسن و معائب بیان کرنے کے متعلق ہونی چاہیے۔

ہاں اتنے عظیم الشان کام کی مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کی عزت صرف حالی کے حصے میں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اردو میں سوانح نگاری کی "امانت" کا مستحق بھی انھیں سمجھتے ہیں۔

عام طور پر تاریخ ادب کے مصنفین نے اردو میں بیاگرافی لکھنے والوں کی تعداد دو حضرات تک ہی محدود رکھی ہے۔ یعنی مولانا حالی اور مولانا شبلی۔ لیکن ایک حیثیت سے ہم اس تعداد کو بڑھا کر چار تک لے جا سکتے ہیں۔ یعنی ان کے ساتھ شرر اور مولوی چراغ علی کے نام بھی شامل کئے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ صحیح معنوں میں مولانا حالی ہی ایک ایسے بزرگ ہیں جنھوں نے اپنا اکثر وقت اور اپنی اکثر توجہ سوانح نگاری کی طرف مبذول کی۔

ہم یہاں ان کی کتابوں کی ایک فہرست پیش کرتے ہیں۔ جو عام طور پر "سوانح" کے تحت میں شمار کی جاتی ہیں۔

مولانا حالی	(۱) حیات جاوید	مولانا شبلی	(۷) سیرۃ النبی
	(۲) یادگار غالب		(۸) الفاروق
	(۳) حیات سعدی		(۹) المامون
مولانا شبلی	(۴) مولانا روم		(۱۰) الغزالی
	(۵) بیان خسرو		(۱۱) سیرۃ النعمان
	(۶) شعر العجم	مولوی چراغ علی	(۱۲) بی بی حاجرہ
			(۱۳) ماریہ قبطیہ

شرر (۱۴) سوانح بزرگان دین (جو مضامین شرر میں ہیں)

ان کتابوں میں سے حیات جاوید ایک خالص بیاگرافی ہے۔ یادگار غالب حیات سعدی۔ بیان خسرو۔ شعر العجم اور مولانا روم میں سوانح کیساتھ تنقید

"ادبی تنقید" بھی ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان پر ادبی تنقید کے سلسلے میں تبصرہ ہونا چاہیئے۔ اگرچہ "سوانح مولانا روم" کو خود مولانا شبلی نے سلسلۂ کلامیہ میں شمار کرتے ہوئے اسے فلسفہ اور علم کلام کی کتاب قرار دیا ہے۔

اسی طرح الغزالی سلسلۂ کلامیہ کی ایک کڑی ہے۔ اور سیرۃ النعمان سوانح عمری کے رنگ میں "فقہ اسلامی کی تاریخ" ہے۔

سیرۃ النبی، الفاروق اور المامون تاریخ کی کتابیں ہیں۔ کیونکہ ان کا اسلوب از سرتاپا تاریخی ہے اور خود ان کے مصنف نے انکو "تاریخ" قرار دیا ہے۔

پس ان حالات میں ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم یادگار غالب، حیات سعدی وغیرہ کا ذکر سوانح میں کرنے کے بعد ان کو "ادبی تنقید" کے تحت میں بھی لائیں۔ الفاروق۔ سیرۃ النبی اور المامون کو خالص تاریخ کی کتاب سمجھیں۔ اور ان کے لئے وہی اصول تنقید تجویز کریں جو کتب تاریخ کے لئے ضروری ہے۔ باقی رہی الغزالی اور سیرۃ النعمان، سو ان پر سیرت اور فقہ و کلام ہر دو حیثیتوں سے نظر ڈالی جائے۔

ہم اس سے پہلے ذکر کر آئے ہیں کہ اردو میں خالص جدید طرز کی کوئی مکمل اور جامع بیاگرافی موجود نہیں۔ حیات جاوید یقیناً ایک مکمل بیاگرافی "کا اسلوب اپنے اندر لیئے ہوئے ہے لیکن یہ بھی ایک ناکام

کوشش ہے مولانا شبلیؔ کی کتابیں "مقدس ناموران اسلام" کی سوانح پر مشتمل ہیں لیکن ان کا رنگ تاریخی ہے۔ اور وہ "لائف اینڈ ٹائمز" کے طریقے پر لکھی گئی ہیں اور پھر مذہبی پہلو اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ جو اگرچہ اپنی جگہ بے حد مقدس اور متبرک کام ہے لیکن چونکہ ہمارے جذبات عقیدت ان بزرگوں کے متعلق تنقید کی اجازت نہیں دیتے۔ اور نہ ہم ان بزرگوں کی زندگی کو ایسی سطح پر سمجھتے ہیں۔ جہاں سے زید و بکر کا قلم تنقید ان کی رفیع اعلیٰ زندگی پر اٹھ سکے۔ اِس لئے۔ مولانا شبلیؔ کا کام اگرچہ نازک ہے لیکن کئی ذمہ داریوں سے آزاد بھی ہے۔

تاہم ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے مصنفین فرداً فرداً اپنے کام میں کسی حد تک کامیاب ہوئے جو فرائض اِن پر بطور سوانح نگار عائد ہوتے تھے۔ ان کی ذمہ داریوں سے کہاں تک عہدہ برآ ہوئے اور اس فن کے اصول و قواعد میں سے کن کن قاعدوں پر عمل پیرا ہوئے یا کن کن شرائط کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔ اور کیوں؟ ہم سب سے پہلے مولٰنا حالیؔ کو لیتے ہیں۔

الطاف حسین حالیؔ انصاری ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں متولد ہوئے یہ امر معنی خیز ہے کہ اس ہنگامہ خیز مقام کی خاک سے ایک ایسی متین اور خاموش شخصیت کا ظہور ہوا۔ جس کی خاموشیاں اپنے اندر ایک انقلاب پنہاں رکھتی تھیں اگرچہ ہم علمائے یورپ کی طرح ماحول کے اثرات کی ہمہ گیری کے مبالغہ کی حد تک قائل نہیں ہیں۔ تاہم یہ بات کسی

حد تک یہ یہی ہے۔ کہ کئی بار ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے مقام پانی پت سے اگر کوئی زندہ دل اُٹھے گا تو اس کی بصیرت اور نفسیات میں اس سرزمین کی انقلاب پرور تاریخ کے اسباق کا کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور ہوگا۔ حاؔلی کی زندگی کے واقعات کو بہ تفصیل بیان کرنا ہمارے مقصد سے باہر ہے۔ مختصراً یہ کہ حاؔلی کی تعلیم خالص مشرقی طریق پر ہوئی۔ اور انھوں نے چند مروجہ درسی کتابیں قدیم طرز کے اساتذہ سے پڑھیں۔

اس زمانے میں دہلی کالج پوری آب کے ساتھ چل رہا تھا جو اس دور میں مغربی اور مشرقی تعلیم کے امتزاج کے اصول پر عامل تھا۔ حالی جب پہلی دفعہ دہلی گئے تو انھوں نے وہاں بھی وہی قدیم درس اپنے سامنے رکھا۔ انھیں جدید طرز اور جدید خیالات سے اس درجہ بُعد تھا کہ اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں اقرار کرتے ہیں کہ میں نے اس زمانے میں "دہلی کالج کو آنکھ سے دیکھا تک نہیں" کسے معلوم تھا کہ جدید طرز کا اتنا مخالف کسی نہ کسی دن اُردو شاعری میں خود بھی ایک جدید روش کا علم بردار ہوگا اور عقائد میں معقول پرستی کا نقیب بن کر شہر بشہر پھرے گا کرشمہ قدرت اسی چیز کا نام ہے۔

۱۸۵۷ء میں جو قیامت صغریٰ برپا ہوئی۔ اس میں مولانا حاؔلی دہلی میں ہی قیام پذیر تھے اس عہد میں غاؔلب، ذوؔق اور شیفتؔہ بزم شعرو سخن کے لیے باعث زینت تھے، مولانا حاؔلی ان کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے لیکن وہ سب سے زیادہ شیفتؔہ کے رنگ میں

رنگے گئے۔ سلاست اور سادگی جو مولانا کی نظم ونثر کی جان ہے نواب شیفتہ ہی کے اثر سے ہے حالی خود لکھتے ہیں کہ غالب عام طور پر لوگوں کو فکر شعر سے روکا کرتے تھے لیکن ایک آدھ دفعہ میری غزل سن کر اُنھوں نے مجھے مشق سخن کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ حالی نے یادگار غالب لکھکر مرزا کی اس استادانہ تربیت کو وہ خراج تحسین ادا کیا ہے جو استاد اور رہنما کے لئے باعث فخر ہے۔

مولانا حالی کے اسلوب نظم ونثر میں واقعیت، سلاست، اور حقیقت کا عنصر کسی حد تک "عربیت" اور عرب شاعروں کے مطالعہ کا رہون منت بھی ہے۔ جن سے گہرا شغف اور جن کے کلام سے والہانہ دلچسپی مولانا کے لئے ان کی ابتدائی زندگی میں جاذب توجہ رہی۔ مولانا کی اکثر تصانیف میں ہمیں عربی اشعار، عربی ضرب الامثال، اور عربی جملوں کا استعمال بلا تکلف نظر آتا ہے۔ نمونہ کے طور پر حیات جاوید ملاحظہ ہو۔

حالی کی زندگی میں وہ سال ایک انقلاب انگیز سال تھا جب کہ وہ نواب مصطفٰے خاں کے ہمراہ پہلی دفعہ سر سید احمد خاں سے ملاقی ہوئے اور وہ چار ہوتے ہی مفتوح ہو گئے۔ سر سید بجا طور پر اس فخر کے مستحق ہیں کہ جو ان کے دائرہ اثر میں آیا ان کے ہی رنگ میں ڈوب کر نکلا اس کی کیفیت خود حالی ہی کی زبان سے سنیئے۔

چند روز اسی تردد میں یہ حال رہا۔ کہ ایک قدم آگے پڑتا تھا۔ دوسرا پیچھے ہٹتا تھا۔ ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے

ایک دشوار گذار راستے میں راہ نورد ہے۔ بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلتے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں بہت سے ابھی اس کے ساتھ اُفتاں وخیزاں چلے جاتے ہیں مگر ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی ہوئی ہیں پیروں میں چھالے پڑے ہیں۔ دم چڑھ رہا ہے چہرہ پہ ہوائیاں اُڑ رہی ہیں لیکن وہ اولوالعزم آدمی جو ان سب کا رہنما ہے اسی طرح تازہ دم ہے نہ اُسے رستے کی تکان ہے، نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پرواہ ہے۔ نہ منزل کی دوری ہے کچھ ہراس ہے اس کی چتونوں میں غضب کا جادو بھرا ہے کہ جس طرف آنکھ اُٹھاکر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کرکے اس کے ساتھ ہولیتا ہے اس کی ایک نگاہ ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔ ہمیں بہ بس کے تھکے ہارے خستہ دکوفتہ اسی دشوار گذار رستے پر پڑے ہیں نہ یہ خبر ہے کہ کہاں جاتے ہیں نہ یہ معلوم ہے کہ کیوں جاتے ہیں۔ نہ طلب صادق ہے، نہ قدم راسخ ہے۔ یہ عزم ہے نہ استقلال ہے نہ صدق ہے نہ اخلاص ہے۔ مگر ایک زبردست ہاتھ ہے کہ کھینچے لئے جاتا ہے۔

آں دل کہ دم نمودے از خوبرد جوانان
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

انگلو ہو بک اسکول میں مدرسی کے وقت سے آخر عمر تک وہ سرسید کے مداح اور رفیق کار رہے اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں جو گراں قدر اعلیٰ خدمات

انجام دیں وہ سر سید مرحوم کی تحریک و ترغیب کی وجہ سے سرانجام ہوئیں۔ مولانا کی شاعری نے اگرچہ بہت سے سرچشموں سے فیض حاصل کیا ہے جن کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے تاہم مسدس جیسی بے نظیر نظم سید صاحب ہی کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ بہرحال اس مسئلہ میں کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں ہے کہ حالی نے جو کچھ لکھا ہے ایک جذبہ قومی اور ملی سے متاثر ہو کر لکھا اور یہ جذبہ اسی مقدس بزرگ کا پیدا کردہ تھا۔

سید عبداللہ

مولانا حالی کی کتب سوانح

حیات جاوید

حیات جاوید اگرچہ تاریخی لحاظ سے حیات سعدی وغیرہ کے بعد آتی ہے لیکن اہمیت اور قدر و قیمت کے خیال سے ہم سوانح عمریوں میں سب سے پہلے اس کو لیتے ہیں۔ کیونکہ اگرچہ ابنائے روزگار نے اس کو چنداں شرف قبول نہیں بخشا۔ اور اس کے متعلق جو بدگمانی ملک و قوم میں پھیل چکی تھی۔ وہ اس کے محاسن کے بے نقاب کیے جانے میں حارج ہوئی۔ پھر بھی ہمارے لیے (جو خوش قسمتی سے اس پر آشوب زمانے سے بہت دور ہیں) سب سے زیادہ قابل توجہ امر یہ ہے کہ جن بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کے طفیل اس عظیم و جلیل شخصیت کی بزرگی جلوہ عام پہ نہ آسکی۔ وہ آہستہ آہستہ بہت حد تک رفع ہو چکی ہیں۔ پھر کونسا امر مانع رہ جاتا ہے۔ کہ ہم پرانی لکیر سے ہٹ کر اس گراں قدر تصنیف کو اس کے اصلی رنگ میں نہ دیکھیں۔ اور

انصاف اور تحسین کی کسوٹی ہاتھ میں لیکر کھوٹے اور کھرے کو خوب پرکھ کر یہ فیصلہ نہ کرے کہ فرزندان عصر نے اس متعلق جو رائے ظاہر کی اس میں منصفانہ تنقید کا حصہ زیادہ تھا یا ماحول کے اثرات سے پیدا شدہ سوء ظن کا!

سر سید احمد خاں (جن کی لائف حیات جاوید کا موضوع ہے) ایک جامع اوصاف شخص تھے ان کی زندگی گوناگوں مشاغل اور ہنگاموں کا مرکز اور ہزارہا عزائم اور مہمات کا منبع رہی ہے۔ پس ایک ایسی متنوع اور "ایک سر ہزار سودا" زندگی جس کی جزئیات عبور حاصل کرنے کیلئے نصف صدی بلکہ پورے ایک دور کا لٹریچر پڑھنا ضروری ہو۔ آسانی سے نہیں لکھی جا سکتی۔ اگرچہ خود سر سید نے جب پہلے پہل ان سے ان کی لائف کی ترتیب کے متعلق ذکر کیا جاتا۔ تو اکثر فرمایا کرتے تھے۔ کہ "میری لائف میں سوا اس کے کہ لڑکپن میں خوب کبڈیاں کھیلیں۔ کنکوے اڑائے۔ کبوتر پالے۔ ناچ مجرے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری۔ کافر اور بے دین کہلائے۔ اور رکھا ہی کیا ہے" لیکن کون نہیں جانتا کہ سر سید نے ان بظاہر انکسار آمیز لیکن پر حقیقت الفاظ میں اپنی شاندار زندگی کا نقشہ کھینچکر رکھ دیا ہے۔ ان کا مطلب سوا اس کے کیا ہے کہ ان کی لائف کا ابتدائی زمانہ "بشریت" کی تکمیل میں گزرا۔ اور آخری حصہ دین، مذہب اور قوم کی فلاح و بہبود کی کشمکش میں بسر ہوا۔

پس ایک ایسے شخص کے سوانح لکھنے کی ذمہ داری اتنی آسان اور

اس کی زندگی کے اختلافی پہلوؤں میں منصفانہ محاکمہ اتنا سہل نہ تھا۔ ایک طرف یہ مشکل کہ جس شخص نے مذہب، اخلاق، معاشرت، تعلیم، سیاست، لٹریچر۔ تنقید معاشرت، غرض حیات انسانی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پہ اپنے خیالات نہ ظاہر کئے ہوں۔ اس کے حالات کے دریائے بے پایاں کو سمیٹے تو کون؟

ادھر یہ دقت کہ جس شخص نے چالیس برس تعصب، روز قیامت سے نہ ختم ہونے والی جنگ جاری رکھی، تقلید کی جڑ کاٹی، نکتہ چینی کی بنیاد رکھی، جو رسوم صدیوں سے چلی آتی تھیں ان کو باطل کیا، جن عقائد کا نام اصول دین رکھ لیا گیا تھا۔ بدلائل ثابت کیا۔ کہ وہ فرقے بھی نہیں زمانہ مشرق کی طرف جارہا تھا تو اس نے مغرب کا رخ کیا۔ نتیجہ یہ کہ کسی نے اسے راست باز کیا۔ کسی نے کاذب۔ کسی کے نزدیک وہ ہمدرد قوم ٹھیرا کسی کے خیال میں دشمنِ دین وملت ایک طرف یہ آوازیں اٹھ رہی تھیں کہ مجدد دین آگیا، دوسری طرف یہ غل ہو رہا تھا کہ یہی دین میں بدعت کا دروازہ کھولنے والا ہے یہی فاسق وفاجر۔ بلکہ صریح کافر ہے۔ یہ اختلاف! یہ نزع! یہ مناظرہ! اس میں ثالث بالخیر کے فرائض انجام دے تو کون!

یہ بار گراں حالی نے سر پر اٹھایا۔ اور اس کی ذمہ داریوں سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہو کر ایک ایسی تصنیف یادگار چھوڑی۔ جو سوانح نگاری کے فن میں پہلی منظم اور باقاعدہ کتاب کہی جاسکتی ہے۔ مولانا سے قبل کرنل گریہم نے بھی انگریزی زبان میں ایک لائف لکھی۔

لیکن اس کے متعلق یہ رائے ظاہر کی گئی ہے۔ کہ وہ ایک مکمل بیاگرافی ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتی۔ اسی طرح حاجی اسمٰعیل خاں رئیس اتاولی کی تحریک سے منشی سراج الدین صاحب مالک مہتمم "چودھویں صدی" نے لائف کی داغ بیل ڈالی اور بہت حد تک اس کے لیے میٹریل جمع کرکے اس کو ایک خاص حد تک مرتب بھی کیا۔ لیکن وہ شائع نہ ہوسکی۔

مولانا حالیؔ نے ان دونوں سوانح عمریوں کے محاسن و معائب سے فائدہ اٹھایا۔ ان کی خوبیوں کو اپنی کتاب میں جذب کیا۔ اور ان کی کمزوریوں سے احتراز کیا۔

مولانا کو سرسید کی لائف لکھنے کا خیال پہلے پہل اس وقت پیدا ہوا۔ جبکہ وہ کالج کی بنیاد رکھ چکے تھے اگرچہ ان کا حال ابھی تک "پہلی رات کے چاند کا سا تھا۔ کہ کسی نے دیکھا۔ کسی نے دیکھا ہی نہیں"۔ تاہم ملک میں انکی خدمات کی قدر پیدا ہوچکی تھی۔ اس زمانے میں کچھ سوال مرتب کرکے برائے جواب مولانا نے سرسید کے پاس روانہ کیے۔ لیکن انھوں نے لائف کے خیال کو پسند نہیں کیا۔ بعض دوسرے لوگوں نے بھی یہی رائے دی۔ کہ سرسید کی لائف ان کی زندگی میں لکھنی مناسب نہیں۔ چنانچہ یہ ارادہ موقوف ہوگیا۔

لیکن یہ ارادہ ہمیشہ مولانا کے دل میں موجود رہا۔ اور آخر کار انھوں نے ۱۸۹۲ء میں علیگڈھ میں اس غرض سے قیام کیا۔ اور اس وسیع ذخیرۂ معلومات سے فائدہ اٹھایا۔ جو وہاں موجود تھا۔ نیز منشی سراج الدین صاحب کا

سودہ بھی حاصل کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس وسیع اور مصروف زندگی کے حالات کو جمع کرنے کے لیے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ۔ تہذیب الاخلاق اور سید صاحب کی جملہ تصانیف کو کھنگالا۔ ان کے خطوں۔ ان کے دوستوں کے بیانات، انگریزی اخباروں موافق اور مخالف رسالوں اور مدیران سلطنت کی تحریروں کا ایک ایک حرف پڑھا، اور اس سے مفید مطالب کا استقصا کیا گیا۔ اور ان کا نچوڑ اور خلاصہ نکال کر حیات جاوید کے اوراق میں بند کر دیا۔ حالی کے ایک دوست کے اس بیان میں کوئی مبالغہ معلوم نہیں ہوتا۔ کہ اگر اس تمام ذخیرے کو مرتب کیا جاتا تو اس کی وسعت کا احاطہ کرنے کے لیے کئی ضخیم جلدوں کی ضرورت ہوتی۔

حیات جاوید دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں زندگی کے حالات اور کارنامے بقید ترتیب تاریخی درج کئے گئے ہیں۔ اور دوسرے حصے میں کارناموں پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے مفصل مضامین کا اندراج اگرچہ یہاں بہت نامناسب خیال نہ کیا جاتا۔ لیکن اس کو موجب تطویل اور بے ضرورت خیال کرتے ہوئے اس موقعہ پر نظر انداز کیا جاتا ہے سرسید کی زندگی کے متعلق ہم نے گزشتہ اوراق میں جو کچھ لکھا ہے۔ اس کا ماخذ بہت حد تک حیات جاوید ہی ہے۔ نیز سید صاحب کی زندگی خود اتنی مستغنی از تعریف اور ان کے کارنامے اتنے بالا از تعارف ہیں۔ کہ یہاں ہم اس کو حذف کرتے ہوئے اس کے لیے معافی چاہتے ہیں اور اس تصنیف کے مقصد اصلی یعنی حیات جاوید کی تنقید کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ایڈمنڈ گوس

انسکلوپیڈیا۔ برٹانیکا میں بیاگرافی کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

BIOGRAPHY IS A FAITHFUL PORTRAIT OF SOUL IN ITS ADVENTURES THROUGH LIFE

یعنی "بیاگرافی" موضوع کی ہو بہو تصویر ہو۔ جو مکمل ہونے کے علاوہ حقیقت پر مبنی ہو۔ اور اس تمام تصویر کشی میں منتہائے نظر حرف صداقت کی ترجمانی ہو۔ پھر اس کے لیے ضروری ہے کہ مظاہر کی نقاشی کے ساتھ ساتھ موضوع کی اندرونی "شخصیت" اور "انفرادیت" بھی پوری صفائی کے ساتھ نمایاں کی جائے۔ ان صفات چہارگانہ کی طرح بعض اور اوصاف بھی ایسے ہیں جو سوانح نگار کے لیے بےحد ضروری ہیں مثلاً یہ کہ تصادم آرا کے وقت اخلاقی جرأت کا ثبوت دیتا ہو اور بیرونی اثرات سے بالکل متاثر نہ ہوتا ہو۔ موضوع کے معائب اور کمزوریاں دکھانے میں اسی طرح واقفیت کا خیال رکھے جس طرح محاسن کے بیان میں۔ موضوع کی شخصیت کی تصویر کشی میں ذاتی رجحان کو دخل نہ دیتا ہو۔ اور جذباتی، سیاسی، اور مذہبی محرکات سے وہ ہیرو کو واقعہ اور حقیقت کے خلاف نمایاں نہ کرے سوانح نگار کا مقصد محض "یادگار" ہی نہ ہو۔ کیونکہ اس عیب سے بیاگرافی ایک اچھی بیاگرافی کے پایہ سے گر جاتی ہے اور سب سے آخری بات یہ کہ ان ضروریات کے ساتھ ساتھ مصنف اس کو اسلوب بیان، ترتیب، اور واقعات کے حسن انتخاب سے ایک ادبی شاہکار بنائے یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اب تک حیات جاوید کے متعلق موافق اور مخالف آرا کا

اظہار ہو چکا ہے۔ جس کا خلاصہ یہاں یہاں درج کیا جاتا ہے۔

یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ سر سید احمد خاں کے تمام کاموں اور کارناموں کی طرح ان کی لائف کی اچھائی اور برائی کے متعلق شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگرچہ ان کے قدر دانوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ملک میں پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس وقت بھی پیدا ہو گئی تھی۔ تاہم چونکہ سید صاحب نے مذہب، اور سیاست دونوں میں ایک جدید خیال اور "دبستان" کی بنیاد رکھی ہے۔ جس سے اصولاً ایک گروہ کو دیانت دارانہ اختلاف تھا اور اب تک ہے۔ اس لیے حیات جاوید کے متعلق اظہار رائے میں بھی قدرتی طور پر تنقید کرنے والے حضرات دو گروہوں میں منقسم ہو گئے ہیں۔

ہمیں سب سے پہلے خود مصنف کے خیالات سن لینے چاہئیں کہ انھوں نے اس کتاب کی تصنیف میں کیا خاص اصول مدنظر رکھا اور کون سے آداب اور قواعد ہیں جن کی پیروی ضروری سمجھی گئی۔ حیات جاوید کے دیباچہ میں مولانا حالی فرماتے ہیں:۔

"اگرچہ ہندوستان میں جہاں ہیرو کے عیب و خطا کا معلوم ہونا اسکی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بیاگرافی کرٹیکل طریقہ سے لکھی جائے اسی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں۔ اور اس کے عالی خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں۔ چنانچہ اسی خیال سے

ہم نے دو ایک مضمونوں کا حال اس سے پہلے لکھا ہے۔ اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں۔ ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں۔ اور ان کے پچھوڑوں کو کہیں تھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اوّل تو ایسی بائیوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی..... لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے۔ جس نے چالیس برس برابر تعصب۔ اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے...... ہم میں وہ پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے۔ اور نکتہ چینی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے۔ اور نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔ اس لیے ضرور ہے کہ ان کے ہر کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ کیونکہ سچ میں اور صرف سچ میں یہ کرامت ہے کہ جس قدر اس میں زیادہ کرید کی جاتی ہے۔ اسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔"

ہم اس طویل اقتباس کی معافی چاہتے ہیں۔ لیکن اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ اپنی تصنیف کے متعلق خود مصنف کا بیان زیادہ وقیع سمجھا جایا کرتا ہے۔ اس بے حد قیمتی اور پر معنی عبارت میں مولانا حالی نے

سوانحمری کا نظریہ، اپنی مشکلات، پہلی سوانحمریوں کے نقائص اور موجودہ تصنیف کا اصول بیان کر دیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ چونکہ ہمارا ماحول ابھی تک یورپ سے کہ مکمل طرز سوانح نگاری کیلیے سازگار نہیں ہے اس لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ کہ سوانحمری یورپ کے طریقہ پر لکھی جائے۔

۲۔ پہلی سوانحمریوں (یعنی حیات سعدی اور یادگار غالب) میں صرف محاسن ظاہر کیے گئے ہیں۔

۳۔ حیات جاوید میں نکتہ چینی کی بنیاد رکھی گئی ہے اگرچہ سرسید نے جو کام کیا۔ اس کی بنیاد سچائی پر ہے اس لیے سوانح نگار کا فرض ہے کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں۔ کہ وہ جو کچھ کرتے تھے۔ سچائی کے ساتھ کرتے تھے۔ بہر حال ان کے خیالات، عقائد، اور کاموں پر نکتہ چینی ضروری ہے۔

سطور بالا سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ حالی ہیرو کے مصائب اور محاسن کی یکساں بے نقابی کو ضروری سمجھتے ہیں۔ علی الخصوص سرسید کے متعلق اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں۔ کہ جہاں تک سرسید کی بیرونی زندگی اور خارجی واقعات کی تصویر کا تعلق ہے۔ حیات جاوید ایک جامع کتاب ہے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ سید صاحب کی لائف پیدائش سے لے کر وفات تک۔ گویا ایک پوری صدی کی تاریخ ہے۔ ہمارا مصنف خاندان اور

خاندانی ماحول سے ابتدا کرتے ہوئے ان کی رحلت تک اپنے ہیرو کے ساتھ ساتھ سفر کرتا نظر آتا ہے۔ اور اس انتہائی مصروفیت کی زندگی کے کسی کارآمد لمحے میں کہیں بھی ساتھ نہیں چھوڑتا۔

سید صاحب دہلی کے سادات کے ایک معزز گھرانے میں متولد ہوئے۔ ان کی طفلی کے واقعات، خاندانی روایات، شرفائے دہلی کے رسوم و رواج جن میں سید صاحب پرورش پاتے ہیں۔ یہ سب کے سب پوری سلاست اور پاکیزگی کے ساتھ مصنف کے قلم سے نکلے ہیں۔ پھر اس دور سے گزر کر عنفوان شباب کا رنگین زمانہ آجاتا ہے۔ اس میں والدہ کی زبردست نگرانی اور تربیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ تقریب بسم اللہ کی جزئیات کا حال بتانے کے بعد تعلیم کا مفصل حال بتایا گیا ہے۔ تعلیم کی قیود اور پابندیوں سے گزر کر جوانی کی لغزشوں اور رنگینیوں کا ذکر آتا ہے۔ اور ان عیش و نشاط کی مجالس کی تفاصیل بیان کی ہیں۔ جن میں عام طور پر اس زمانے کے نوجوان زندگی کی بہاریں گزارا کرتے تھے۔ جن کے متعلق خود سرسید فرماتے ہیں کہ "ہم بھی اس رنگ میں مست تھے۔ اتنی گہری نیند سوتے تھے کہ فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے" لیکن دفعتہً بڑے بھائی کا انتقال ہو جاتا ہے جس سے سید صاحب کے خیالات میں ایک انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اب وہ پرانی شوخیاں مولویت اور زہد میں تبدیل ہونے لگتی ہیں۔

بہرحال ہمارا مصنف سید صاحب کی زندگی کے ہر دور کے متعلق

نہایت دلچسپ اور پر از معلومات جزئیات بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اور نہایت خوبی سے اپنے موضوع کی شخصیت کی تدریجی قارئین کے سامنے رکھتا جاتا ہے۔ اس پہلی منزل کے بعد ملازمت شروع ہوتی ہے۔ اس کے مختلف مدارج کی ساری تفصیلات مہیا کی گئی ہیں۔ مختلف ملازمتوں کے دوران میں کارکردگیوں کے واقعات بھی جمع کئے گئے ہیں۔ زمانہ غدر جو کہ ان کی زندگی اور ملازمت کا نہایت نازک دور تھا پوری جامعیت کے ساتھ مفصل لکھا گیا ہے۔ فتحپور، دہلی، رہتک، بجنور، غازیپور، بنارس، علی گڈھ، جہاں کہیں سید صاحب سلسلہ ملازمت تشریف لے جاتے ہیں مصنف ان سب مقامات کے متعلق ان کی خدمات اور فرائض منصبی کے حالات شرح وبسط کے ساتھ بیان کرتا ہے، اور اپنی عبارت کو اقتباسات کے ساتھ مربوط کرتا چلا جاتا ہے۔"

چونکہ کتاب کا پہلا حصہ ان کی زندگی کے موٹے موٹے واقعات کا خاکہ ہے۔ اس لیے انھوں نے اس تاریخی ترتیب سے ملازمتوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ سید صاحب کے تصنیفی کوششوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ غرض اس طریق سے یہ بخوبی نظر آجاتا ہے کہ ان کے تصنیفی رجحان کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ اور کسی طرح حالات اور اثرات اور ماحول کے بدلتے رہنے سے ان کے رجحان میں بھی اہم انقلابات آتے رہے۔ گویا ہم جام جم، انتخاب الاخوین اور تحفہ حسن سے جو سید صاحب

کی ابتدائی تصانیف ہیں۔ آہستہ آہستہ ملبند ہوتے ہوتے ان کے ساتھ خطبات احمدیہ اور تفسیر القرآن تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور سید صاحب کی ان تبدیلیوں کے اسباب اور محرکات خارجی بھی تدریجاً ہماری سمجھ میں آتے جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا سطور میں یہ ذکر آچکا ہے کہ مصنف نے سید صاحب کے ماحول کے اثرات کا مفصل حال کتاب میں درج کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نادانستہ طور پر اس زمانے کی معاشرت رسوم و رواج اور اوضاع و اطوار زندگی کی ایک تاریخ سی بن گئی ہے۔ جو اگرچہ بیاگرافی کے ساتھ گہرا اور لانیفک تعلق تو نہیں رکھتی۔ لیکن بیاگرافی کی تکمیل کے لیے بہرحال ممدات میں سے ہے۔ حیات جاوید کا ابتدائی حصہ جس میں سید صاحب کے خاندانی حالات، تعلیمی واقعات اور شرفا کی سوسائٹی کے قصے ہیں۔ کتاب کی افادی حیثیت میں بہت اضافہ کرتا ہے۔

مولانا حالی نے جس ڈھنگ سے اس وسیع ذخیرہ معلومات کو چند صفحات میں جمع کر دیا ہے۔ اگرچہ اس سے بعض نقائص بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ جن کا ذکر آگے چل کر کہیں آئے گا۔ لیکن اس سے ایک فائدہ یہ ہو گیا ہے کہ موضوع کی پوری شخصیت جہاں تک کہ اس کے مظاہر کا تعلق ہے۔ کمال صحت کے ساتھ نمایاں ہو گئی ہے۔ گویا حیات جاوید کے اوراق میں ہمیں سرسید اپنی عظیم و جسیم بزرگانہ شخصیت سمیت نظر آتے ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی سرسید عمارتوں کے کتبات پڑھنے کے لیے چھینکوں پر

تک رہے ہیں۔ اور مولانا صہبائی گھبرا جاتے ہیں اور ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو جاتا ہے۔ کبھی غدر کے پر آشوب فتنوں کے اندر "نا محمود خاں" کے ساتھ الجھتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی مسٹر بیڈن فارن سکریٹری حکومت ہند کے ساتھ اسباب بغاوت ہند کے متعلق پر جوش مباحثہ ہو رہا ہے کہیں سائنٹیفک سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا ہے کہیں خطبات احمدیہ کے لیے "خواب و خور حرام ہو رہا ہے" اور خطوں میں لکھا جا رہا ہے کہ "ظروف خانگی بھی بیچ کر خطبات کے لیے رقم مہیا کرو" پھر تہذیب الاخلاق میں قوم و ملک کے اخلاق کی اصلاح و تہذیب کے ہنگامہ پرور مضمون چھپ رہے ہیں۔ اور مولوی امداد علی اور علی بخش خاں کے ساتھ معارضے ہیں۔

اب وہی سر سید ہیں کہ علی گڑھ کالج میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں اور "زندہ دلان پنجاب" سے روپیہ وصول کر رہے ہیں۔ کچھ وقت اور گزرتا ہے۔ کہ سمیع اللہ خاں سے تو تو میں میں کرتے سنائی دیتے ہیں آخر میں کبھی نہ خاموش ہونے والی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہیں۔ کہ "اب وہ وقت قریب ہے کہ ہمیشہ چپ رہنا ہو گا اس لیے خاموش رہنے کی عادت ڈالتا ہوں" تا آنکہ ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کو یہ "سیماب مجسم" سپرد خاک کر دیا جاتا ہے اس کے بعد قوم، ملک ابنائے وطن اور حکومت کی طرف سے جو ماتم ہوتا ہے، وہ پورے پورے اقتباسات کی شکل میں کتاب میں درج کیا گیا ہے تاکہ اس جوش و خروش کی گہرائی اور

وسعت کا اندازہ ہو سکے۔ جو اس نامور بزرگ کی وفات کے غم نے پہنائے ماتم پیدا کیا۔

کتاب کا دوسرا حصہ اور بھی جامع دلکش اور پر از معلومات ہے۔ سید صاحب کے اوصاف و محاسن ان کی خدمات، ان کی تحریکوں کی سپرٹ ان کے اخلاق و عادات اور تصنیف و تالیف کے طریقے اور دیگر بے شمار مباحث و مضامین ایسے ہیں جن میں سید صاحب کی شخصیت اور سیرت بہت حد تک نمایاں کی گئی۔

مفصل اقتباسات جو بعض جگہ طبیعت کے لیے بار ہیں۔ سوانح کی جامعیت کو قائم رکھنے کا مقصد پورا کر رہے ہیں۔

سر سید نے اپنی زندگی میں مذہب، معاشرت اور سیاست کو اپنا مرکز بنائے رکھا۔ حیات جاوید ضمنی طور پر اپنے زمانے کی سوسائٹی کے قلب و دماغ اور معاصرین کے رجحان مذہبی و نفسی پر بھی ایک طرح کا تبصرہ ہے۔ یہ کتاب ہمارے سامنے اس ماحول کی پوری صورت نمایاں کرتی ہے۔ جس میں سید صاحب نے اپنے مشن اور تحریک کی ابتدا کی اور اس حد تک اس کو زیور تکمیل سے آراستہ بھی کر دیا۔ حیات جاوید کو پڑھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہم اس زمانے کی سیر کر رہے ہیں۔

جدید کتابیں جو خالص فنی نقطہ نگاہ سے لکھی جاتی ہیں۔ ان میں ان اثرات کا سراغ بھی لگایا جاتا ہے۔ جنھوں نے "ہیرو" کی ذہنیت رجحان اور جماعتی شعور کے بنانے میں کوئی حصہ لیا ہو۔ اگرچہ خالص فنی

خیال ہے ہم شاید حالی کی اس کتاب کو اس معیار کے مطابق مکمل ثابت نہ کر سکیں گے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے مصنف نے اپنی اس کتاب میں ان اثرات خارجی اور ان کے عمل اور ردِ عمل دکھانے کی بہت حد تک کامیاب کوشش کی ہے۔ خاندان کا اثر بچپن میں والدہ کی تربیت کا اثر، سیاسی وتابع اور مذہبی الخطاط کا اثر، شادی کا اثر۔ بیوی کے مرجانے کے بعد متاہل نہ ہونے کا اثر، تصنیفی رجحان کی پختگی کے اسباب غرض بے شمار چیزیں حیات جاوید میں ایسی مل جائیں گی۔ جن کے صحیح ہونے میں ہم کوئی کلام نہ کر سکیں گے۔ "اثرات کا سراغ لگانا" اگرچہ حالی کی جدت نہیں لیکن چونکہ حالی کے زمانے میں یورپ کی ادبیات کی وساطت سے اس اصول تصنیف کا علم ہندوستان میں مصنفین کو ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ کامیاب (APPLICATION) یقیناً ان کی تصنیف کے محاسن میں سے ہے۔ ایک اور ضروری سوال ابھی باقی ہے اور وہ یہ کہ مولانا حالی نے جو تصویر سرسید کی بنائی ہے کیا وہ ان کی مکمل اور ہو بہو تصویر ہے؟ گزشتہ سطور میں ہم لکھ آئے ہیں کہ حیات جاوید جہاں تک شخصیت کے مظاہر کا تعلق ہے ایک جامع کتاب ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں اس میں یہ نقص نظر آتا ہے کہ سرسید کی "شخصیت" کے ساتھ ساتھ ان کی نفسیات کے بیان کرنے سے اکثر قاصر رہی ہے۔ اس میں سید صاحب کے مشن، ان کے کارناموں، انکی خدمات اور ان کے مشاغل و فرائض پر ایک مفصل تبصرہ تو ضرور ملیگا۔

لیکن "بشریت" کے خدوخال نمایاں کرنے کی بہت کم کوشش کی ہے۔ دراصل اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ حالی کا مقصد اس کتاب کے لکھنے سے یہ ثابت کرنا تھا کہ سید صاحب کہاں تک اپنے مشن میں حق بجانب تھے اور کہاں تک اس میں کامیاب ہوئے؟ پس جہاں تک فرض و غایت اصلی سے بحث ہے۔ حالی اس میں کامیاب ہوئے لیکن "بشریت" کا بے نقاب کرنا ان کے مقاصد میں تھا نہ انھوں نے اس کی کوشش کی۔ اگرچہ ہم ضرورت سے زیادہ یورپ اور ان کے اصول تنقید کی نقالی کو پسند نہیں کرتے لیکن بایں اعتبار کہ خود حالی نے خود اس طرز سوانح نگاری کو سراہا ہے یہ کہنا بے جا نہیں کہ انگریزی زبان کی بعض عمدہ سوانح عمریوں میں بڑے بڑے ہنگاموں اور معرکوں کی زندگی کے بین سطور میں مصنفین کو "بشریت" کی جو رنگینیاں نظر آئی ہیں اور بشری محاسن و معائب کے جو خصائص ان کو مل سکے ہیں۔ وہ انھوں نے بلاتکلف اپنی بیاگرافیوں میں درج کرتے ہوئے اپنے موضوع کی "شخص" اور "ذاتی" زندگی کو زیادہ نمایاں کیا ہے۔ مسٹر جان اسٹریچی نے ملکہ وکٹوریہ کی جو لائف لکھی ہے وہ ہمارے اس خیال کی تائید کے لیے کافی ہے۔ حیات جاوید کے سلسلے میں ہماری یہ توقع غالباً حد سے بڑھی ہوئی مغرب پسندی نہ سمجھی جائیگی کیونکہ یہ شرط خود مولانا کے نزدیک سوانح نگاری کے لیے ضروری ہے۔ یہ چیز یورپ کے "ملامت پسندوں" کے اس طریقے سے جدا ہے۔ جو عیوب کے بے محابا اعلان و افشا پر فخر کرتے ہیں۔ اس طرح یہ حضرت

فرائڈ (FREUD) کے جدید طریقہ "تجزیہ نفسی" سے بھی مختلف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کتاب میں اسی حسن کو ظاہر کرنے کے لیے روزمرّہ کے "وہ واقعات یا نجی خطوں کے وہ شگفتہ اور بے ساختہ لکھے ہوئے فقرات جن میں کاتب اپنی ذات یا خودی یا انجام سے غافل ہوتا ہے۔ بہت کارآمد ہوتے ہیں۔ سنجیدہ تحریر میں اور باقاعدہ سوچی اور سمجھی ہوئی گفتگو میں جن کا تعلق زیادہ تر انسان کی سوشل ذمہ دارانہ پبلک زندگی سے ہوتا ہے وہ لطف نہیں پیدا کر سکتیں۔ جو پرائیوٹ زندگی کے بعض لطائف سے ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے سرسید کے خطوط بھی بہت حد تک (SERIOUS) خشک اور پُر از متانت ہیں۔ اور ان سے بھی ہمارا مقصد پورا نہیں ہو سکتا اس سے بظاہر مولانا حالی کے لیے ایک جائز عذر موجود ہے کہ ایک ایسا شخص جس کی زندگی سراپا متانت، یکسر مقصد، مکمل تبلیغ و تحریک ہو۔ اس کی لائف میں یہ آب و رنگ آئے تو کہاں سے؟

لیکن اگر ہمیں معاف کیا جائے۔ تو یہ عرض کیا جائے کہ یہ کسی حد تک اس اسلوب اور رجحان طبع کے طفیل بھی ہے۔ جو حالی کا خاصہ ہے۔ سرسید کی متین اور سنجیدہ زندگی کے لیے حالی کی متانت سے زیادہ کسی اور چیز کی ضرورت بھی تھی۔ اور وہ جوش بیان اور شگفتگی ہے جس سے حالی کسی حد تک محروم ہیں۔

نہ صرف یہ کہ سید کی زندگی ان دلچسپ ذاتی اور "بشری" جزئیات سے پُر لطف نہیں بنایا گیا۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ ایسی جزئیات ہیں بھی بہت کم!

نو کھارٹ کی "لائف آف اسکاٹ" اور باسول کی "لائف آف جانسن" کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں روزمرہ کے معمولی واقعات سے زندگی کے خاکہ میں خوبصورت رنگ بھرا گیا ہے لیکن حالی کی کتاب ان بیل بوٹوں سے بہت حد تک خالی ہے۔ بچپن کے مطابق جو کچھ لکھا گیا ہے یا شاید عنفوان شباب کا حال بے شک پرلطف ہے۔ اخلاق وعادات اور طرز تصنیف و تالیف کا باب دلکش ہے۔ لیکن مفصل نہیں۔

اب جہاں تک "اخلاقی جرأت" کا سوال ہے مولانا حالی اس وصف سے ایک بہت بڑی حد تک متصف تھے۔

اگرچہ ان کا عام لب و لہجہ اپنی معاشری زندگی میں اور تصانیف میں بھی نرم تھا لیکن صداقت کو نمایاں کرنے اور موضوع کے عیوب کو ظاہر کرنے میں اپنے عام اسلوب کے ماتحت انھوں نے اکثر مقامات پر اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔ خود ان کا سرسید احمد خاں کے ساتھ ان کے مشن میں شامل ہونا ان کی تحریکات میں ان کی ہم نوائی کرنا اور سب پر مستزاد یہ کہ ان کا ایک ایسے مختلف فیہ موضوع کو اپنی تصنیف کا موضوع بنانا اس کا ثبوت ہے کہ ان میں صداقت کو نمایاں کرنے کی اخلاقی جرأت تھی۔ اگرچہ "ماحول" اور "فضا" سے مرعوب ہونے کا خود اقرار کرتے ہیں "اور کرٹکل بیاگرافی لکھنے کو" ہندوستان میں بے کار خیال کرتے ہیں۔ جہاں "ہیرو" کے ایک عیب یا خطا کا معلوم ہونا اسکی تمام خوبیوں اور فضیلتوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔

مولانا شبلی نے حیات جاوید کے متعلق جو شدید نکتہ چینی کی ہے۔ اس کے ساتھ اتفاق یا اختلاف کرنا تو محض اصول و معانی کے معیار پر ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کا لب و لہجہ قدرے سخت ہے "حیات جاوید کو میں لائف نہیں بلکہ کتاب المناقب سمجھتا ہوں اور وہ بھی غیر مکمل" پھر فرماتے ہیں کہ یہ "..... لل مداحی ہے" پھر ارشاد ہوتا ہے "یہ یک رخی تصویر ہے اور اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ کس کے معائب دکھانے تنگ خیالی اور بد طینتی ہے" اگر اس آخری فقرے سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ مولانا حالی کا خیال ہے تو یہ واقعات کے خلاف ہے۔ کیونکہ مولانا "بیاگرافی" کے لیے اس وصف کو ضروری سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک محاسن کے ساتھ معائب دکھانے ضروری ہیں۔ علی الخصوص "سرسید" کے تمام اعمال پر نکتہ چینی کرنا ان کے نزدیک بہت ضروری ہے کیونکہ انھوں نے ہی "نکتہ چینی" کی بنیاد رکھی ہے۔ مولانا اس اصول کے قایل تھے اور انھوں نے اس کا نمایاں الفاظ میں دعوے کیا ہے۔ ہاں اس بارے میں مشرقیت ضرور آڑے آتی ہے جو مولانا شبلی کے نزدیک (اور ہمارے نزدیک بھی) ایک خوبی ہے۔

لیکن دیکھنا یہ ہے کہ واقعی مولانا نے اس اصول کی پابندی کرتے ہوئے سرسید کے محاسن و معائب کا پلہ برابر رکھا ہے اور ان کے ذاتی کیرکٹر کے علاوہ ان کے پبلک کیریکٹر کی خامیوں کو بے نقاب کیا ہے؟

اگر معاصرین پر جنبہ داری اور گروہ بندی کا الزام درست بھی ثابت ہو جائے۔ تو موجودہ نسلیں جو اپنی مصیبت میں شاید اس قدر

شدید نہ ہوں ۔ حالاتِ گزشتہ کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے غالباً کسی رائے پر پہنچ سکتی ہیں ۔ آج سر سید کے مشن، ان کی تحریکات کے فوائد اور نقصانات ان کے مذہبی خیالات اور سیاسی عقائد کا عمل اور ردعمل ہمارے سامنے ہے ۔ حالات کے مطالعہ کے بعد ہم بہ جرأت کہہ سکتے ہیں کہ مولانا حالیؔ نے جو تصویر سید صاحب کی پیش کی ہے وہ ہو بہو نہ تھی اور ان میں عقیدت اور محبت کو شامل کیا گیا ہے ۔ اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ان اقوال و عقائد کے لیے جو تاویلات کی گئی ہیں ۔ ان کے خلاف بھی قوم کے شعور اور ضمیر نے عرصہ ہوا بغاوت کر دی ہے ۔ مولانا شبلی سید صاحب کی جماعت کے ایک ممتاز فرد تھے ۔ لیکن غالباً سب سے پہلے وہی تھے جنھوں نے سید صاحب کے خیالات و عقائد سے علحدگی اختیار کرتے ہوئے قوم کے لیے فکر کی ایک نئی راہ کھول لی ۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود ہم کہیں گے کہ مولانا حالیؔ نے صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہو گا ان کا اعلیٰ معیارِ زندگی، انکا پاکیزہ اخلاق ان کی سادہ اسلامیت سب اس بات کے شاہد ہیں ۔ سید صاحب کے ساتھ انھیں جو خلوص تھا ۔ ان کے جوشِ اسلامی اور حبِ قوم سے ان کے دل میں جو ولولہ محبت پیدا ہوتا تھا ۔ ان کے کارناموں اور مخالفین کی ضد اور جہالت کا جو اثر ان کے قلب پر ہوتا تھا ۔ اس کا تقاضا تھا ۔ کہ وہ اپنے "محبوب" رہنما کے متعلق بادل نخواستہ بھی کوئی ایسی بات نہ لکھیں ۔ جس میں ان کی نیت اور فعل پر شبہ ہو سکے ۔ حالیؔ کچھ تو فضا اور ماحول سے مجبور تھے ۔ جہاں ہیرو کے

نقائص سننے کی لوگوں کی عادت ہی نہیں۔ کچھ انھوں نے تنقید کے ایک اصول پر ضرورت سے زیادہ عمل فرمایا۔ جس کو اپنے "موضوع کے ساتھ دلچسپی اور ہمدردی" کہا جاتا ہے۔ پس بقول مہدی حسن مرحوم "ایک شریف نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگزشت لکھی ہے۔"

مولانا حاؔلی نے سید صاحب کی جن باتوں کو سراہا ہے اور جن اختلافی معاملات میں ان کی جنبہ داری کی ہے۔ ان میں واقعی مولانا کی دیانتدارانہ رائے یہی ہو گی۔ خواہ آج مکان و زمان کے اس دقیقہ کی حالت میں ہمیں دونوں بزرگوں سے اختلاف کرنے کی گستاخی کرنی پڑے۔

ہماری شرقی عقیدت کا تقاضا ہے کہ ہم سؔرسید اور مولانا حالی دونوں بزرگوں کے کارناموں پر نکتہ چینی نہ کریں اور بقول مہدی حسن مرحوم اس "ہمدردانہ سرگزشت" کے اوراق کو داغدار نہ بنائیں۔ لیکن افسوس کہ یورپ سے ہم لوگوں کو جو "ایمان بالغیب" ہو گیا ہے۔ اور یورپ نے جس فن تنقید کے "تریاق" یا "اثر سموم" کو پھیلا دیا ہے۔ وہ مجبور کر رہا ہے کہ قوم اور ملک کی رائے بعض مباحث و معاملات میں "ہیرو" کے بعض کاموں سے اختلاف کرے۔

سید صاحب کی زندگی میں بعض واقعات ایسے ہیں جن سے ان کی ذات ہمیشہ سے بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا محل بنی ہوئی ہے۔ اور مشکل یہ ہے کہ حیات جاؔوید کی تاویلات اور بیانات کے باوجود وہ غلط فہمیاں ملک میں موجود ہیں۔ اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ مرور زمانے نے ان میں سے

بعض کو تجربے کی روشنی میں صاف کر دیا ہے۔

بعض اختلافی مسائل جو مابہ النزاع ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ "ایام غدر" میں سید صاحب کا طرز عمل۔

۲۔ سید صاحب کا مغربی تمدن" کو پسند کرنا اور اس کے بعض پہلوں کو اختیار کر لینا۔

۳۔ سید صاحب کا مذہب کو معقولات کے تابع کر دینا۔ اور بعض ایسے عقاید کا انکار جو مسلمات میں سے تھے اور بعض کا اقرار جو دین میں پہلے موجود نہ تھے۔

۴۔ سید صاحب کا آخری عمر میں سید محمود کے ہاتھوں میں کھیلنا اور پرانے رفقاء سے اختلاف "رسٹی بل کے واقعات۔

۵۔ سید صاحب کا انڈین نشنل کانگریس سے الگ رہنا اور مسلمانوں کے لیے الگ سیاسی حکمت عملی کا وضع کرنا۔

سید صاحب نے ایام غدر میں جو طرز عمل اختیار کیا اور ضلع بجنور میں باغیوں سے جس طریق سے صف آرائی کی۔ وہ باغیوں کے نکتہ نگاہ سے قابل مذمت تھا۔ اور اب بھی جو لوگ اس لڑائی کو "بغاوت" سے زیادہ کچھ سمجھتے ہیں۔ وہ سید صاحب کی کارروائیوں کو اچھا نہیں سمجھتے لیکن ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں۔ ہم مولانا حالی کی اس رائے کے ساتھ اتفاق کرتے ہیں کہ سید صاحب نے عاقبت بین کے خیال سے نہایت دیانتدارانہ یہی ضروری سمجھا کہ باغیوں کی مخالفت کی جائے۔

لیکن یہ عذر اس بات کو جائز نہیں ٹھراتے کہ سید صاحب "تاریخ سرکشی بجنور" میں محمود خاں رئیس بجنور کو "نا محمود خاں" کہہ کر پکاریں۔

سید صاحب مغرب اور مغربی تمدن کے اس درجہ دلدادہ ہو گئے تھے کہ نہ صرف اس کے مظاہر سے ان کو دلچسپی تھی۔ بلکہ اس کی "سپرٹ" کے بھی عاشق تھے۔ سید صاحب نے اس محبت اور وابستگی کی وجہ سے جو "لباس وطعام ومکان اور طرز ماند وبود اور طرز معاشرت" وغیرہ انگریزی طریقے پر اختیار کر لیا تھا۔ حالی اس کو تعلیم یافتہ ترکوں کا طریقہ" کہتے ہیں۔ حالانکہ حیات جاوید کے اوراق میں ترکوں کی محبت کی کوئی اور مثال نہیں ملتی۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ ہیرو کے بعض عیوب یا بعض خصائص کو اچھے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ ہندوستانیوں نے جس وسیع پیمانے پر اب مغربی تمدن کو اختیار کر لیا ہے۔ اس کے پیش نظر یہ امر چنداں قابل اعتراض نہیں رہا لیکن چونکہ اس زمانے کی سوسائٹی میں یہ طریقہ بود وماند پسندیدہ نہ سمجھا جاتا تھا اس لیے حالی نے اس کو ایک مرغوب لباس بنانے کی کوشش کی ہے۔

سید صاحب نے انگلستان سے ایک خط میں لکھا "کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے ساتھ تہذیب وشائستگی میں وہی نسبت رکھتے ہیں۔ جو ایک وحشی بدصورت ایک لائق اور خوبصورت آدمی کے ساتھ رکھتا ہے۔"

مولانا حالی کا سکوت بلکہ بامعنی تاویل بیداری ہندوستان کے موجودہ

سلہ حیات جاوید۔ ص ۲۲۳

دور میں گرفت سے بالکل باہر نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ مولانا حالی نے سید صاحب کی حد سے بڑھی ہوئی مغرب پسندی اور "تفریح" کو صحیح رنگ میں پیش نہیں کیا۔ بلکہ ان تمام حالات کو وہ روغن دینے کی کوشش کی ہے۔ جو قابل ہو اسی طرح جہاز پر "گردن مروڑی" مرغی وغیرہ کے متعلق جس قدر ازالہ شبہات کیا گیا ہے وہ بھی فرائض سے غفلت کا ثبوت ہے اور ایک طرح کی "وکالت ہے"۔

سید صاحب نے مذہب اور عقل کی جنگ یا ان کی باہم مصالحت کے سلسلے میں جو اجتہاد کئے ہیں ان کے متعلق صرف اتنا لکھنا کافی خیال کیا گیا ہے "اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر مسئلہ مختلف فیہ کی نسبت جو کچھ سر سید نے لکھا ہے۔ وہی صحیح ہے اور ایک اختلاف میں انہی کی رائے صائب ہے" لیکن .... "جہاں کہیں مولانا حالی نے کسی کمزوری کا ذکر کیا ہے اس کے بعد ایک بڑی سی "لیکن" لکھ کر کمزوری کو محاسن میں تبدیل کرنے کی کوشش بھی کر دی ہے۔ سید صاحب کے اکثر اجتہاد سے حالی کو شدید اختلاف تھا اور انکے نزدیک سید صاحب غلطی پر تھے۔ لیکن اس کو ظاہر کرنے میں چشم پوشی کو روا رکھا گیا ہے۔ ان تمام معاملات میں حالی یہ فرماتے ہیں کہ اس سے مذہب کو سائنس کے حملوں سے بچانا مقصود تھا۔ لیکن نصف صدی گزر چکنے کے بعد بھی کون کہہ سکتا ہے کہ "مذہب" سائنس کے حملوں سے بچ گیا۔ ہاں ہم میں مغرب پسندی ضرور پیدا ہو گئی۔ اور مذہب کو دیکھنے کے لیے مغربی زاویہ نگاہ اختیار کر لیا گیا۔

اسی طرح دیسی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے اور علوم مشرقیہ کو زندہ

کرنے کے مسئلے میں مولانا حالی نے سید صاحب کو ایک ایسے رنگ میں پیش کیا ہے۔ جو کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ سید صاحب آخری عمر میں سید محمود کی رائے سے بے حد متاثر ہو جاتے تھے "قانون ٹرسٹیان" کے سلسلے میں سید صاحب نے جس ضد اور سختی کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے کالج کے وقار اور شہرت اور خود ان کے سکون دل کو بہت صدمہ پہنچا۔ انھوں نے اس بل کو منظور کرانے کے لیے جو جائز ناجائز طریقے اختیار کئے وہ اس جلیل القدر شخصیت کے شاندار محاسن کے پہلو میں زیبا نہیں معلوم ہوتے نواب وقار الملک جو سید صاحب کے زبردست مداح تھے لیکن اس بل کے معاملے میں ان کے مخالف تھے۔ ایک پمفلٹ میں لکھتے ہیں[1]۔

"کہ صرف اس پر قناعت نہیں کی گئی کہ مروت سے ہی کام نکل سکے بلکہ اس سے زیادہ کارروائی ہوئی ہے میں نے بچشم خود سید صاحب کی وہ تحریر بھی دیکھی ہے اور سید صاحب نے اس کو مخفی بھی نہیں رکھا کوئی دقیقہ اس بات کے لیے اٹھا نہیں رکھا ہے کہ رائے دینے والے سید محمود کے حق میں رائے دیں۔ رائے دینے والوں کو یہاں تک خوف دلایا گیا ہے کہ اگر وہ سید صاحب کی تجویز سے اتفاق نہ کریں گے۔ تو سید صاحب صرف سکریٹری کے عہدے سے ہی استعفا نہ دیں گے بلکہ جو مدرسہ کے متعلق اس وقت تک ہوا ہے اس سب کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیں گے۔"

ان دنوں میں سید صاحب کی طبیعت میں جو کمزوری اور ضد پیدا

---

[1] وقار حیات۔ ص ۴۹۵

ہوگئی تھی - وہ یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ[1] "اب جو آپ کے قلم سے ناں نکل گئی تو خدا ہی ہے اس کی جگہ ہاں نکلے"

ان تمام تنازعات میں مولانا حالی سید صاحب کی "ڈسپاٹک طبیعت" کا اقرار کرتے ہوئے ان کے طرز عمل کو کسی حد تک "استحسان" کا لباس پہنا چاہتے ہیں - اور فرماتے ہیں[2] - کہ "اگر فرض کر لیا جائے - کہ سرسید کی رائے اس باب میں خطا پر تھی - تو بھی جب ٹرسٹی بل قاعدہ کے موافق پاس ہو چکا تھا تو کالج کے ہوا خواہوں کو اسے سر پر رکھنا چاہیے" ہوا خواہان کالج کے بارے میں جو ارشاد ہوا - بجا اور درست! لیکن سید صاحب کے متعلق ہم کیا قطعی رائے قائم کریں - کہ اس شور و شر میں یا حق بجانب تھے یا غیر حق بجانب!

حالانکہ واقعات یہ ہیں کہ اس زمانے میں خود مولانا حالی سید صاحب کی مخالفت میں دوسروں کے ساتھ شریک تھے - اور ان دنوں کالج کی اصلاح کے متعلق جو سلسلہ مضامین اخبارات میں نکلنے کو تھا - مولانا حالی کا نام بھی ان میں ہوتا۔[3] لیکن حیات جاوید میں جو پاس ادب ملحوظ ہے وہ شرقی عقیدت اور خاطر داری کا پہلو لیے ہوئے ہے - ع

نام نیک رفتگاں ضائع مکن تا بماند نام نیکت برقرار

---

[1] وقار حیات ص ۱۰۸ نواب وقار الملک کا ایک خط

[2] حیات جاوید ص ۲۹۲

[3] وقار حیات - ص ۲۰۷

ایک لحاظ سے یہ بھی قابل داد ہے!

سید صاحب نے انڈین نشنل کانگریس سے مسلمانوں کو من حیث القوم الگ رکھا۔ گویا "درحقیقت انھوں نے (سید صاحب نے) مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا کہ ایک خار دار جھاڑی میں جو شاید اوروں کے لیے درخت باردار ہو۔ ان کا دامن الجھنے نہیں دیا"[1] اگرچہ آج بھی اسلامی سیاست کا رجحان ادھر ہی ہے لیکن اب ہوا کا رخ تبدیل ہو گیا ہے اور حالات میں اس قدر انقلاب آگیا ہے کہ سید صاحب کی رائے پر دیر تک قائم رہنا ممکن ہے مضر ثابت ہو۔ کیونکہ اب تو "اسیران قفس" نے "بر نخل خانہ صیاد آشیاں بستند" کے مصداق حکومت کے مسند پر قدم رکھ دیا ہے۔

مولانا حالی پر اس خاص معاملہ میں بھی بطور سوانح نگار ہمارا یہ اعتراض ہے کہ انھوں نے سید صاحب کی اس رائے کے لیے اپنی طرف سے جو تاویلات پیش کی ہیں، یہ کام ان کے فرائض سے خارج تھا۔

اس تمام بحث کے بعد نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ مولانا حالی نے سید صاحب کی یہ لائف اگرچہ مفصل اور تمام حالات کی جامع لکھی ہے اور کسی نہ کسی جگہ دبی زبان سے ان کے طرز عمل اور رائے کی مخالفت بھی کی ہے لیکن ہے "ہمدردانہ" بلکہ "بے حد ہمدردانہ" اور بعض جگہ سعی تاویل کی وجہ سے واقعی "مدلل مداحی" معلوم ہوتا ہے۔

یہ صحیح ہے۔ کہ "تنقید" کا معنی قطع و برید اور تنقیص نہیں بلکہ "ہمدردانہ تبصرہ"

---

[1] حیات جاوید۔ ص ۳۰۶

ہے لیکن "ہمدردانہ" سے مطلب یہ ہے کہ ہم "موضوع" کو اس کے ماحول اور خاص حالات سے مجبور پاکر اس کی مشکلات پر ہمدردی سے نظر ڈالیں اور اس کے نقطہ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کریں نہ یہ کہ وہ نقائص جو مسلم طور پر نمایاں ہوں اور ان میں شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ ان کی بھی تاویل کریں۔ سید محمود صاحب کے حق میں سید صاحب کی مسامحت اور مولانا حالی کی اس کے متعلق تاویل بلکہ خاموشی ناقابل درگزر ہے۔

مولانا نے حیات جاوید کے باب "ریفارمیشن" میں سید صاحب کے مصلح اعجد یا رفارمر ہونے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ وقایع نگاری نہیں بلکہ وکالت ہے (ص ۲۸۲ - ۲۸۶) اسی محبت کے جوش میں فرماتے ہیں۔ "علمائے سلف میں سے کسی شخص نے عام اصلاح کا ارادہ نہیں کیا" (ص ۲۷۷) حالانکہ مسلمانوں کی تاریخ اس کی تردید کر رہی ہے۔

مسلمانوں کی انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی جو مخالفت تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ مسلمان "ابتدائے اشاعت اسلام سے جس ملک میں گئے اور جہاں جاکر رہے۔ مستثنیٰ صورتوں کے سوا کبھی ان کو غیر ملک اور غیر قوم کی زبان سیکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوئی۔" (ص ۲۶۶)

آپ فرماتے ہیں کہ "وہ طبعی نامناسبت جو تیرہ سو برس سے ان میں متوارث چلی آتی تھی۔ ایک اجنبی زبان کو سیکھنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔" (ص ۲۶۷) حالانکہ ایران، ہندوستان، اور چین کی مثالیں اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ مسلمان جہاں گئے۔ انھوں نے کچھ عرصے کے بعد

ملک کی دیسی زبانوں کو اپنایا۔ اور ان میں وسیع لٹریچر پیدا کیا۔ ہاں اس کلیہ کے کچھ مستثنیات بھی ہیں۔

ہم حیات جاوید کے معنوی محاسن و نقائص کے موازنے سے فارغ ہو چکے اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ اس تصنیف کی ظاہری خصوصیات کیا ہیں؟ اور یہ کہاں تک ایک ادبی تصنیف قرار دی جا سکتی ہے؟ یہاں بطور جملہ معترضہ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یورپ میں (جس کی ہم اعلاناً یا عملاً تقلید کرتے ہیں۔ خواہ اقرار باللسان نہ ہو) بیاگرافی کا موجودہ رجحان یہ ہے کہ بیاگرافی کی خوبی میں (FORM) کا۔ بہت زیادہ حصہ نہیں۔ بلکہ اصل چیز ضروریات میں سے ہے۔ وہ یہ ہے کہ "موضوع" کی واقعی اور حقیقی تصویر کھینچی جائے اور اس میں صداقت کا پورا خیال رکھا جائے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ماننا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موضوع کی ہوبہو تصویر بنانے کے لیے بہر حال قلم، الفاظ اور ترتیب الفاظ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ تصنیف کو ایک ادبی شاہکار بنانے کے لیے واقعیت اور صداقت کا خون نہیں ہونا چاہیئے۔

اسی خیال کے تحت ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ حیات جاوید کی ظاہری خصوصیات یعنی ترتیب مضامین، اسلوب بیان، اور زبان کا سرسری جائزہ لے لیں۔ اگرچہ یہ وہ مضمون ہے۔ جس کے متعلق اردو ادب کے مورخین بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ لہذا اس سلسلے میں ہمارے لیے ان کی خوشہ چینی

لہ Horold Nicolson

شاید چنداں معیوب نہ سمجھی جائے۔

حیات جاوید ایک طویل اور ضخیم تالیف ہے اور ہو سکتا ہے کہ یہ صفات اس حد سے بڑھے ہوئے جوش عقیدت کے سبب ہو۔ جس کا ذکر گزشتہ سطور میں آچکا ہے ہم مصنف کے ممنون ہیں کہ ان کی مساعی سے سرسید کی طویل اور پراز واقعات زندگی کے مفصل حالات ہمیں مل گئے ہیں جو مواقع بوجہ معاصر ہونے کے انھیں حاصل تھے۔ یا جو نظران کی اس زمانے کی تاریخ، ماحول اور علمی ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کے متعلق تھی۔ وہ کسی بعد میں آنے والے کو قدرتاً حاصل نہ ہو سکتی تھیں اندریں حالات یہ مبارک بات ہوئی کہ سید صاحب کی لائف کا بیش بہا ذخیرہ ہمارے ادب میں پیدا ہو گیا ہے۔ ملک میں حالی کی ذات اور ان کے کارناموں کے متعلق جو خوشگوار دلچسپی نشوونما پا رہی ہے کیا ہم اس سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ کوئی فاضل حیات جاوید کا ملخص تیار کرتے ہوئے اردو ادب میں قیمتی اضافہ کریں گے۔ جس سے سرسید اور مولانا حالی کی ارواح پرفتوح کو مسرت حاصل ہو گی اور ملک اور ادب پر احسان ہو گا۔

حیات جاوید کے مطالعہ سے باوجود اس کی ضخامت اور طویل الذیل ہونے کے ایک طرح کا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ اس سے سید صاحب کی لائف کا حال زیادہ تفصیل کے ساتھ ذہن نشین ہو جاتا ہے لیکن اس بات کا کچھ جواب نہیں کہ بعض اوقات لمبے لمبے اور پے درپے اقتباسات بارِ خاطر ہو جاتے ہیں۔ اور اگر ان کے مضامین کو سمیٹا جاتا تو شاید زیادہ دلکشی

پیدا ہو جاتی۔

کتاب سہولت کے خیال سے دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلے حصے میں سید صاحب کی زندگی کے واقعات اور کارنامے (علمی۔ مذہبی۔ سیاسی) گنائے گئے ہیں حصہ دوم میں انہی کاموں پر مفصل تبصرے ہیں۔ اس ترتیب اور تقسیم سے تکرار، اور طول پیدا ہو گیا ہے اور یہ بھی ضخامت کو بڑا بنانے والا ایک عنصر ہے۔ اصولاً تو اس تقسیم پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن بیاگرافی میں ادبی، سیاسی، اور علمی تنقید کا عنصر ضرورت سے زیادہ داخل ہو گیا ہے (جو بجائے خود بہت قابل قدر ہے)

اسلوب بیان کی خصوصیات وہی ہیں جو ایک لمبی کتاب کے لیے ضروری ہیں۔ فقرے سادہ لیکن طویل، بیان منطقانہ اور مدلل، تحریر سے صداقت، خلوص، ہمدردی، اور یک رنگی ظاہر ہو رہی ہے، ہر ہر پیراگراف سے مولانا حالی کی شخصیت جلوہ گر ہو رہی ہے۔ مصنف کو اپنے "ہیرو" کے متعلق جو گہری واقفیت ہے۔ اس کا راز ہر ہر سطر سے آشکارا ہوتا ہے۔ اس لیے بعض بعض بیانات میں مصنف کا اضطراب تفصیل اور جامعیت کے لیے چھلک رہا ہے۔

کتاب میں سید صاحب کی علمی، ادبی، سیاسی، اور مذہبی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ اور اس سلسلے میں کئی موقعوں پر خالص فنی اور اصطلاحی بحث وتحیص کی ضرورت پڑی ہے۔ لیکن بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنے عام اسلوب کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہی سادگی۔ وہی پاکیزگی،

وہی متانت قائم رکھتے ہیں۔ تفسیر القرآن کے متعلق جو تنقید و تبصرہ ہے۔ اس میں خالص دینی اصطلاحات کا آنا ناگزیر ہے۔ لیکن کوشش یہی ہے کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے آسانی سے سمجھا جائے۔

مولانا کی علمی اور پبلک زندگی کی سب سے بڑی شان یہ ہے کہ ان میں "خود پسندی" بالکل نہیں۔ سرسید کی لائف میں جن کے ساتھ عمر کا بہت سا حصہ انھوں نے بسر کیا۔ اس بات کے بے شمار مواقع تھے کہ وہ سید صاحب کے کارناموں کے ضمن میں اپنی شہرت، علمیت اور بڑائی کا صور بھی پھونکیں لیکن سوائے چند شاذ مقامات کے ان کا اپنا ذکر اس ضخیم کتاب میں کہیں نہ ملے گا۔

اس خوبی کے ساتھ ایک وصف یہ بھی ذکر کرنے کے قابل ہے کہ انھوں نے طعن و تعریض سے اکثر احتراز کیا ہے۔ مولانا حالی نے حیات جاوید میں مولانا شبلی کے رسالہ "مسلمانوں کی سرگزشت" پر جو اظہار کیا ہے اس میں ناراضگی یا مخالفت کا شائبہ تک نہیں۔

لیکن یہی مولانا شبلی ہیں جنہوں نے حالی کی حیات جاوید کے متعلق جو شدید نکتہ چینی کی ہے۔ اس کا اب و لہجہ درشتی کی طرف مائل ہے۔ مقالات میں امام ابن تیمیہ کے ذکر میں مجدد کے اوصاف و شرائط کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "لیکن آج کل صرف یورپ کی تقلید کافی ہے۔" (ص ۲۶۸) مولانا حالی نے سید صاحب کے مجدد یا ریفارمر ہونے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے یہ اسی پر چوٹ ہے۔[1]

---

[1] اس بحث کے لیے مشہور انشاپرداز مہدی حسن کا مضمون "شبلی حالی کی معاصرانہ

اس قسم کی تعریفیں حالی کی تحریروں میں بہت کم پائی جائیں گی۔

کہا جاتا ہے کہ مولانا حالی اپنے اسلوب بیان میں سرسید کے مقلد تھے اور غالباً یہ زیادہ غلط نہیں، سید صاحب کی تحریروں میں عالمانہ صفائی نہیں تھی۔ مولانا حالی کی تحریروں میں علمیت کی شان نظر آتی ہے۔ ہاں سید صاحب کی طرح الفاظ کی تراش، تشبیہہ و استعارہ کے تکلفات شاعری اور خیال آرائی، بات کم اور عبارت طویل، قافیہ پیمائی اور جادو طرازی، ان کی کتابوں میں نہ ملے گی۔ نظم و نثر دونوں میں انھوں نے اپنے اس شعر پر عمل کیا ہے ؎

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تم

حیات جاوید میں مولانا کا طرز تحریر تشریحی ہے۔ مثلاً ایک واقعہ بیان کرتے ہیں پھر اس کی تشریح اور توجیہہ کے لیے بہت سا وقت صرف فرماتے ہیں۔ جس سے ان کی یہ کتاب "تبلیغی" بن گئی ہے۔ لیکن یہ نقص شاید صرف حیات جاوید میں پایا جاتا ہے، اس معاملے میں حیات سعدی اور یادگار اور مقدمہ شعر و شاعری بے عیب ہیں۔ کیونکہ وہاں "ہیرو" کی صفائی پیش کرنے کے لیے انھیں اتنی بے قراری نہیں۔

موجودہ تصنیف میں ایک خاص بات بہت نمایاں ہے (اور شاید دوسری تصانیف بھی کسی حد تک اس میں شریک ہیں) اور وہ یہ ہے کہ

چینک" ملاحظہ ہو۔

بعض جگہ بے موقع "وعظ و نصیحت" شروع کر دیتے ہیں اور مسلمانوں کو حسن اخلاق اور ہمدردی قوم پر ابھارتے ہیں۔ جس سے یہ سوانح عمری، "یادگاری" اور "تبلیغی" بن جاتی ہے۔ لیکن یہ چیز اس زمانے کے ماحول اور کتاب کے مقصد کے مطابق ہے۔ کیونکہ اس عہد کے اکثر مصنف اسی طریق عمل کے پابند ہیں۔

حالی میں جوش بیان کی کمی ہے۔ سید صاحب کو ۱۸۵۷ء کے ماحول میں دکھلاتے ہیں لیکن تمام واقعات کا ذکر اس سکون سے کر رہے ہیں، گویا کہ وہ ایک قوم کا خفیف سا اضطراب تھا۔ جس میں نامور شخصیت کی سوانح نگار کے لیے وہ حیات جاوید جیسی کتاب لکھتے ہیں۔ اس کی وفات کی تقریب پر صرف معاصرین کے مراثی اور ماتمی تقریروں اور تحریروں پر اکتفا کرتے ہیں اور زبان قلم مارے شدت غم کے بعض رسمی الفاظ سے آگے نہیں بڑھتی گذشتہ سطور میں سٹائل کی جن کمزوریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے لیے مستثنیات تلاش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہر کلیہ کے لیے "مستثنیٰ" کا ہونا ضروری ہے۔

از جناب خواجہ غلام السیدین صاحب

مسدس کی مصلحانہ شان

ملک میں کچھ دنوں سے یہ خیال پھیلتا جاتا ہے کہ فنون لطیفہ کا مقصد صرف ذوقِ حُسن کی تسکین ہے، انھیں کسی دوسرے مقصد کا تابع کرنے سے ان کی لطافت جاتی رہتی ہے۔ شاعری فن لطیف ہے۔ اُسے اخلاق کی اصلاح سے کوئی واسطہ نہیں شاعر اور مصلح کا میدان الگ الگ ہے۔ شاعر کی چوٹ دل پر پڑتی ہے، مصلح دماغ کو سلجھانے اور سنوارنے کی فکر کرتا ہے۔ شاعر کے لیے دل آئینۂ حُسن ہے اور مصلح کے لیے حسن آئینۂ حق اخلاقی مضامین کو نظم میں بیان کرنے کا نام شاعری نہیں ہے۔

اس خیال کے لوگ سمجھتے ہیں کہ شاعر جن جذبات اور خیالات کو شعر میں ادا کرتا ہے وہ خود بخود اس کے نفس کی گہرائیوں سے پھوٹ نکلتے ہیں اور ان کی سوتیں گرد و پیش کی زندگی میں ڈھونڈھنا بے کار ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ادب، شاعری مصوری بلکہ انسانی تخلیق کے تمام مظاہر دراصل زندگی سے وابستہ اور اس کے دست نگر ہیں۔ مانا کہ شاعر جن جذبات اور خیالات کو حسین الفاظ کا جامہ پہناتا ہے، انھیں اپنے دل کی گہرائیوں سے ڈھونڈھ کر لاتا ہے۔ لیکن آخر دل میں وہ کہاں سے آتے ہیں؟

وہ اس کے تجربوں اور مشاہدوں، اُس کی گزاری مسرتوں اُس کے بیتے ہوئے دکھ درد کا ثمر ہوتے ہیں بے شک شاعری خالی خولی وعظ کا نام نہیں اگر جوشِ موعظت شاعری کی روح پر غالب آجائے تو شعر شعر نہیں رہتا لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ شاعری محض الفاظ کے اُتار چڑھاؤ بندش کی چستی، ترکیبوں کی خوبی سے عبارت نہیں، بازی گر کی طرح الفاظ سے کھیلنا اور چیز ہے اور الفاظ کو دل کا ترجمان بنا کر آپ بیتی اور جگ بیتی کو دل لگتے انداز میں بیان کرنا اور چیز ہے۔ جن شاعروں کی قسمت میں حیاتِ دوام آئی ہے اُن کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ اُن کی خودی وسیع ہو کر سارے جہان پر محیط ہو گئی تھی، قطرے نے دریا میں فنا ہو کر عشرت ابدی حاصل کر لی تھی، انھیں اپنے ابنائے جنس کی خوشی سے خوشی اُن کے غم سے غم ہوتا تھا۔ اُن کے عروج میں فخر، اُن کے زوال میں ندامت محسوس ہوتی تھی۔

چیست انسانی؟ تپیدن از تپِ ہمسائگاں　　　　از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن

اچھا شاعر ہونے کے لیے یہ انسانیت ضروری ہے اور نجد وعدن کا اتحاد رشتہ لازم۔

اب حالی کی طرف آئیے۔ حالی کو حساس اور درد آشنا دل ملا تھا اور حق پسندی اور حق گوئی کا جوہر عطا ہوا تھا۔ تربیت نے دین داری کو ان کی طبیعت میں راسخ کر دیا تھا۔ جب انھوں نے ہوش سنبھالا اور اپنے ماحول پر نظر ڈالی تو ایک عبرت خیز اور دردناک نقشہ نظر آیا۔ انھوں نے خود اس منظر کو ان الفاظ میں دکھایا ہے۔

"قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں، شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جاتے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے

پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ اُمرا، جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں، غافل اور بے پرواہیں۔ علما، جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں"۔

یہی نقشہ تھا جس کو حالی کے خوں چکاں قلم نے مسدس میں اس طرح کھینچا ہے:-

پھر اک باغ دیکھے گا اجڑا سراسر | جہاں خاک اُڑتی ہے ہر سو برابر
نہیں تازگی کا کہیں نام جس پر | ہری ٹہنیاں جھڑ گئیں جس کی جل کر

نہیں پھول پھل جس میں آنے کے قابل
ہوئے روکھ جس کے جلانے کے قابل

جہاں زہر کا کام کرتا تھا باراں | جہاں آکے دیتا تھا رو ابر نیساں
تردسے جو اور ہوتا تھا ویراں | نہیں راس جس کو خزاں اور بہاراں

یہ آواز پیہم وہاں آرہی ہے
کہ اسلام کا باغ ویراں یہی ہے

کیا حالی کے لیے یہ ممکن تھا کہ وہ ملت اسلامیہ کے اس اجڑے باغ کا نظارہ دیکھنے کے بعد گل و بلبل کی شاعری میں نازک خیالیاں دکھاتے ہے بے شک ایسے شعرائے کرام بھی اس زمانے میں گزرے، جن کے پاس آنکھیں تھیں لیکن انھوں نے دیکھا نہیں کان تھے لیکن سنا نہیں، دل تھا لیکن کچھ محسوس نہیں کیا۔ قوم کا گھر جلتا رہا اور وہ روم کے شہنشاہ نیرو کی طرح بیٹھے بانسری بجایا کیے۔ لیکن حالی کے دل و دماغ پر اس آگ کا دھواں چھا گیا اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑا۔ حالی کی شاعری چوٹ کھائے ہوئے دل کی فریاد ہے، مگر کس کے دل کی؟ وہ ایک فرد واحد الطاف حسین حالی کا

دل نہیں، بلکہ ایک قوم وملت ایک تہذیب وتمدن کا دل ہے، جو اپنی وسعت میں ایک جہانِ درد وآرزو کو لیے ہوئے ہے۔ حالی کی شاعری میں سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محض اُن کے جذبات وکیفیات کا آئینہ نہیں بلکہ ایک پوری قوم کی داستان عروج وزوال ہے۔

دوسری خصوصیت شاعر کی نظر کی رسائی اور رائے کی اصابت ہے۔ اس نے قوم کی نبض پر ہاتھ ہی نہیں رکھا بلکہ مرض کی صحیح تشخیص کرکے مناسب دوا بھی تجویز کی۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ بڑے بڑوں کی عقلیں یہاں جواب دے چکی تھیں۔ لوگ افراط وتفریط میں گرفتار تھے۔ بعض قدامت پرستی کے بندے ماضی کے نشے میں سرشار، یہ چاہتے تھے کہ جدید علوم اور تمدن کو بالکل مسترد کردیں، بعض تہذیب مغرب سے مسحور ہو کر اپنی قومی روایات اور خصوصیات کو اُس پر قربان کرنے کو تیار رکھتے۔ اس نازک موقع پر حالی کی عقل سلیم نے شمع ہدایت کا کام دیا۔ انھوں نے ایک طرف مسدس میں مسلمانوں کو اُنکے عروج کی داستان سنائی اور اُن کی خودداری اور عزت نفس کو اُبھارا انھیں اسلام کے بھولے ہوئے اُصول یاد دلائے دوسری طرف مغربی تہذیب وتمدن کا جائزہ لے کر اسکی اُن خصوصیات کی طرف توجہ دلائی جو مغربی اقوام کی ترقی اور فروغ کا باعث ہوئی ہیں۔ انکی حق پسندی نے اپنے تمدن کی برائیوں پر پردہ ڈالنا گوارا نہیں کیا اور نہ دوسروں کی خوبیوں کے اعتراف میں کوتاہی کی۔ انھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک ہم اپنے آپ کو جدید ذہنی ہتھیاروں سے مسلح نہیں کریں گے کارزارِ حیات میں قدم رکھنے کے قابل نہیں ہوسکتے۔ یہی وجہ ہے کہ حالی کا سارا کلام خصوصاً مسدس جہاں دل درد آشنا کیلئے ایک مرثیہ کا حکم رکھتا ہے، وہاں عقل سلیم کے لیے دعوت فکر اور سرچشمہ ہدایت ہے۔

غدر کے بعد مسلمانوں کے زوال کی سب سے بڑی علامت یہی تھی کہ ان کی قومی سیرت مسخ ہو گئی تھی اور ان تمام صفات کے بجائے جو ان کی ترقی کا باعث ہوئی تھیں ان پر تعصب پست ہمتی، غلامی جھوٹ اور ریاکاری مسلط تھی اور ستم یہ تھا کہ متاع کارواں کے ساتھ "احساس زیاں" بھی زائل ہو گیا تھا۔ اس وقت کوئی تعمیری تحریک ایسی نہ تھی جو دوبارہ مسلمانوں کی تنظیم کرے۔ خدا بھلا کرے سرسید کا جنھوں نے اس نازک وقت میں علیگڈھ تحریک کی بنیاد ڈالی اور تمدن، تعلیم اور علم و ادب میں ایک نشاۃ ثانیہ کا آغاز کیا۔ یہ تحریک محدود معنی میں صرف تعلیمی تحریک نہ تھی، بلکہ اس کا مقصد قوم میں ایک عام بیداری پیدا کرنا تھا، تاکہ اس کا جمود، افسردگی اور ناامیدی دُور ہو جائے اور وہ دوبارہ اجتماعی معاملات میں تخلیقی جد و جہد کر سکے۔ اس تحریک کی زبان حالی تھے، جنھوں نے اس کے اثر کو تعلیم یافتہ طبقے کے تنگ دائرے سے باہر نکال کر ملک اور قوم میں عام کر دیا اور اس کا ذریعہ ان کا شہرۂ آفاق مسدس تھا جس کی تصنیف سرسید کی فرمائش سے ہوئی تھی

اصلاحی نقطہ نظر سے سب سے اہم مسدس کا وہ حصہ ہے جس میں شاعر نے قوم کے ہر گروہ اور ہر طبقے کی حالت کو اپنی بے پناہ اور دردناک تنقید کے ذریعے بے نقاب کیا ہے جس کے ہر شعر میں سوسائٹی کی کسی دُکھتی ہوئی رگ کو چھیڑا ہے۔ سرورِ کائنات کی بارگاہ میں عرض حال کرتے ہوئے چند اشعار میں وہ حقائق بیان کر دیے گئے ہیں جن پر مورخین معلمین اخلاق اور مصلحین معاشرت مدتوں سر دھنیں گے۔ اس دردبھری، دل دوز نظم میں سے کوئی کیا سنائے اور کیا چھوڑے۔ مثال کے طور پر چند شعر سن لیجئے۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے ‏ ‏ اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے ‏ ‏ اُس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے

جس دین نے تھے غیروں کے دل آکے ملائے　　اُس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا　　اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے
جس دین کا تھا فقر بھی اکسیر غنا بھی　　اس دین میں اب فقر ہے باقی نہ غنا ہے
عالم ہے سو بے عقل ہے، جاہل ہے سو وحشی　　منعم ہے سو مغرور ہے، مفلس سو گدا ہے
چھوٹوں میں اطاعت ہے نہ شفقت ہے بڑوں میں　　پیاروں میں محبت ہے نہ یاروں میں وفا ہے
دولت ہے نہ عزت نہ فضیلت نہ ہنر ہے　　اک دین ہے باقی سو وہ بے برگ و نوا ہے

صرف اسی نظم کی تنگ زمین میں حالی نے اُن مقامات، کو بیان کر دیا ہے جہاں مذہب و فلسفہ کے بڑے بڑے مدعی نہیں پہنچ سکے۔ اسلام کی تعلیم کے رخ روشن پر زمانہ کے تعصب مخالفوں کی غلط بیانی اور خود مسلمانوں کی بے راہ روی کی وجہ سے پردہ پڑ گیا تھا۔ حالی نے اس پردہ کو اٹھا کر دکھا دیا کہ اسلام ایک مذہب امن ہے جو دنیا میں سلوک اور محبت کی حکومت قائم کرنے آیا تھا۔ اسلام کا مقصد قوموں اور جماعتوں کے اختلاف اور تعصب کو مٹانا اور ان میں ایک عالم گیر اخوت قائم کرنا تھا۔ اس نے فقر میں خودداری و جد و جہد اور ثروت میں فیاضی، خدا ترسی اور حق شناسی سکھائی تھی۔ اس نے علم و حکمت کو مومن کی کھوئی پونجی سے تعبیر کیا تھا۔ اسی کی برکت سے مسلمانوں نے دنیائے فکر و عمل کو مسخر کر لیا تھا لیکن اب خود ملت اسلامیہ میں پھوٹ پڑ گئی ہے۔ اور افراد اور جماعتوں کے تعلقات میں حسن مراعات کا نام تک باقی نہیں رہا عمل کی سرگرمی کی جگہ جمود اور بے حسی کا دور دورہ ہے۔ منعم اپنی دولت میں مست ہیں اور مفلس خودداری کو چھوڑ کر ہر ایک کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ نہ اُن میں قوت عمل باقی رہی ہے نہ ان میں عمل۔ نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں سے محروم ہو گئے ہیں، خدا کے ہاں انصاف ہے پاس داری نہیں

جو قوم اس کے احکام اور قوانین کی پیروی نہیں کرے گی وہ اس کا خمیازہ اٹھائیگی اس میں تقدیر کا گلہ کرنا، اپنے نفس کو فریب دینا اور حقیقت کی تلخی سے گریز کرنا ہے۔

جو کچھ ہیں وہ سب اپنے ہی ہاتھوں کے ہیں کرتوت　　شکوہ ہے زمانے کا نہ قسمت کا گلہ ہے

تمدن و معاشرت کے تمام مختلف فیہ مسائل میں حالی ہمیشہ اُدھر ہوتے ہیں جو عدل، انسانیت اور انصاف کا رستہ ہے۔ وہ حق پرستی، انصاف پسندی، خودداری، جرأت، بلند حوصلگی اور رواداری کے حامی ہیں۔ اور وقت کی قدر کرنا، محنت کی عزت کرنا، ابنائے جنس کے حقوق کی پاس داری کرنا اور مفادِ ملی کے لیے ذاتی اغراض کو قربان کرنا سکھاتے ہیں۔ ان کی تعلیم میں ایک انقلاب عظیم کا امکان پوشیدہ ہے جس کو اُن لوگوں نے بھی پوری طرح نہیں سمجھا جو ان کے کلام پر سر دھنتے ہیں اور ان کا قومی مرثیہ پڑھ کر آنسو بہاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں نہ صرف قوم کا دل دھڑکتا ہے بلکہ اس کے بلند ترین جذبات اور اعلیٰ ترین مقاصد کی ترجمانی موجود ہے۔ اقبال نے شیکسپیر کی شان میں جو شعر لکھا ہے اُس کا اطلاق بدرجۂ کمال حالی پر ہوتا ہے۔

حُسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن　　دلِ انساں کو ترا حسنِ کلام آئینہ!

حالی کی مصلحانہ حیثیت کی سچی قدر شناسی کے لیے ان کی بلند اور پاکیزہ سیرت کو سمجھنا ضروری ہے۔ دنیا میں بہت سے بڑے آدمی گزرے ہیں جن کا نام لوگوں کی اور تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے، لیکن باوجود ان کے بڑے بڑے کارناموں کے ان میں کم ایسے ہوئے ہیں جن کا ظاہر و باطن، قول و فعل، اُصول و عمل، زندگی اور تعلیم بالکل ایک ہوں۔ حالی کی کامیابی اور اثر آفرینی کی ایک بڑی وجہ ان کا خلوص ہے۔ ان کی شاعری میں بھی خالص سونا دکتا ہے جس سے ان کی فطرت کا خمیر تیار ہوا تھا ان میں تصنع اور تکلف کا شائبہ تک

نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر لفظ جو دل سے نکلتا ہے، بجلی بن کر دل پر گرتا ہے۔ سرسید کے حلقہ احباب اور رفقا میں جو بڑے بڑے مشاہیر اور قابل احترام لوگوں پر مشتمل تھا حالی کی سیرت سب سے برتر اور بلند تھی، جس پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ غلام الثقلین صاحب مرحوم نے عصر جدید میں لکھا تھا "بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا یونانی خیال کی رو سے ایک معتدل اور متوسط انسان، اور صوفیہ خیالات کی رو سے ایک صاحب باطن ولی تھے" جسٹس سید محمود کا وہ قول پڑھئے جو سر سید راس مسعود نے اپنی تقریب میں نقل کیا ہے۔ سید محمود جیسی زبردست دل و دماغ کے شخص تھے وہ محتاج بیان نہیں۔ انھوں نے ایسی آزاد طبیعت پائی تھی کہ ان کا سر نیاز کسی بڑی سے بڑی بارگاہ میں بھی خم نہیں ہوا۔ ان کا یہ کہنا کہ تمام انسانوں میں حالی قابل پرستش ہیں، اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے۔

ان ذاتی اوصاف اور باطنی کمالات کا تذکرہ غیر متعلق یا خارج از بحث نہیں کیونکہ حالی کی ذات اب انفرادیت کی حدود توڑ کر ہماری تہذیب و تمدن اور ہماری تاریخ و ادب کے سرمایہ عزیز میں سما گئی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری کی قدر شناسی کے لئے ان نفسی خصوصیات اور محرکات عمل کو پہچاننا ضروری ہے جنھوں نے حالی کو حالی بنایا حقیقت یہ ہے کہ اصلاح کا جذبہ اور خدمت خلق کا شوق اُن کی زندگی اور عمل کے ہر پہلو پر محیط تھا۔ اس نے ان کو غم عشق اور غم روزگار دونوں سے آزاد کر کے قوم کے غم اور قوم کے عشق میں مبتلا کر دیا تھا۔ یہی جذبۂ اصلاح تھا جس نے ان کی زندگی کی ابتدا سے رہنمائی کی اسی کی بدولت انھیں مسدس کے مضامین کا الہام ہوا۔ اسی کا یہ تقاضا تھا جس نے پرانی شاعری کے فرسودہ سانچوں کو توڑ کر ان کی خلاق طبیعت کے لیے نئے سانچے تیار کئے۔ اور ایک شاعری ہی پر کیا منحصر ہے؟ ادب کی کونسی صنف تھی جس کی تہذیب اور اصلاح اُنھوں نے

نکی ہو۔ غرض حالی نے جس طرح دنیائے عمل میں تمام عمر جھوٹ، مبالغہ اور ریاکاری کے خلاف جہاد کیا اسی طرح دنیائے فکر میں بھی ان چیزوں کو روا نہیں رکھا۔ ان کی ہر تصنیف میں وہی سچائی، سادگی اور ہمدردی جھلکتی ہے جو ان کی سیرت میں کارفرما تھی اور اسی کی بدولت اُن کے لیے نہ صرف شعرا کی صف اول میں جگہ مخصوص ہے، بلکہ اہل نظر کے نزدیک ان کا شمار خاصان خدا میں ہے۔ کیونکہ انھیں خدا کی مخلوق سے محبت تھی، اور اُس کی خدمت کا ذوق اور ولولہ تھا۔

آج جو لوگ قومی خدمت کی راہ میں گام زن ہیں، حالی، حالی کی سیرت اور شاعری ہر قدم پر ان کی رہنمائی کرتی ہے اور زبانِ حال سے یہ کہہ رہی ہے۔

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرے کارواں کیلئے

آل احمد سرور

ہندوستانی ادب میں حالی کا درجہ

اردو ادب میں حالی کا کیا درجہ ہے؟ اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔ حالی کے کارنامے بہت ہیں اور ان کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ وہ شاعر بھی ہیں اور نثار بھی، نقاد بھی ہیں اور صاحب طرز بھی۔ وہ صرف مسدس ہی کے شاعر نہیں، انھوں نے اور بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں، وہ غزل کے خلاف ہیں لیکن ان کی بہت سی غزلیں اردو شاعری کے ہر انتخاب میں جگہ پا سکتی ہیں۔ ان غزلوں میں ہجر اور وصل بھی بہت سی ہے، اور زاہد سے چھیڑ چھاڑ بھی مگر صرف یہی نہیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے ان کی نظموں اور رباعیوں میں، اخلاقی تعلیم اور اصلاحی پیغام ہے مگر تاثیر اور شیرینی بھی کم نہیں، وہ واعظ بھی ہیں اور مصلح بھی، ناصح بھی اور حکیم بھی۔ مگر دراصل وہ شاعر ہیں اسے غالب نے بھی تسلیم کیا تھا اور آج بھی ہر صاحب فہم مانتا ہے

نثر میں ان کے کارنامے کچھ کم روشن نہیں، وہ تین بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں جو اردو ادب میں کلاسیکل حیثیت اختیار کر چکی ہیں۔ حیات سعدی،

یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید سوانح عمریاں بھی ہیں اور تنقیدیں بھی۔ ان کے علاوہ حالی نے بہت سے مضامین لکھے ہیں، اپنی نظموں پر دیباچے اور اپنے دیوان پر مقدمے تحریر کئے ہیں۔ تقریریں کی ہیں مقالے پڑھے ہیں۔ دوستوں اور رشتہ داروں کو خطوط لکھے ہیں اور آج یہ سب چیزیں اربابِ نظر کی آنکھوں کا سرمہ ہیں۔

انھوں نے مقدمہ شعر و شاعری کے ذریعے اردو میں تنقید کی بنیاد ڈالی۔ شعر و شاعری کے متعلق ایک مکمل اور حیات آفریں نظریہ مرتب کیا۔ پھر اس نظریہ کی روشنی میں اردو شاعری پر تبصرہ کیا۔ غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی پر علیحدہ علیحدہ ناقدانہ نظر ڈالی۔ ہماری تنقید کے جو سانچے ہیں وہ حالی کے بنائے ہوئے ہیں۔ ہم جن چیزوں پر آج زور دیتے ہیں ان کی طرف سب سے پہلے حالی نے اپنے مقدمہ میں توجہ دلائی تھی۔

انھوں نے اسلوب کی دنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ ان کے جتنے رفیق اور ہمعصر تھے سب کے سب صاحبِ طرز تھے لیکن زندگی صرف حالی کے طرز کو نصیب ہوئی، باقی یا تو ختم ہو گئے یا ان کی کارفرمائی محدود ہو گئی۔ آزاد کی صناعی، نذیر احمد کا زورِ بیان، سرسید کی سادگی، شبلی کی رنگینی سب اپنی جگہ خوب ہیں لیکن آج نثر کا رجحان کیا ہے؟ یہ بتانے کی ضرورت ہے؟

حالی نے ہوش سنبھالا تو ہمارا ادب ایک خاص منزل پر جا کر ٹھہر گیا تھا۔ شاعری چونکہ آزاد کے الفاظ میں "فارسی کے پردوں سے اڑتی تھی"۔ اس لئے اس میں ویسی ہی باتیں آگئی تھیں جن کا اس نے دودھ

پیا تھا اسی کی خاصیت پیدا ہو چلی تھی۔ روشنی تھی گرمی نہ تھی۔ حسن تھا تندرستی نہ تھی بلند آہنگ نغمے تھے مگر ان میں تاثیر ناپید، نقالی عام تھی ایجاد کو پسند کرنے والے کم تھے۔ ذوق غالب سے بہتر شاعر سمجھے جاتے تھے۔ محاورہ کی خاطر شعر کہا جاتا تھا، شاعری صرف غزل میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، نثر اگرچہ نظم سے کم عمر تھی مگر اس میں صحیح و صالح رنگ پیدا ہو چلا تھا۔ سرسید کی ابتدائی تصانیف اور غالب کے خطوط میں عام رنگ کے خلاف صاف اور سادہ زبان استعمال کی گئی تھی۔ حالی غالب کے معتقد اور میر کے مقلد اور شیفتہ سے مستفید تھے۔ غالب کی شاعری سے متاثر نہ ہوئے اُن کی نثر سے متاثر ہوئے۔ انھوں نے مسدس سے پہلے جو کچھ لکھا اس کی اہمیت عام طور پر نظر انداز کی جاتی ہے۔ غالب اور شیفتہ کی صحبت عرب شعرا کا مطالعہ اور خود شاعر کی سادگی اور دردمندی ان سب باتوں کی وجہ سے حالی کی غزلوں میں بھی بہت سے نشتر موجود ہیں۔ ان کی جوانی داغ و مومن کی طرح دیوانی نہ تھی مگر اس میں جوانی کی ساری اُمنگ اور ترنگ موجود ہے ان کی غزلوں کے چند شعر دیکھئے۔ ان میں سادگی ہے مگر حسن اور شیرینی بھی" الفاظ دھیمے ہیں مگر وہ کسک اور کھٹک ہے جو نشتر میں ہوتی ہے۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں ۔۔۔ مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

پی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اجازت ۔۔۔ فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانا

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم ۔۔۔ سب کچھ کہا مگر نہ کھلے رازداں سے ہم

اُس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا
ہے جستجو کہ خوب سے ہی خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا
اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت
رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہیں رند و پارسا ایک ایک
تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

اور جو لوگ انھیں صرف رونے اور بسورنے والا شاعر سمجھتے ہیں وہ ذرا یہ اشعار سنیں۔

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

بے قراری تھی سب اُمیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازیٔ شبِ ہجراں میں نہیں

تا قافلے گزریں وہاں کیونکر سلامت واعظ
ہے جہاں راہزن و راہ نما ایک ہی شخص

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

کب تک دھری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے
کل خزاں آکے بتا دے گی وطن کس کا ہے

غرض حالی نے جب لاہور کے مشاعروں میں برکھا رت اور حبِ وطن کا راگ گایا تو اس وجہ سے نہیں کہ انھیں غزل کہنا نہ آتی تھی اور نہ اس وجہ سے کہ وہ غزل سے بیزار تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ شاعری کو صرف غزل نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ اسے اتنا وسیع کرنا چاہتے تھے کہ وہ آفاقی ہو جائے وہ بعد میں بھی غزلیں لکھتے رہے اور ان سے وہ تمام کام لیتے رہے جو نظموں سے لیتے تھے لیکن ان کی توجہ نظم پر رہی برکھا رت اور حبِ وطن سے اردو شاعری میں ایک نئے راگ کا اضافہ ہوتا ہے یہ راگ بالکل نیا تو نہ تھا کیونکہ اس سے پہلے نظیر اکبر آبادی بھی اسے الاپ چکے تھے مگر ان کی آواز کسی نے نہ سنی تھی، حالی نے جب یہ نغمہ چھیڑا تو اس کا اثر ہوا اور ان کی اور آزاد کی کوششوں سے مقامی رنگ، منظر نگاری، وطن کی محبت اردو شاعری میں اپنی بہار دکھانے لگے۔

لاہور سے واپسی پر سرسید سے ملاقات ہوئی اور وہ سرسید کی اصلاحی تحریک کے روح رواں بن گئے۔ مسدس سرسید کی فرمائش پر لکھی گئی اور سرسید اسے اپنی نجات کا باعث سمجھتے تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی پستی سے نجات ملی۔ یہ نظم اپنے طرز کی انوکھی اور نئی ہے اور اس کی مقبولیت اس کی خوبی کی دلیل ہے اس میں حالی نے قوم کا مرثیہ لکھا ہے مگر مرثیہ میں تعمیری شان ہے، جہاں اس میں شرفار کی حالت، شعرا کی پستی، علم و عمل کے فقدان پر ماتم ہے وہاں ماضی کی شان و شوکت کا وہ ولولہ انگیز تذکرہ ہے جسے پڑھ کر مایوس سے مایوس دل بھی گرما جاتا ہے۔ مسدس میں کئی مقامات ہیں جو دلوں پر نقش ہو کر رہ گئے ہیں۔ عرب کی جہالت اسلام سے پہلے، نبی برحق کا نزول، ان کی سیرت، ان کی تعلیم، ان کے رفیقوں اور ساتھیوں کا خلوص اور جذبہ اسلامی، مسلمانوں کی علم دوستی اور علم پروری، قرطبہ اور بغداد کی عظمت سب کا ذکر سادہ مگر بڑے پُراثر الفاظ میں ہوا ہے۔

حالی خود روتے ہیں اور دوسروں کو رُلاتے ہیں پھر ایسی باتیں کہتے ہیں کہ آنکھوں میں آنسو خشک ہو جاتے ہیں مگر دلوں میں عزم بیدار ہو جاتا ہے، وہ ماضی کے شاعر کہے جاتے ہیں۔ مگر ماضی کی یاد میں کھو جانا ان کا شیوہ نہیں ماضی کی ہر تصویر عبرت کے لئے پیش کرتے ہیں نہ کہ عشرت کے لئے۔

(مسدس کے بعد حالی نے بہت سی نظمیں لکھیں، ان میں سے شکوہ ہند

مناجات بیوہ اور چپ کی داد زیادہ مشہور رہیں۔ حالی کی شاعری کا مقصد قوم کو خیال بندی اور خیال آرائی کی دنیا سے نکال کر حال کی دُنیا میں لانا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ شاعری کا مقصد کیا ہے اور اسے کیا کرنا چاہئیے چنانچہ انھوں نے جہاں کہیں پستی اور جہالت دیکھی تو قوم کو اس کی طرف متوجہ کیا، خصوصاً چپ کی داد میں حالی نے عورتوں کی عظمت اور اہمیت کو جو قدامت اور رواج پر قربان ہو چکی تھی پھر زندہ کیا اس نظم کا آغاز کس قدر غیر شاعرانہ ہے مگر آگے چلکر شاعری کی دیوی سارے زیور اتار کر صرف اپنی معصومیت اور سادگی میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ بقول فراق کے "اس کے سکوت میں لہریں ہیں اور لہروں میں سکوت" مناجات بیوہ میں عورتوں کے جذبات کی عکاسی بے مثل انداز میں کی گئی ہے، زبان وہ ہے جو شہری اور دیہاتی، امیر غریب عالم اور عامی سب سمجھ لیں، انداز وہ ہے کہ ہر دل میں بیٹھتا چلا جائے۔ لہجہ وہ ہے جو کہیں ناصحانہ نہیں ہونے پاتا۔ حالانکہ اس میں حالی دنیا کی محبت کو خدا کی محبت میں محو کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

رِیت کی سی دیوار ہے دُنیا — اوچھے کا سا پیار ہے دُنیا
ساتھ سہاگ اور سوگ ہے یاں کا — ناؤ کا سا سنجوگ ہے یاں کا
ہار کبھی اور جیت کبھی ہے — اس نگری کی ریت یہی ہے
آئیں بہت دنیا کی بہاریں — عیش کی گھر گھر پڑی پکاریں

گئیں اور آئیں چاندنی راتیں — برسیں کھلیں بہت برساتیں
پر نہ کھلی ہرگز نہ کھلے گی — وہ جو کلی مرجھائی تھی دل کی

اسی کے متعلق مولوی عبدالحق نے مہاتما گاندھی سے کہا تھا کہ اگر اس بدقسمت ملک کی ایک زبان ہوئی تو وہ مناجات بیوہ کی زبان ہوگی، حالی کی رباعیات میں ناصحانہ انداز کہیں کہیں زیادہ ہے لیکن کام کی بات ضرور بیان کی گئی ہے۔

نثر میں جو کتابیں حالی نے لکھی ہیں وہ پہلے سوانح نگاری پھر تنقید کے ماتحت آتی ہیں۔ حیات سعدی اور یادگار غالب دونوں میں سوانح بھی ہیں اور تنقید بھی۔ حیات جاوید جو سب کے بعد اور سب سے زیادہ مکمل ہے صرف سوانح سے متعلق ہے زندگی کے حالات بیان کرنے پر حالی بہت زیادہ زور نہیں دیتے، تینوں کتابوں میں بہت کم صفحے حالات کی نذر کیے گئے ہیں۔ ان کی زیادہ توجہ شخصیت اور اس کے کارنامے نمایاں کرنے پر رہتی ہے۔ حیات سعدی کے علاوہ باقی دونوں کتابیں معاصرین سے متعلق ہیں۔ ایسے معاصرین جو انیسویں صدی کے سب سے نمایاں افراد کہے جا سکتے ہیں۔ حالی کو جو مواقع ان کی رفاقت کے حاصل تھے اُن سے انھوں نے پورا فائدہ نہیں اٹھایا غالب کے حالات سرسری طور پر بیان کیے گئے ہیں، چار سو صفحوں کی کتاب میں سے ۹۶ صفحے سوانح کی نذر کیے ہیں، ان میں بھی بہت سے لطائف و ظرائف، شیفتہ اور میر کے حالات اور غالب کے اشعار

ہیں مگر دوسرے حصے میں تفصیل سے کام لیا ہے۔ غالب کی شاعری اپنے زمانہ میں خواص ہی میں مقبول رہی۔ عوام تک اسے پہنچانے اور غالب کی عظمت کا نقش ہر دل میں بٹھانے میں یادگار کا بہت بڑا حصہ ہے ان کی تنقید کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال ہے وہ نہ بجنوری کی طرح غالب کو آسمان پر بٹھا دیتے ہیں نہ لطیف کی طرح اُن پر غیر ہم آہنگی کا الزام لگاتے ہیں انھوں نے غالب کی جو خصوصیات گنائی ہیں سب اپنی جگہ صحیح ہیں اور تمام نقادوں حتیٰ کہ اکرام کا بھی فیصلہ ہے کہ غالب کی سب سے زیادہ منصفانہ تنقید یادگار میں ملتی ہے۔ انھوں نے غالب کے مشکل اشعار کی شرح کرکے غالب کی ترجمانی کا حق بھی ادا کیا ہے اور فارسی کے بعض شعراء سے اس کا موازنہ یک طرفہ نہیں بلکہ انصاف پر مبنی ہے ان کی یہ رائے کہ خسرو اور فیضی کے بعد مرزا کی لٹریری قابلیت اور جامع صفات کا آدمی ہندوستان میں پیدا نہیں ہوا۔ بہت بڑی حد تک صحیح ہے غالب کی مقبولیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ انھیں حالی جیسا سوانح نگار اور نقاد ملا۔

مگر حیات جاوید ان دونوں کتابوں سے اہم ہے اس میں صرف سرسید کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ذہنی تاریخ آ گئی ہے۔ حالی نے تمام مواد کو سمیٹنے اور مرتب کرنے میں بڑی قابلیت دکھائی ہے، ان کا یہ خیال کہ سرسید کے تمام کارناموں کا محرک مذہبی اصلاح کا جذبہ تھا بالکل صحیح ہے اور انھوں نے سرسید کی مذہبی خدمات پر بجا طور پر

زور دیا ہے۔ سوانح عمری میں سب سے ضروری چیز وہ ہمدردی ہے جس کے بغیر سوانح نگار ہیرو کی نفسیات کو اچھی طرح نہیں سکتا۔ حالی کے یہاں یہ چیز موجود ہے اور اسی وجہ سے ان کی کتاب کو مدلل مداحی کتاب المناقب اور یک رخی تصویر کہا گیا ہے مگر اس قسم کے اعتراضات تو باسویل کی کتاب لائف آف جانسن پر بھی کئے گئے ہیں، حالانکہ سوانح نگاری میں یہ سنگ راہ کا کام دیتی ہے۔ حیات جاوید اتنی مقبول نہیں ہوئی، جتنی یادگار غالب اس کی وجہ یہ ہے کہ غالب کی شخصیت سرسید کی شخصیت سے زیادہ دلچسپ ہے۔

مقدمہ شعر و شاعری میں حالی نے شعر کی جو خوبیاں بیان کی ہیں وہ خود اُن کی شاعری میں پوری طرح پائی جاتی ہے، سادگی، اصلیت اور جوش تینوں کی ضرورت حالی نے بڑے دلنشیں انداز میں سمجھائی ہے، پھر اس معیار پر انھوں نے اردو شاعری کو پرکھا ہے۔ غزل کے خلاف انھوں نے بڑے بڑے اعتراضات کئے ہیں اور بہت سے اشخاص اسی وجہ سے ان کے خلاف ہیں مگر دراصل ان کا اعتراض لکھنؤ اسکول پر ہے جس نے شاعری کو غزل میں اور غزل کو رعایت لفظی اور نازک خیالی میں محدود کر دیا۔ انھوں نے قدما کی اس لئے تعریف کی ہے کہ وہ الفاظ کے طلسم سے نہیں بلکہ دل کی بات سنا کر انسان کو مسحور کرتے ہیں، قصیدہ سے چونکہ مبالغہ، جھوٹ اور خوشامد کی عادتوں کو ترقی ہوتی ہے اور ان سے قوموں میں ضعف پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے حالی اس کی مذمت کرتے ہیں

اور مرثیہ و مثنوی نے چونکہ اردو شاعری میں رزمیہ، بزمیہ دونوں رنگ پیدا کئے اس لئے انھیں سراہتے ہیں۔

غرض وہ شاعری کو تخصی اور صنعتی کوچوں سے نکال کر زندگی سے قریب لانا چاہتے ہیں۔ ان کی تنقید سے رہنمائی اور اصلاح دونوں کام انجام پاتے ہیں۔ اس میکدہ میں جہاں شراب کا دور ختم ہو چکا تھا ـــ مگر ہائے ہو جاری تھی، جاکر ہوشیاری کا پیغام سناتے ہیں۔ آرٹ کو آرٹ کی خاطر نہیں بلکہ اخلاق کی خاطر، زندگی کو سدھارنے اور سنوارنے کی خاطر اسے حرکت بلندی اور عظمت پیدا کرنے کی خاطر چاہتے ہیں اور اس کے لئے وہ اسلوب اختیار کرتے ہیں جو آسان اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ حالی سے پہلے ادب ایک خاص طبقہ کے لئے تھا۔ اسی طبقہ کے لئے وہ نغمۂ شادی اور نوحۂ غم کا سامان بہم پہنچاتا تھا۔ ہمارے شاعر اور ادیب یا تو دربار سے وابستہ تھے یا خانقاہ سے۔ کبھی کبھی دونوں سے آنکھ مچولی بھی ہو جاتی تھی۔ اسی وجہ سے اس میں یا تو جوانی کے چونچلے اور ساز عشرت کے نغمے یا روحانیت اور بے ثباتی دنیا کے مضامین ہوتے تھے جو جھونپڑوں میں رہتے تھے وہ ہمیشہ محلوں کے خواب دیکھتے رہتے، انھیں یہ احساس ہی نہ تھا کہ جھونپڑے میں محل سے زیادہ سکون، امن اور آزادی میسر ہو سکتی ہے اسی وجہ سے انداز بیان ایسا ہوتا ہے۔ جیسے محل والے پسند کرتے یا کر سکتے۔ انیسویں صدی کے آخر میں غدر کے بعد یہ بساط الٹی۔ جماعت کا مفہوم وسیع ہوا۔ انفرادیت کے بجائے

قومی نقطۂ نظر آیا اس وقت لکھنے والوں کو یہ خیال ہوا کہ بات اسی زبان میں ہو جو سب سمجھیں جس میں قابلیت کا زور اور انشاء پردازی کی شان نہ ہو بلکہ خلوص کی جھلک اور ایک بڑے مقصد کی چاشنی ہو، سرسید کی نثر اور حالی کی شاعری سے یہ مقصد پورا ہوا۔ خیالی طوطا مینا بنانے کے بجائے کام کی بات پر زور دیا گیا۔ فصاحت و بلاغت کے فرسودہ اصولوں کی جگہ اپنے مطلب کو ظاہر کرنا زیادہ اہم ٹھہرا۔ ادب سے زندگی کے مسائل حل کرنے اور زندگی کی تلخیوں کو گوارا بنانے کا کام لیا جانے لگا۔ مہدی کا قول ہے کہ "اگر سرسید کے بعد کوئی قلم ہاتھ میں لے سکتا ہے وہ بوڑھے حالی ہیں"۔ ادب کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیئے جائیں۔ یہ سلاست اور نفاستِ قدرت کلام کی آخری حد ہے جو سرسید کے بعد حالی کے حصے میں آئی۔ حالی نے سرسید کے رنگ کو ترقی دی۔ سرسید کا رنگ بہت مفید ہونے کے باوجود کبھی کبھی بے رنگ اور سپاٹ ہو جاتا تھا حالی نے اس میں ادبیت پیدا کی۔ ان کا سبُو مٹی کا ہے مگر ان کی مے میں شمشیر کی تیزی ہے اور یہ زبان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے لئے موزوں اور مناسب ہے آزاد نے بقائے دوام کا دربار آراستہ کرکے نثر میں شاعری کا نظارہ پیدا کیا۔ ان کی روح جدید تھی مگر لباس قدیم، جس رنگ کے خلاف وہ بغاوت کرتے تھے وہ آخری دفعہ خود ان کی تصانیف میں نظر آیا۔ یہ خیالی مضامین یا مرقع نگاری کے لئے موزوں تھا۔ لیکن

علمی اور تنقیدی مضامین کے لئے اس میں گنجائش نہ تھی، نذیر احمد کے طرز میں مذاق کا پہلو بہت نمایاں ہے اور باوجود بہت جاندار بہت پرزور بہت تندرست ہونے کے محدود ہے۔ کہانیوں اور لکچروں میں مزہ دیتا ہے۔ مذہبی تصانیف میں نظروں سے گر جاتا ہے۔ شبلی نے اپنے ہمعصروں سے بہت کچھ سیکھا۔ آزاد کی رنگینی، حالی کی سادگی، سرسید کا استدلال، نذیر احمد کا زور بیان سب اپنی اپنی جگہ اُن کے ہاں ملتے ہیں مگر یہ رنگ عالمانہ ہے، اس کے قدرداں ہمیشہ رہیں گے بلکہ پڑھے لکھوں میں ہمیشہ مقبول رہے گا۔ مگر حالی کی سی ہمہ گیری اسے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی، حالی اپنے آپ کو باغ کے پھولوں سے نہیں سجاتے، بلکہ ان کے یہاں وہ رنگینی ہے جو خونِ جگر سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کا طرز رواں، متین اور سنجیدہ ہے۔ اس میں انگریزی کے الفاظ بضرورت بھی آگئے ہیں مگر عام طور پر دوسری زبانوں کے الفاظ خصوصاً ہندی کے نرم اور شیریں الفاظ سے انھوں نے ایک خاص آہنگ پیدا کیا ہے۔ وہ تازہ ہواؤں سے منہ موڑ کر نہیں بیٹھتے بلکہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اُن کے یہاں بھی خامیاں ہیں۔ ان کا اخلاقی نقطہ نظر کہیں کہیں اس قدر نمایاں ہے کہ شاعری گھبرا کر پناہ مانگنے لگتی ہے۔ ان میں وہ والہانہ کیفیت وہ خودسپاری (ABANDON) نہیں جو غنائی شاعری کی جان ہے وہ تحیر SENSE OF WONDER نہیں جو جگر کی بعض غزلوں میں ملتا ہے وہ چمک اور جھلک FLASHES نہیں،

جو غالب یا سودا یا اقبال یا انشا، تک میں موجود ہے مگر ان کے یہاں حیرت انگیز توازن، حیرت انگیز گہرائی حیرت انگیز اثر موجود ہے۔ وہ جدید شاعری کے پیغمبر اور اردو کے بہترین شعراء میں سے ہیں ان کے زمانہ میں ہمارے ادب میں بہت سے باغ لگائے گئے اور بہت سی راہیں کھلیں۔ مگر سب سے زیادہ پھول پھل ان کے باغ میں اور سب سے زیادہ وسعت اُن کے راستہ میں آئی جب انھوں نے دکان لگائی تو اگرچہ ان کا مال نایاب تھا مگر اکثر گاہک بے خبر تھے۔ مگر رفتہ رفتہ سب کو خبر ہوتی رہی اور آج جس مال پر حالی کی مہر نہیں وہ ٹکسال باہر سمجھا جاتا ہے۔ حالی سے پہلے ہمارے شاعر اور ادیب اپنی جنت الگ بنائے اُسی میں محو رہتے تھے، حالی نے جنت عدن میں رہ کر نجد کی آندھیوں کی لپیٹ محسوس کرنا سکھایا۔ وہ نجد کی گرم ہواؤں میں جنت کی لطافت نہ پیدا کر سکے۔ یہ اقبال کا کام تھا جو ان کے صحیح معنوں میں جانشین ہیں۔

احتشام حسین

حالی کا سیاسی شعور

کسی شاعر اور ادیب کے شعور کی جستجو کئی حیثیتوں سے کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ شعور کی انفرادیت میں جماعتی ضرورتوں اور خواہشوں سے بہت سے پردے گرتے اور بہت سے اٹھتے ہیں۔ ماحول کی مادی بنیادوں سے لیکر خوابوں کی زنگارنگی تک نہ جانے کتنی منزلیں ہیں اور ہر منزل انسانی شعور پر اپنا عکس چھوڑتی ہے۔ گو اصل بنیاد معاشی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے متعین ہوتی ہے لیکن دوسرے اثرات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا اس طرح فرد کا شعور مادی حالات اور سماجی ماحول میں مسلسل عمل اور ردِ عمل سے تشکیل پاتا ہے کسی کے پاس بنا بنایا شعور نہیں ہوتا بلکہ بنتا ہے اور حالات بدلیں تو بدل بھی جاتا ہے۔ انسان ماحول کو بدلتا ہے اور اس کے بدلنے میں خود بھی بدل جاتا ہے۔ اسی طرح فرد کے شعور کے مطالعہ میں سماج کے بدلتے ہوئے مادی حالات کا مطالعہ ایک جزدِ لازم کی حیثیت سے شامل ہو جاتا ہے عمل اور ردِ عمل کا یہی سلسلہ ہے جس کے نظر انداز ہو جانے سے فرد کا شعور گرفت میں نہیں آتا۔ خواجہ الطاف حسین حالی کے سیاسی شعور کے مطالعہ میں جس چیز کو خاص طور سے سمجھنا ہے وہ انیسویں صدی کی

وسط کا ہندوستان ہے۔ جس پر کئی پہلوؤں سے نگاہ ڈالی جا سکتی ہے لیکن وہی نگاہ ساری سیاسی، معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی گتھیوں کو کھول سکے گی جو تاریخ کا مادی نقطۂ نظر رکھتی ہے۔ اس ہمہ گیر تعبیر کی مدد سے غدر کے قبل کا، غدر کا اور غدر کے بعد کا ہندوستان اپنی قدریں واضح کرے گا۔

سیاسی اعتبار سے حالی اس زمانے میں پیدا ہوئے جب ہندوستان کا جاگیردارانہ نظام زوال پذیر ہو چکا تھا۔ ذرائع پیداوار، صنعت اور معاشی حالت میں عام طور سے جمود کی کیفیت رونما ہو چکی تھی اور اس کی جگہ مغرب سے آیا ہوا ایک صنعتی اور تجارتی نظام تدریجی طور پر بڑھ رہا تھا۔ یہ ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جو کسی قدر تشریح چاہتی ہے۔ ہندوستان صدیوں سے دیہی معیشت، غیر مشینی زراعت، گھریلو دستکاری اور ایک خاص طرح کے جاگیردارانہ نظام میں زندگی بسر کر رہا تھا، ترقی کی ساری راہیں رکی ہوئی تھیں کہ یورپ کی تجارتی کمپنیاں دولت کمانے کی غرض سے ہندوستان میں داخل ہوئیں اور انھوں نے اٹھارویں صدی میں اچھی خاصی طاقت حاصل کر لی یہانتک کہ ہندوستانی سیاست میں وہ بھی فریق بن گئیں۔ ہندوستان زراعتی ملک تھا اور آنیوالے غیر ملکی حاکم صنعتی دور میں داخل ہو چکے تھے۔ اس لیے جب قوت حاصل کر کے انھوں نے ہندوستان سے زراعتی اور جاگیردارانہ ڈھانچے کو ایک نئی ریاست میں ڈھالنا چاہا تو اچھی خاصی کشمکش پیدا ہوئی۔ یہ صورتیں تقریباً سو سال کے عرصے میں رونما ہوئیں۔ اور ان کا اثر عوام پر تو براہ راست نہیں پڑا لیکن اعلیٰ اور متوسط طبقہ سیاسی کشمکش کے ساتھ ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔

پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تدریجی انقلاب کے دور میں شعور کی تشکیل میں غیر معمولی

پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بہت دنوں تک تبدیلی کے عناصر واضح نہیں ہوتے سیاسی اور معاشی حیثیت سے جو زمانہ اور جو ملک جس قدر زیادہ کش مکش اور پیچیدگی کا شکار ہوتا ہے۔ اسی قدر اس کے فنون لطیفہ، ادب اور سماج کا تجزیہ مشکل ہو جاتا ہے۔ اتنے عناصر ایک دوسرے کو کاٹتے اور تقویت پہنچاتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے، نئے حالات پیدا کرتے اور ان نئے حالات کی مدد سے تبدیلیاں کرتے چلتے ہیں کہ ان کے اثرات کو الگ الگ دیکھنا ایک مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں۔ تاہم انیسویں صدی کے وسطی دور میں ہندوستان کے طبقات اور ان کی زندگی کے مختلف مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے تجزیہ کی کوشش کی جائیگی۔

اس بات کو کسی نہ کسی شکل میں سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ عام سیاسی اور معاشی تبدیلیوں سے سماجی زندگی اور خیالات میں بھی تبدیلیاں ہر طبقہ اور گروہ میں یکساں طور پر نمایاں نہیں ہوتیں اور معاشی تبدیلیوں سے ایسی مکمل مطابقت بھی نہیں رکھتیں کہ ایک کے آئینہ میں دوسرے کی پوری تصویر دیکھی جا سکے۔ بلکہ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ ماضی، حال اور مستقبل کی قدریں ایک دوسرے میں پیوست ہوتی ہیں بعض طبقے اور بعض گروہ ماضی کی طرف دیکھتے ہیں اور اس کے تسلسل کو اس طرح برقرار رکھنا چاہتے ہیں کہ حال کی کش مکش بے معنی ہو جائے۔ بعض حال سے فائدہ اٹھانے میں ماضی کو بھلا دیتے ہیں۔ اور مستقبل کے نتائج سے بے خبر ہو جاتے ہیں اور بعض مستقبل کی تلاش میں ایسے خیال پرست بن جاتے ہیں کہ ماضی اور حال سے بھی فائدہ اٹھانے کا خیال نہیں کرتے۔ ان گروہوں کے اندازِ فکر بھی بالکل یقینی طور پر الگ نہیں ہوتے، بلکہ ذہن اور جذبات تغیر پذیری کی حالت میں ہوتے ہیں جن سے بعض اوقات (ہمیشہ نہیں) واضح عقائد کی جگہ

تضاد کا اظہار بھی ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذہن پوری طرح کسی معاشی تغیر کو سمجھ کر اور تاریخ کی رفتار سے واقفیت حاصل کر کے تبدیلیوں کو قبول نہیں کرتا ان کے خیالات اور وقت کے تقاضوں میں مکمل ہم آہنگی نہیں ہوتی۔ ہاں جس طبقے سے ان کا تعلق ہوتا ہے اس کے مفاد اور مصالح کے نقطۂ نظر سے اس تضاد کو سمجھا جا سکتا ہے

حالی کا سیاسی شعور ماضی اور مستقبل کی طرف کھینچنے والی تہہ در تہہ تحریکوں، عقیدوں اور خیالوں سے وجود میں آیا تھا۔ ان کا مقصد ماضی کی نیم سیاسی تحریکوں اور مستقبل کے امکانات کے میل سے کوئی ایسا تصورِ زندگی پیدا کرنا تھا جو مذہبی، اخلاقی اور دنیوی حیثیت سے مفید ہو۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں بھی وہی کش مکش تھی جو غالب کے یہاں ان الفاظ میں ظاہر ہوتی ہے ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اور یہ صرف حالی ہی کی کش مکش نہیں تھی اس زمانے کے اکثر حساس ادیبوں اور شاعروں کو یہ فیصلہ کرنے میں دشواری ہو رہی تھی کہ قدیم سے کتنی علیحدگی اختیار کریں اور جدید سے کتنا ملیں، مذہب اور عقل میں کس طرح مطابقت پیدا کریں اور دین و دنیا کو کس طرح بنائے رکھیں۔ حالی وغیرہ کی راہ اس لیے اور بھی کٹھن ہو گئی تھی کہ وہ سائنس نہیں رہنما تھے۔

حالی ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی عمر بیس سال کی تھی جب غدر ہوا۔ دلی کے مضافات میں ان کا خاندان بہت دنوں سے آباد تھا۔ حالی کا گھر بہت زیادہ خوش حال نہیں معلوم ہوتا۔ ان کے والد نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکار میں معمولی سی ملازمت کر لی تھی۔ حالی نے بھی غدر سے پہلے کلکٹری میں کلرکی کے فرائض انجام دیئے تھے گویا

ان کے دل میں انگریزوں کے خلاف کوئی نفرت کا جذبہ کام نہیں کر رہا تھا۔ ان کی وفاداری کسی نمایاں شکل میں ہندوستان کی برائے نام مغل حکومت سے بھی نہیں معلوم ہوتی بلکہ بدلے ہوئے ماحول میں ان کا ذہن نئے حالات سے سمجھوتہ کرنے پر تیار تھا۔

تقریباً تیس پینتیس سال کی عمر تک حالی کے رنگ طبیعت کا اندازہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ وہ خاموش مطالعہ اور بے نمود زندگی سے دلچسپی لیتے تھے۔ اپنے مذہبی عقائد میں پختہ اور اخلاقی اصولوں کے پابند تھے۔ دلی کے قیام اور غالب و شیفتہ کی صحبت نے ان کو غزل گوئی میں ایک خاص حقیقت پسندانہ رنگ کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ لیکن اس درمیان میں ہندوستان اور خاص کر دلی میں غیر معمولی تغیرات ہوئے تھے مغلوں کی جگہ برطانیہ کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ غدر نے سرکشوں اور وفاداروں کو انگریزی چھلنی میں چھان لیا تھا۔ اور باغیوں کو عبرتناک سزائیں دی جا رہی تھیں۔ نئے وفادار وجود میں آ رہے تھے اور طبقوں کے ڈھانچے بدل رہے تھے۔ یہ سب کچھ حالی کی نگاہوں کے سامنے ہو رہا تھا اور اس میں خود ان کے جاننے والوں کا بھی معاملہ تھا۔

حالی کے سیاسی شعور کا مطالعہ نئے طبقاتی ڈھانچے کے سمجھنے پر منحصر ہے انگریز ہندوستان میں سترھویں صدی میں آئے۔ اور معمولی تجارتی کمپنی کی حیثیت سے کام شروع کر کے ہندوستان میں ایک فیصلہ کن طاقت بن گئے۔ ملک کے انحطاط پذیر توی پر چھاپا مار کر انھوں نے ملک پر اقتدار قائم کر لیا۔ اس اقتدار کی سیاسی نوعیت تو ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا لیکن معاشی حیثیت سے یہ جاگیردارانہ، زراعتی اور چھوٹے پیمانے والے صنعتی نظام کے زوال اور صنعتی دور کے ترقی کرنے کی ابتدا تھی۔ انگریز مشینی سرمایہ داری کے دور میں داخل ہو چکے تھے اور ہندوستان ان کی تجارتی

منڈی اور خام مواد کا گودام تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے چند بڑے شہروں، خاص کر کلکتہ اور بمبئی میں ہندوستانی سرمایہ دار بھی پیدا ہو رہے تھے عام طور سے مسلمان جاگیر داری تمدن سے ذہنی اور کسی حد تک عملی طور پر وابستہ تھے اس لیے انھوں نے انگریزی تعلیم کی مخالفت اس وقت بھی جاری رکھی۔ جب ہندوستان کی دوسری قومیں اس کا خیر مقدم کر رہی تھیں اور اسے کام میں لا کر فائدہ اٹھا رہی تھیں دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسلمانوں کا شعور اس تیزی سے نہیں بڑھ رہا تھا جس تیزی سے ملک کا معاشی نظام بدل رہا تھا۔ چنانچہ جب ہندوستان کی جاگیر دارانہ طاقتوں نے نئی طاقت سے آخری دفعہ، غدر کی شکل میں مورچہ لیا۔ اس وقت ان طاقتوں نے اس انقلاب کا ساتھ نہیں دیا جنھیں جاگیر دارانہ قوتوں کے کھوکھلے پن اور انحطاط کا اندازہ ہو چکا تھا اور جنھوں نے اپنی امیدیں صنعتی دور کے ابھرتے ہوئے سورج سے وابستہ کر رکھی تھیں۔

اس دور کے برطانوی تسلط کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ اگرچہ یہ تسلط استحصال، استبداد اور جابرانہ لوٹ مار کے نقطۂ نظر سے تاریخ میں عدیم المثال ہے۔ لیکن اس کا آنا ہندوستان سے شاہی مطلق العنانی کا خاتمہ کرنے میں معین ہوا، اگرچہ خود غرضی، بدنیتی اور تذلیل کے زاویہ نگاہ سے برطانیہ کا اقتدار تاریخ کا ایک تاریک دور پیش کرتا ہے لیکن غیر شعوری طور پر یہی تسلط ہندوستان کی تاریخ کو بالکل نئے سانچے میں ڈھالنے کا آلہ بن گیا تھا۔ کارل مارکس نے اس زمانہ کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کی دورنگی کا خاص طور سے ذکر کیا ہے اور یہ بات صاف کر دی ہے کہ انگریزی حکومت نے ہندوستان کی قدیم معاشیات کو بدل دیا۔

ہندوستان کو صنعتی دور سے آشنا کر کے ترقی کی راہ پر لگایا اور خود وہ طاقتیں اس کے ہاتھ میں دیدیں جو مستقبل کے انقلاب میں معین ہونے والی تھیں کیونکہ ترقی کی تکمیل برطانیہ کے خود غرض ہاتھوں سے نہیں ہو سکتی ہندوستان خود آزاد ہو کر اس کام کو پورا کرے گا۔ مارکس نے سیاسی اتحاد، ملکی فوج، آزاد پریس، نئی تعلیم اور وسائل آمدورفت کی آسانیوں پر زور دیا ہے جو برطانوی حکومت نے اپنے ابتدائی ترقی پسند دور میں ہندوستان کو دیا۔ لیکن یہ بھی کہا ہے کہ برطانیہ نے ہندوستان کو جان بوجھ کر ایک بڑا صنعتی ملک نہیں بننے دیا، اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ہندوستان کی ساری مادی پستی کی ذمہ داری اس برطانوی حکومت پر ہے۔ جس نے یہاں کے نظام جاگیرداری کو اپنی ضرورتوں کے لیے باقی رکھا اور صنعتی ترقی کو اس لیے روک دیا کہ ان کے مفاد کو دھکا نہ لگے۔

ان باتوں کے اظہار سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں انگریزی حکومت اس ہندوستانی سماج کے لیے چند ترقی پسندانہ پہلو بھی رکھتی تھی جو صدیوں سے سامنتی اور شاہی نظام میں زندگی بسر کر رہا تھا ظاہر ہے کہ ان چند ترقی پسندانہ پہلوؤں سے ہر طبقہ یکساں فائدہ حاصل نہیں کر سکتا تھا بلکہ اعلیٰ اور متوسط طبقے کو بیرونی حکومت کے ساتھ مل کر عوام پر اپنا اقتدار قائم رکھنا تھا۔ کئی حیثیوں سے اس حکومت اور متوسط طبقے میں اشتراک کی گنجائش تھی گو طبقاتی رقابت کی بنا پر ان میں اختلاف ہونا بھی ضروری تھا جو بعد میں ظاہر ہوا۔

بہر حال ہندوستان میں ایک نئی طاقت کے آجانے اور آہستہ آہستہ اپنا

تسلط جمانے کے دوران میں یہاں کا تعلیمی نظام بھی بدل رہا تھا۔ ذہن بھی نئی باتوں کے قبول کرنے پر آمادہ ہو رہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس سے عوام کی ذہنی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو رہی تھی لیکن اعلیٰ متوسط طبقے میں ایک خاص طرح کی آزاد خیالی ضرور گھر کر رہی تھی۔ اور یوں معاشی اور ذہنی حیثیتوں سے وہ متوسط طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو کچھ پرانی اور کچھ نئی روایتوں کو ملا کر زندگی کی نئی قدریں تیار کرنے کا متمنی تھا معاشی زندگی میں اِس کا اظہار جاگیرداری اور صنعتی دور کے ادھورے اور غیر منظم میل کی شکل میں ہو رہا تھا۔ اور ذہنی سطح پر نئی مذہبی ادبی اور تعلیمی تحریکوں کے روپ میں حالی کا تعلق اس گروہ سے تھا جو ذہنی طور پر زندگی کی نئی رَو کو قبول کر کے دوسروں کو اُسے تسلیم کرنے پر تیار کر رہا تھا۔

انھیں نئے سیاسی اور معاشی اثرات کی وجہ سے انگریزی حکومت اور ہندوستان کے مختلف طبقوں اور گروہوں کے تعلقات کی سطحیں مختلف تھیں۔ ترقی کے لحاظ سے ملک کے بعض حصے بعض حصوں سے آگے بڑھے ہوئے تھے جہاں تک مسلمان اعلیٰ اور متوسط طبقہ کا تعلق ہے اگرچہ بہت سی باتوں میں وہ عام ہندوستانیوں سے مطابقت رکھتا تھا لیکن نئی تعلیم میں پیچھے ہونے، نئی زندگی کو دیر میں قبول کرنے اور جاگیردارانہ تہذیب سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ایک الگ ذہنی کیفیت بھی رکھتا تھا۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد ہی وہ ساری تحریک سمجھ میں آسکے گی جس کے رہنما سر سید تھے۔ سر سید انگریزوں کی ملازمت میں تھے لیکن ان کی قوتِ عمل اتنی زبردست تھی کہ وہ شروع میں تو علمی اور ادبی کاموں میں لگے رہے لیکن غدر کے بعد ایک پُرزور ذہنی تحریک کے بانی بن گئے۔ جو سیاسی اور معاشی حالات

اوپر پیش کئے گئے ہیں انھوں نے سرسید کی تحریک کو غذا بہم پہنچائی اور بہت سی مفید اور غیر مفید، ترقی پسندانہ اور رجعت پسندانہ چیزیں اس طرح وجود میں آگئیں کہ ان کا اثر مسلمانوں کی زندگی پر آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ حالی کے سیاسی خیالات بہت زیادہ واضح نہیں ہیں لیکن جتنے بھی ہیں وہ سرسید کے خیالات کی آواز بازگشت ہیں بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سرسید عمر میں حالی سے بیس سال بڑے تھے اور جب حالی نے واقعی مسلمانوں کی سیاسی زندگی کو سمجھنا شروع کیا اس وقت سرسید اس کی راہیں معین کر چکے تھے۔ اور متوسط طبقے کے مسلمانوں کو اپنا وہ سیاسی فلسفہ دے چکے تھے جو اُن حالات میں انھیں بہت سے خطرات سے بچاتا تھا۔ حالی نے بھی اس کو تسلیم کر لیا۔

جیسا کہ کہا جا چکا ہے ۱۸۵۷ء کا انقلاب جاگیردار طبقہ کی انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کی آخری کوشش تھی۔ اس کے رہنماؤں نے عوام کو ساتھ نہیں لیا اور لے بھی نہیں سکتے تھے۔ کیونکہ عوام کا فائدہ اس نظام کے بدلنے میں تھا، جو صدیوں سے رائج تھا۔ اور غدر کرنے والوں کے پاس ایسا کوئی تصورِ زندگی نہ تھا جس سے عوام کی حالت بہتر ہوتی۔ اس انقلاب میں کچھ مذہبی اور معاشی عناصر ضرور شامل ہو گئے تھے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں نئی طاقت کی جیت ہو گئی کیونکہ اس کا ساتھ دینے والے عناصر ملک میں موجود تھے۔ غدر کے بعد پرانے جاگیردار طبقے پر انگریزی حکومت کا عتاب نازل ہوا۔ ہندوستانی سرمایہ دار بھی جو انگریزی سرمایہ داری کے رقیب تھے۔ کسی قدر لپیٹ میں آگئے۔ گویا کھلم کھلا یہ ایک معاشی اور سیاسی کشمکش تھی جس سے فیصلہ کن نتائج برآمد ہو رہے تھے۔ لیکن سرسید نے

غدر کی اس معاشی نوعیت ہی کو تسلیم نہیں کیا اور مسلمانوں کو انگریزوں کے ظلم و جبر سے بچانے کے لیے اس پر زور دیا کہ غدر محض ایک فوجی بغاوت تھی۔ جو انگریزوں کی بعض غلطیوں اور خاص کر ہندوستانیوں پر بھروسہ نہ کرنے کی وجہ سے ہوئی۔ اور جن لوگوں پر بغاوت کا الزام تھا سرسید نے انھیں وفادار ثابت کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے اس بات کو کچھ اس طرح پیش کیا اور اس پر اتنا زور دیا کہ آخر انگریزی حکومت نے بھی ان کے خیالات کو تسلیم کر لیا۔ سرسید اور حالی کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ انگریزی حکومت کا قائم ہونا اتفاقی نہیں تھا بلکہ مسلمانوں میں حکومت کی صلاحیت اور لیاقت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی اس حکومت سے چھٹکارا پانے کی کوشش پہاڑ سے ٹکرانے کے مترادف تھی۔ اس لیے سرسید نے ایک جانب مسلمانوں کو یہ سبق پڑھایا کہ وہ حکومت کی طاعت اور وفاداری کو اپنا فرض قرار دیں اور دوسری جانب انگریزوں کو سمجھایا کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے کے بجائے ان پر بھروسہ کریں۔ دونوں کو قریب لانے کی کوشش اس وقت کے مایوس شکست خوردہ اور پریشان حال مسلمانوں کے لیے پیام جاں بن گئی۔ چنانچہ سرسید اور ان کے ساتھیوں نے مذہب، معاشرت، تعلیم، ادب اور سیاست ہر محاذ پر اسی نفسیات کی روشنی میں کام کرنا شروع کیا اور تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ ہر رہنما نے ماضی کے مقابلے میں حال کو ترقی یافتہ اور آزاد زمانہ ثابت کیا۔ غدر میں اور غدر کے بعد جس طرح ہندوستانی اور خاصکر مسلمان تباہ ہوئے تھے اس کے ردِ عمل کی صرف تین واضح شکلیں تھیں اور تینوں کسی نہ کسی حد تک رونما ہوئیں۔ اوّل نئے سرے سے بغاوت کی تیاری، دوسرے ناامیدی

اور شکست خوردگی کا شکار ہو کر بالکل خاموش بیٹھ رہنا اور تیسرے نئے نظام میں شریک ہو کر زندگی کو نئے حالات کے مطابق بنانا۔ حالیؔ کا پہلے دو گروہوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ دونوں حالتوں کو مسلمانوں کے لیے مضر جانتے تھے اور اپنی نظم و نثر میں مسلسل اس پر زور دیتے تھے کہ ہمیں حالات کا ساتھ دے کر اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ حالیؔ طبعاً ایک صلح پسند اور امن دوست انسان تھے۔ اس لیے انگریزی حکومت کی برکتوں میں سے جس چیز پر انھوں نے سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ امن اور آزادی ہے۔ حالیؔ کا آزادی کا تصور نہ تو جمہوری تھا اور نہ ہو سکتا تھا ان کے یہاں آزادی کے معنی تھے صنعتی دور کی انفرادی آزادی، مذہب اور رسم و رواج کی آزادی، سرمایہ جمع کرنے اور محنت کشوں سے کام لیکر طبقاتی نظام کو برقرار رکھنے کی آزادی چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"امن اور آزادی جو برٹش حکومت کی بدولت ہم کو اس زمانے میں حاصل ہے وہ کسی عہد میں اور کسی دور میں ہندوستان کو نصیب نہیں ہوئی۔"

ایک دوسری جگہ سرسید کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"رعیت کی آزادی جو اس سلطنت کی بے بہا اور برگزیدہ خاصیتوں میں سے ایک خاصیت ہے اور جس کی حقیقت نہ جاننے سے سلطنت کی بڑی خوبی ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی ہے اگر سچ پوچھیے تو اس معرفت کا دروازہ جو ہم پر کھلا، اس کی کنجی سرسید صاحب کی آزاد تحریریں ہیں۔"

کوئن وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر حالی نے جو قصیدہ اور مرنے پر جو مرثیہ لکھا ہے ان میں بھی بار بار یہی خیالات دہرائے گئے ہیں۔ غدر کی تباہ کاری اور مغل حکومت کے بیمار اور مدقوق نظام کے بعد ملکہ وکٹوریہ کے اعلان نے متوسط طبقے کو یہ یقین دلایا کہ آزادی اور خوشی کے دن اب آئے ہیں۔ اس طبقے کا آزادی کا جو تصور تھا اس سے ان کا ذہن بھی ادھر نہ جاسکا۔ کہ غلامی کی زنجیریں اور کس گئی ہیں۔ اس احساس آزادی کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ ایسی حکومت کی وفاداری کو اور تمام جذبات پر مقدم رکھا جائے۔ چنانچہ حالی نے بھی سر سید کی ہمنوائی کرتے ہوئے کہا۔

"سر سید نے پُر زور مذہبی دلائل سے ثابت کیا کہ انگریزی حکومت میں رہ کر مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ سلطنت کی اطاعت، خیر خواہی اور وفاداری میں ثابت قدم رہیں۔ سلطنت کو کوئی مشکل پیش آئے تو جان و مال سے اس کا ساتھ دیں۔"

یہی نہیں بلکہ سر سید کی مذہبی اور سیاسی کوششوں کو سراہتے ہوئے حالی نے حکومت برطانیہ کی اطاعت کے جواز میں ایک مذہبی پہلو بھی پیدا کر لیا تھا۔ لکھتے ہیں۔

"سر سید نے مذہب سے پوچھا کہ غیر قوم کی حکومت میں رعیت کو اس کی خیر خواہ اور وفادار رعایا بن کر رہنا ضروری ہے یا نہیں؟ مذہب نے جواب دیا کہ کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ جس گورنمنٹ کے سایۂ حمایت میں رعیت کو ہر طرح کا امن اور آزادی حاصل ہو

اس کی رعیت اپنی گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ نہ ہو۔ لہٰذا اپنی تمام زندگی گورنمنٹ کی وفاداری اور خیر خواہی میں صرف کر دی۔"

حالی نے بار بار انگریزی حکومت کو "شائستہ گورنمنٹ" کہا ہے کیونکہ ان کے خیال میں حکومت رعایا کی بہی خواہ تھی، انصاف پسند اور رحم دل تھی۔ اس لیے مذہبی اور اخلاقی حیثیت سے بھی مسلمانوں اور عام ہندوستانیوں کو وہ انگریزی حکومت کی برکتوں سے فائدہ اٹھانے اور اس کے وفادار رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ چونکہ مسلمان متوسط طبقہ ابھی ہندو متوسط طبقہ کے مقابلہ میں مجموعی طور پر پست تھا اس لیے دونوں طبقوں میں باہمی کشمکش بھی تھی اور یہی سبب تھا کہ سرسید احمد اور حالی نے کانگریس کی مخالفت کی۔ اور مسلمانوں کو سمجھایا کہ کانگریس میں شریک ہونے سے انھیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔ یہ ترقی اور رجعت کے متضاد پہلو اس وقت اور بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ جب ہم حالی کو ہندو مسلم اتحاد کی تلقین کرنے اور سودیشی تحریک کی حمایت کرتے دیکھتے ہیں۔ حالی اتحاد کے اس نتیجے سے بے خبر ہوتے ہیں جو سیاسی اور معاشی اتحاد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

حالی نے بار بار اتحاد کو قومی زندگی کا سنگِ بنیاد بتایا ہے۔ یہ اتحاد اخلاقی پہلو زیادہ اور سیاسی پہلو کم رکھتا تھا انھوں نے جذبۂ حُبِّ وطن کو اتنی اہمیت دی ہے کہ وہ ایک مذہبی عقیدے کی طرح ناقابلِ شکست بن گیا ہے، سودیشی تحریک کو ملک کے لیے مفید بتایا ہے اور انگریزی نوکری کے مقابلہ میں تجارت اور صنعت و حرفت اختیار کرنے کو ترجیح دی ہے۔ لیکن یہ اصلاح پسندی کا وہ راستہ تھا جو ان حالات میں ترقی پسند ہونے کے باوجود سیاسی پیچیدگی اور معاشی بھول بھلیاں میں عوام کی

رہنمائی نہیں کر سکتا تھا۔ حالی نے بغاوت اور نا امیدی کے درمیان ایسا راستہ نکالا جو ایک جانب انھیں نئے خیالات کے قریب لانے، نئی صنعتی زندگی کی برکتوں کا خیر مقدم کرنے، حقیقت پسند اور موقع شناس بنانے میں مدد کرتا تھا، دوسری جانب انھیں اپنے یعنی متوسط طبقے کے مفاد کا مُبلّغ اور علمبردار بناتا تھا۔ حالی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ترقی کے امکانات کا اندازہ لگا لیا تھا۔ اور مایوسی کا طلسم توڑنے کی جد وجہد کا سبق دیا۔ چنانچہ وہ ان صوفیوں کے مخالف تھے جو زندگی کی بے حقیقتی اور ناپائیداری پر زور دیتے تھے۔ صوفی شعراء کے ان خیالات کا ذکر کرنے کے بعد حالی لکھتے ہیں:۔

"مگر افسوس ہے کہ یہ نصیحت جیسی دلکش اور دلفریب ہے، ویسی قابلِ عمل نہیں۔ بہ فرضِ محال تمام انسان اس نصیحت پر کاربند ہوں تو دنیا کے سارے کاروبار درہم برہم ہو جائیں۔ شجاعت اور ہمت، عقل اور تدبیر، محنت اور جفاکشی، عدالت اور سیاست غرضیکہ وہ سب صنعتیں جو انسان کو انتظامِ معاشی کے لیے عطا ہوئی ہیں یک قلم معطّل اور بیکار ہو جائیں۔ اور انسان کے لیے کوئی استحقاق خلیفۃ اللہ بننے کا باقی نہ رہے۔"

سائنس نے جن امکانات کی طرف اشارہ کیا تھا، ہندوستان کے جاگیردارانہ دور میں ان کا تصور بھی محال تھا۔ لیکن اب انسان اس قدر کمزور اور بے بس نظر آتا تھا کہ اُسے مجبورِ محض سمجھ لیا جائے۔ حالی نے بھی تقدیر اور تدبیر کی بحث میں یہ لکھا ہے:۔

"جس قدر ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ عالم موجود ہے اسی قدر ہم کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ ہم سب کام اپنے اختیار سے کرتے ہیں۔"

جتنا وقت گزرتا جاتا تھا حالی کا یہ عقیدہ پختہ ہوتا جاتا تھا کہ ہم جس سیاسی دور میں ہیں اس میں ترقی کے امکانات بہت ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے چنانچہ بعض نظموں میں ان کا سیاسی اور سماجی شعور بہت نمایاں طور پر ظاہر ہو گیا ہے۔ مثلاً سے

لی ہے کروٹ ایک مدت سے زمانے نے بدل — راس تھا اگلوں کو جو موسم گیا کب کا نکل
جو تمدن کی عمارت تھے گئے اسلاف چھوڑ — آگیا ہے ان کی بنیادوں میں سرتا سر خلل
کام کے ہیں اب نہ دنیا میں ہنر ان کے نہ فن — اور بہ کار آمد زمانے میں ہے کس انکا نہ بل
ہیں نئی رسمیں، نئے آئیں نئی ہے چال ڈھال — اور نئے علم و ہنر کا ہے، جدھر دیکھو، عمل
ہے نئی گویا زمیں، ہے آسماں گویا نیا — کینچلی گویا کہ لی ہے زال دنیا نے بدل
بڑھ رہے ہیں جو ہوا کا رخ یہاں پہچانتے — پل رہے ہیں اپنی دور اندیشیوں کا کھا پھل
مست رہے ہیں جو ہیں اپنی آن پر مچلے ہوئے — آج گزری خیریت سے تو نہیں خیر انکی کل
ساتھ انھیں دنیا پڑے گا یاں زمانے کا ضرور — ورنہ رہنا ہو گا دنیا میں بہ حال مبتذل

ایک دوسری جگہ "فلسفہ ترقی" کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے جس میں یہ اشعار ملتے ہیں سے

اے عزیز و تم بھی ہو آخر بنی نوع بشر — غل ہے کیا نوع بشر میں کچھ تمھیں بھی ہے خبر
کر رہا ہے خاک کا پتلا وہ جوہر آشکار — ہو رہی ہے جس سے شان کبریائی جلوہ گر
رفتہ رفتہ یہ غبار ناتواں پہنچا وہاں — طائر وہم و تصور کے جہاں جلتے ہیں پر

اس نے ان کو دریا تھوں سے مسخر کر لیا ۔۔۔ ابر و برق و باد سے تا بحر و بر دشت و در
حق نے آدم کو خلافت اپنی کی تھی جو عطا ۔۔۔ دے رہے ہیں اس خلافت پر گواہی بحر و بر
تھا ارسطو اور فلاطون کو بہت کچھ جن پہ ناز ۔۔۔ ہو گئے تقویم پارینہ وہ سب علم و ہنر
کل کی تحقیقات نظروں سے اتر جاتی ہے آج ۔۔۔ بڑھ رہا ہے دم بدم یوں آج کل علم بشر
قوت ایجاد نے اب یاں تلک پکڑا ہے زور ۔۔۔ شام کی ایجاد ہو جاتی ہے باسی تا سحر
کہتے ہیں مغرب سے جب ہوگا برآمد آفتاب ۔۔۔ تو صف آفاق میں ہوگی قیامت جلوہ گر
دوستو شاید وہ نازک وقت آپہنچا قریب ۔۔۔ آ رہی ہے روشنی مغرب سے اک اٹھتی نظر
دستکاری کو مٹاتی صنعتوں کو روندتی ۔۔۔ علم و حکمت کی پرانی بستیاں کرتی کھنڈر
ہوشیاروں کو کرشمے اپنے دکھلاتی ہوئی ۔۔۔ غافلوں کو موت کا پیغام پہنچاتی ہوئی

یہ نظمیں اتنے واضح خیالات کا اظہار کر رہی ہیں کہ ان کی تشریح اور تجزیہ کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ان میں نئی زندگی کی توانائی اور زور ہے اور ترقی کی رو کو گرفت میں لینے کی خواہش۔ انگریزی حکومت کی پسندیدگی کا یہی وہ راز تھا حالی جس کے طلسم میں اسیر تھے ذاتی طور پر وہ انگریزوں سے ملنے سے گھبراتے تھے۔ لیکن ان کے وجود کو ہندوستان کے لیے برکت خیال کرتے تھے۔ چنانچہ جب انھیں شمس العلماء کا خطاب ملا تو انھوں نے اپنے بیٹے کو لکھا کہ اب انگریزوں سے ملنا پڑے گا اور درباروں میں حاضری دینی ہوگی میں کہاں اور یہ دردسری کہاں۔ سودیشی تحریک کی کامیابی کا تذکرہ کرتے ہوئے حالی ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"اس تحریک کا اثر ملک پر ضرور ہوگا۔ اور رفتہ رفتہ کم و بیش ہوتا جاتا ہے۔ لوگوں کو اس سرنگ کا راستہ معلوم ہو گیا ہے جس راستہ سے

ملک کی دولت غیر ملکوں میں کھنچی چلی جاتی ہے مگر اس راستے کا بند کرنا
کوئی ہنسی کھیل نہیں رہے۔ اور اس کے لیے جلدی کرنا تجربے سے مقابلہ
کرنا ہے۔ ع

ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان غیر ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے
کے قابل ہو جائے تو سمجھ لو اس کو بہت جلد کامیابی ہوئی"۔

ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر حالی کے سیاسی اور سماجی شعور کو اُس ہندوستان کے آئینہ میں دیکھنا چاہیے جو انیسویں صدی کے وسط میں تھا۔ مسلمان عام طور سے افلاس، پستی، مایوسی، بے علمی اور بے عملی کا شکار تھے۔ ان کے فوری علاج کے لیے ایک نسخہ درکار تھا اور حالی نے یہی نسخہ تجویز کیا۔ وہ کبھی مسلمانوں کو ان کی گزشتہ عظمت یاد دلا کر، کبھی حال کی پستی پر شرمندہ کر کے، کبھی دوسری قوموں کے عروج کی تصویر دکھا کر ایک مضبوط قوم بنانا چاہتے تھے ان کے پیش نظر کوئی مستقل فلسفہ سیاسیات نہ تھا، جو مستقبل میں دور تک دیکھتا۔ اس لیے ان حالات میں انھیں مفاہمت اور انگریزی حکومت کے زیر سایہ ترقی کرنے کے امکانات پیدا کرنے والے سیاسی راستے پر چلنے کی تلقین کرنا پڑی۔ اس وقت متوسط طبقے کا یہی راستہ تھا سیاسی شعور نے حالی کی ادبی سرگرمیوں میں جان ڈالی اور انھیں جدید اردو ادب کا سب سے بڑا معمار بنا دیا۔ یہ سچ ہے کہ جس طرح ان کی سیاست پر متوسط طبقے کی بہبودی کے خیال اور مذہب کی پرچھائیں پڑ رہی تھیں اسی طرح ان کی ادبی سرگرمیوں میں متضاد اخلاقی اور سماجی لہریں دوڑتی نظر آتی ہیں۔ تاہم یہ بات

صاف ہے کہ وہ رجعت پسند، تنگ نظر اور ابن الوقت نہیں تھے بلکہ فراخ دل وسیع القلب، نئی زندگی کا استقبال کرنے والے اور حقیقت پرست تھے اور سارے ملک کو اور خاص کر مسلمانوں کو جاگیر داری کے سڑے گلے نظام سے باہر نکال کر صنعتی دور کے قبول کرنے پر تیار کرنا چاہتے تھے۔ اگر حالی کے شعور کی تشکیل اس طرح نہ ہوئی ہوتی تو وہ کبھی یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ "خیال بغیر مادہ کے نہیں پیدا ہوتا (مقدمہ شعر و شاعری) اور ہر شاعر کے خیالات کم و بیش کسی حقیقت واقعہ پر، نہ کہ اختراع ذہن پر مبنی ہونے چاہئیں"۔ (حیات سعدی)

سنہ ۱۹۴۹ء

صالحہ عابد حسین

حالی کا تعلق سر سیّد اور علیگڈھ سے

حالی اور سر سید انیسویں صدی کی وہ بلند ترین ہستیاں ہیں جن میں گوناگوں صفات، کمال حسن و خوبی سے جمع ہو گئیں تھیں، ان دونوں بزرگوں نے عمر بھر ملک و قوم، علم و ادب، دین و مذہب کی جو انمول خدمات انجام دیں ان کے ذکر کے لیے ضخیم کتابیں بھی ناکافی ہیں اور ان پر قلم اٹھانا بڑی جرأت کا کام ہے لیکن میرے مضمون کا موضوع سر سیّد اور حالی کی پوری زندگی اور کارناموں کا جائزہ لینا نہیں بلکہ صرف یہ بتانا ہے کہ حالی کو سر سید سے کیا تعلق تھا، سر سید کی کتنی محبت اور عظمت ان کے دل میں تھی۔ علی گڈھ کی تعلیمی تحریک سے انھیں کسقدر دلی اور گہرا لگاؤ تھا اور اس کے لیے انھوں نے کیا کچھ کیا۔

لیکن حالی کی ذاتی زندگی اور شخصی تعلقات پر کچھ لکھنا بڑا ہی کٹھن کام ہے خصوصاً اس وقت جب ان کے بعد سے دیکھنے والے

اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور جو ہیں وہ یا تو بہت دور جا چکے ہیں یا ہماری پہنچ سے اونچے ہیں۔ اب صرف ایک ذریعہ رہ جاتا ہے کہ حالی کی تصانیف سے مدد لی جائے مگر اس معاملہ میں بھی ہمیں مایوسی ہوتی ہے اس لئے کہ حالی کو اپنے کو چھپانے کی ایسی عادت ہے کہ مشکل سے کہیں اپنا ذکر آنے دیتے ہیں۔ اس مضمون کو لکھنے کے سلسلے میں میں نے حیات جاوید کا نئے سرے سے مطالعہ کیا اس امید کے ساتھ کہ اس سے سرسید اور حالی کے تعلقات پر روشنی پڑے گی۔ لیکن ان سات سو صفحات کو کھنگالنے کے بعد جن میں سرسید کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے کاموں کو ہر جہت سے پرکھا گیا ہے ہمیں "راقم" کا ذکر بہت کم ملا۔ کتاب میں سرسید کے اکثر دوستوں کا ذکر آتا ہے مگر اس دوست کا نہیں آتا جس سے اکیس سال ان کے نہایت قریبی اور گہرے تعلقات رہے تھے اور جس نے ان کے کاموں میں برابر ان کا ساتھ دیا اور ہر ممکن طریقے سے علی گڑھ کی تعلیمی تحریک کو مقبول بنایا تھا، اگر کہیں ایسا ہی ناگزیر موقع آ پڑے تو حالی ایک دوست کہکر آگے بڑھ جاتے ہیں اور ہم صرف انداز سے معلوم کر سکتے ہیں کہ اس "ایک دوست" کے پردے میں حالی کی ذات پوشیدہ ہوگی، حالی کے اندر انکسار کا جو حد سے بڑھا ہوا جوہر تھا یہ اس کی ایک کھلی ہوئی مثال ہے حیات جاوید کے دیباچہ میں اپنا ذکر ناگزیر تھا۔ چنانچہ کیا مگر کس انداز سے "میں نے خیال کیا

کہ اگرچہ قوم میں لائق آدمی روز بروز بڑھتے جاتے ہیں مگر مزدوروں کا گھاٹا ہوتا جاتا ہے خدا کے فضل سے ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو سرسیّد کے کاموں کی دل سے قدر کرتے ہیں ان کی خدمات کی داد دیتے ہیں ان کی بائیوگرافی کو قوم کے حق میں مفید سمجھتے ہیں اور اگر کوئی ان کی بائیوگرافی لکھے تو اس پر نکتہ چینی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے ہیں مگر اس کا لکھنے والا کوئی نظر نہیں آتا۔ جوہریوں سے بازار بھرا پڑا ہے مگر کان کھودنے والے مفقود ہیں۔"

البتہ مکتوبات حالیؔ سے ضرور کچھ مدد ملی۔ اگرچہ سوئے اتفاق سے اس مجموعہ میں سرسیّد کے نام کا کوئی خط نہیں لیکن دوسرے خطوں میں سے اکثر میں علی گڑھ کا، سرسیّد کا اور مدرسۃ العلوم کا ذکر ملتا ہے اُسی کی روشنی میں ہم نے یہ مضمون لکھنے کی جرأت کی ہے

الطاف حسین اس وقت پیدا ہوئے جب سیّد احمد خاں جوانی کی منزلیں طے کر رہے تھے تقریباً چالیس سال کی عمر تک وہ سرسیّد سے ناواقف یا صرف ان کے نام سے آشنا رہے یہ زمانہ حالیؔ کے سارے علم و فضل اور ادبی و شعری کارناموں کے باوجود ان کی گم نامی کا دور ہے ایک محدود حلقہ کے باہر عام طور پر لوگ ان سے واقف نہ تھے ظاہر ہے کہ جو شخص آخر عمر تک اپنے کو چھپانے کا عادی رہا ہو، وہ جوانی کے دور میں جب حجاب اور جھجک کہیں زیادہ ہوتی ہے،

شہرت اور خود نمائی سے کس قدر بھاگتا ہوگا۔ حالی کا نام اور کام بھی سرسید سے شناسائی کے بعد ہی چمکا۔

حالی قدرت کی طرف سے وہ صلاحیتیں لیکر پیدا ہوئے تھے جو کسی مصلح میں ہونی چاہئیں۔ اور ان کے قلم میں خدا نے وہ تاثیر دی تھی جو خوابِ غفلت میں سرشار قوم کو بیدار کرنے کا کارنامہ انجام دے سکتی ہے لیکن ان کی پرورش اور تعلیم جس ماحول میں ہوئی وہ قدامت پرستی کے رنگ میں رنگا ہوا تھا جب انھوں نے دہلی جا کر کسبِ علم کیا اس وقت بھی ان حلقوں میں رہے جہاں جدید علم کو جہل اور جدید درسگاہوں کو بچھلے کہا جاتا تھا۔ چنانچہ حالی نوجوانی کے زمانہ میں جب انسان ہر نئی چیز سے جلدی اثر قبول کرتا ہے وہ جدید تعلیم سے نا آشنا رہے مگر ان کو اس کا احساس تھا کہ اس وقت ادب و شاعری میں، سماجی زندگی میں، علمی دنیا اور عملی میدان میں ہر جگہ اصلاح کی ضرورت ہے ان کے دل میں ایک چبھن، ایک کھٹک تھی کہ اس کے لئے کچھ کرنا چاہیئے مگر اس وقت تک ان کے ذہن میں کوئی واضح تصور نہ تھا کہ کیا راستہ اختیار کرنا چاہیئے پھر بھی اصلاح کی لگن ان کو چین نہ لینے دیتی تھی۔ عشق و حسن کی پرانی شاعری سے وہ بیزار ہو چکے تھے ۱۸۵۷ء کے قیامت خیز دور سے گزرنے کے بعد، مسلمانوں کی سستی و بے ہمتی دیکھ کر ان کے دل پر مایوسی اور افسردگی کا

غلبہ تھا۔ اگرچہ انھوں نے اس زمانہ میں شاعری میں ایک نئی راہ ضرور نکالی اور نئے طرز کے مشاعروں میں اپنی چار مشہور مثنویاں برکھا رت، امید، حب وطن اور کلمۃ الحق پڑھ کر شعر کی دنیا میں انقلاب کی تیاری شروع کر دی مگر اس سے ان کا دل مطمئن نہ تھا حالی نے اپنی اس دور کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے مسدس حالی کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"البتہ شاعری کی بدولت چندے روز جھوٹا عاشق بننا پڑا۔ ایک خیالی معشوق کی چاہ میں برسوں دشت جنوں کی وہ خاک اڑائی کہ قیس و فرہاد کو گرد کر دیا.... جب رشک کا تلاطم ہوا تو ساری خدائی کو رقیب سمجھا.... بادہ نوشی پہ آئے تو خم کے خم لنڈھا دیئے اور پھر بھی سیر نہ ہوئے کفر سے مانوس رہے ایمان سے بیزار رہے.... کعبہ و مسجد کی توہین کی خدا سے شوخیاں کیں۔ نبیوں سے گستاخیاں.... بیس برس کی عمر سے چالیس سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے، جب آنکھیں کھلیں، تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے اب تک وہیں ہیں۔"

جب آنکھیں کھلیں، جوش جوانی ہلکا پڑا، تنقید کی صلاحیت ابھری تو حالی کا دل اس "جھوٹی" شاعری سے بیزار ہو گیا۔ جھوٹی محض اس لئے نہیں کہ اس میں مبالغہ اور تخیل کی اس قدر فراوانی ہوتی تھی کہ سچائی اور حقیقت آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں ہوتی بلکہ اس لئے بھی کہ حالی کی یہ عشقیہ شاعری خود ان کی واردات قلب نہ تھی بلکہ

محض تقلیدی شاعری تھی۔ ظاہر ہے کہ حالی جیسے انسان کو جب اس کا شعور ہو گا تو دل پر کیا بیت گئی ہو گی۔ فرماتے ہیں "نگاہ اٹھا کر دیکھا تو دائیں بائیں، آگے پیچھے ایک میدان وسیع نظر آیا جس میں بے شمار راہیں چاروں طرف کھلی ہوئی تھیں اور خیال کے لئے کہیں عرصہ تنگ نہ تھا۔ جی میں آیا کہ قدم آگے بڑھائیں اور اس میدان کی سیر کریں مگر جو قدم بیس برس تک ایک چال سے دوسری چال نہ چلے ہوں اور جن کی دوڑ گز دو گز زمین میں محدود رہی ہو ان سے اس وسیع میدان میں کام لینا آسان نہ تھا۔" لیکن یہ شعور ہو چکا تھا کہ یہ جھوٹی شاعری بیکار ہے اور اپنی اس خداداد صلاحیت سے انھیں قوم کو پستی و بدحالی کا احساس دلانے کا مقدس کام لینا ہے مگر کوئی واضح راہِ عمل سامنے نہ تھی۔ راست گوئی اور حبِ وطن جیسی نظمیں ان کے دل کی آواز ضرور تھیں مگر وہ ان کو اتنا پر اثر نہ سمجھتے تھے جو قوموں کے ذہنوں کو بدل سکیں اسی زمانہ میں خدا نے ان کو اس راہنما سے ملا دیا جس کو سالہا سال سے ان کا دل تلاش کر رہا تھا۔ "ناگاہ دیکھا کہ ایک خدا کا بندہ جو اس میدان کا مرد ہے ایک دشوار گزار رستے میں رہ نوردی ہے بہت سے لوگ جو اس کے ساتھ چلے تھے تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں بہت سے ابھی اس کے ساتھ افتاں خیزاں چلے جاتے ہیں مگر ہونٹوں پر پیڑیاں جمی ہیں، پیروں میں چھالے پڑے ہیں، دم چڑھ رہا ہے۔ چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں مگر وہ اولوالعزم آدمی جوان سب کا رہنما ہے اسی طرح

تازہ دم ہے نہ اسے رستے کی تکان ہے نہ ساتھیوں کے چھوٹ جانے کی پرواہ ہے نہ منزل کی دوری سے کچھ ہراس ہے اس کی چتون میں غضب کا جادو بھرا ہے جس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے وہ آنکھیں بند کر کے اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی ایک نگاہ گرم ادھر بھی پڑی اور اپنا کام کر گئی۔ بیس برس کے خستہ و کوفتہ اسی دشوار گذار راستہ پر پڑ لئے۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے"

اور اس دیرینہ سال پیر نے جس کی شخصیت میں عمل کی لگن، قوم کی اتھاہ محبت، استقلال کی بے پناہ قوت اور برداشت کے بے مثال مادہ نے غضب کی کشش پیدا کر دی تھی حالی کے دل کو جیت لیا۔

سرسید سے ملنے کے بعد حالی کو اندازہ ہوا کہ وہ اسی مقصد کیلئے بیس برس سے جدو جہد کر رہے ہیں جس کی لگن خود حالی کے دل میں لگی ہے، سرسید کے دل میں مسلمان قوم کی بدحالی کا گہرا احساس اور اس کو دور کرنے کی جو سچی لگن تھی اور مذہب۔۔۔ اصلی اور حقیقی مذہب کا جو اتھاہ عشق تھا اسے دیکھ کر حالی اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی پرانی ڈگر اور طرز کو خیرباد کہہ کر سرسید کے رنگ میں رنگ گئے۔ پرانی شاعری سے پہلے ہی بیزار تھے اب جو:۔

"قوم کے ایک سچے خیر خواہ نے۔۔۔ آکر ملامت کی اور غیرت دلائی کہ حیوان ناطق ہونے کا دعویٰ کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان

سے کچھ کام نہ لینا پڑے شرم کی بات ہے قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے، شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے دین کا صرف نام باقی ہے، افلاس کی گھر گھر پکار ہے پیٹ کی چاروں طرف دہائی ہے اخلاق بالکل بگڑ گئے اور بگڑتے جاتے ہیں تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہے رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے جہالت اور تقلید سب کی گردن پر سوار ہے ..... ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے تو بہتر ہے ورنہ ہم سب ایک ہی ناؤ میں سوار ہیں ..... ایسی حالت میں انسان کے دل پر ہمیشہ دو طرح کے خیالات گزرتے رہے ہیں ایک یہ کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ دوسرے یہ کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیئے پہلے خیال کا یہ نتیجہ کہ کچھ نہ ہوا اور دوسرے خیال سے دنیا میں بڑے بڑے عجائبات ظاہر ہوئے ....؟

بات دل سے نکلی تھی دل میں جا کر بیٹھی اور بقول ڈاکٹر عابد حسین کے الطاف حسین حالی کے دل پر ..... سرسید کی شخصیت اور تحریک کا عجیب و غریب اثر پڑا۔ انھیں وہ رہنما مل گیا وہ راہِ عمل نظر آگئی وہ مقصد حیات ہاتھ آگیا جسے ان کا دل ڈھونڈھتا تھا۔ انھوں نے دل میں ٹھان لی کہ اپنی زندگی اور اپنی شاعری کو اس کام میں صرف کریں گے کہ مسلمانوں کے ادب و شعر کے مذاق کو سنواریں، ان کے دل میں جذبہ قومی بیدار کریں اور تعلیم و ترقی کا شوق پیدا کریں[1] ..... "

---

[1] مضامین عابد

اثر کا فوری نتیجہ مسدس تھا جس نے ایک طرف شعر کی دنیا میں اور دوسری طرف قوم کے ذہنوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اس کا پائیدار اثر وہ علمی و ادبی کام تھا جو حالی اپنی آخری سانس تک انجام دیتے رہے۔

حالی نے ایک مضمون ۱۸۷۰ء میں "علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ" میں مولوی سید احمد خاں بہادر سی ایس آئی "کے عنوان سے لکھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑے عرصہ پہلے ہی حالی کی ان سے ملاقات ہوئی تھی اور ان کو سرسید کے بارے میں جو غلط فہمی تھی کبھی وہ دور ہو چکی تھی انھوں نے اپنا فرض جانا کہ قوم کے دوسرے افراد کو بھی اس سے آگاہ کریں چنانچہ مضمون شروع ہی اس طرح ہوتا ہے۔ ان دنوں میں جناب مولوی سید احمد خاں بہادر تمام ہندوستان کی تربیت میں عموماً اور ہماری قوم کی تہذیب و اصلاح میں خصوصاً جو انمردانہ سعی اور کوشش کر رہے ہیں اور اپنے اس احسان کی بنیاد ڈال رہے ہیں جس کے بوجھ سے ہم اور ہمارے اسلاف کبھی سبک دوش نہ ہوں گے جو لوگ ان کی سرگرمی اور جانفشانی کو شائبہ اغراض نفسانی سے پاک اور منزہ نہیں جانتے یا ان کی رائے کو قرینِ ثواب نہیں سمجھتے یا ان کے دشمنوں کو مسلک بدمی سے متجاوز کہتے ہیں اگرچہ میں نہ کبھی پہلے ان کا ہم زبان ہوا اور نہ اب ہوں اور امید ہے کہ آگے بھی نہ ہوں گا مگر اس میں شک نہیں کہ اس تحریر سے پہلے ان کے باب میں میری رائے کبھی

تذبذب اور تردد سے خالی نہیں رہی۔ لیکن الحمد للہ کہ میرے تذبذب کا منشا، کوئی داعیہ نفسانی نہ تھا لہٰذا میرے خلوص نے مجھ کو اس مرض سے نجات دی اور غالباً جو رائے میری اب ہے یہی قرین ثواب ہے۔"

اس کے بعد مضمون میں سرسید کی ان کوششوں کا ذکر ہے جو تعلیمی میدان میں کر رہے تھے اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالکر اور دوسرے کارناموں کو بیان کرکے مسلمانوں کی بدگمانی اور تعصب کو دور کرنے کی کوشش کی ہے مضمون ان سطروں پر ختم ہوتا ہے

"..... میں نے جو کچھ لکھا ہے اس سے مجھ کو مولوی سید احمد خاں کا خوش کرنا مقصود نہیں ہے نہ ان کے مخالفوں سے بحث کرنی مقصود بلکہ اس کا منشا وہ ضرورت اور مصلحت ہے جس کے سبب سے بھولے کو راہ بتائی جاتی ہے اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے۔ وما علینا الا البلاغ المبین۔"

سرسید نے ۱۸۷۰ء میں "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس کا مقصد مسلمانوں کے ذہنوں کو ایک طرف جدید تعلیم کے لئے تیار کرنا اور علوم جدیدہ کے مدرسہ کے لیے زمین تیار کرنا تھا اور دوسری طرف ان کی سماجی زندگی میں اصلاح کرنا تھی۔ اس میں زیادہ تر مضامین تو سرسید کے ہوتے تھے اور ان کے صاحب قلم دوست بھی اکثر لکھتے تھے چنانچہ حالی بھی اس میں مضامین لکھتے تھے جن میں ادبی، اخلاقی، اصلاحی اور مذہبی سبھی قسم کے ہیں لیکن مقصد سب کا ایک ہی ہے یہ مسلمانوں کو انکے

نقائص سے آگاہ کرنا اور ان کی اصلاح کی کوشش، زمانہ، تدبیرِ مزاج دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے۔ تدبیر وغیرہ وغیرہ سب اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ۱۸۷۵ء میں علی گڈھ کے مدرسہ کی بنیاد پڑ گئی تھی چند سال بعد غالباً ۱۸۷۵ء میں جب حالی نے علی گڈھ جاکر مدرسۃ العلوم دیکھا تو وہ اس سے بہت متاثر ہوئے اس اثر کو خود ان کی زبان سے سنئے :۔ "ہم بڑے بڑے مقدس واعظوں کی مجالسِ وعظ میں حاضر ہوئے ہم نے اونچے اونچے منبروں پر نہایت فصیح و بلیغ خطبے بھی سُنتے ہیں۔ ہم حال اور قال کی مجلسوں میں بھی شریک ہوئے ہیں ہم نے پیرانِ طریقت کے گرد مریدوں اور طالبوں کے حلقے بھی دیکھے ہیں اور ان کے دل ہلا دینوالے نعرے سنے ہیں مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ جو قومی مسرت اور اسلامی حمیت اس مدرسہ کو دیکھکر خود بخود جوش میں آتی ہے وہ کسی دوسری جگہ اب تک نہیں دیکھی گئی بلاشبہ جو شعر نظیری نیشاپوری نے بیت اللہ شریف کی زیارت کے وقت پڑھا تھا وہ اس مدرسہ کو دیکھکر ہمیں یاد آیا . . . . .

این کعبہ را بنانہ بباطل نہادہ اند
صد معنی وجمال دریں گل نہادہ اند

. . . . اس کالج کی ادھوری نیویں اس کے اسکول کے نامرمت کمرے اُس کے بورڈنگ ہاؤس کی ناتمام تین اس کے احاطہ کی چند سنگین جالیاں . . . ہمارے دل میں تاج گنج کے روضے اور اکبر کے

مقبرے سے زیادہ عظمت اور شوکت رکھتی ہے..... اس کی اونچی نیچی زمین اور گھاس اور اس کی مٹی لاہور کے شالا مار باغ اور لکھنؤ کے قیصر باغ سے زیادہ دلکش اور دلکشا معلوم ہوتی ہے کیونکہ وہ صرف ایک ایک شخص کے دل کا ارمان نکالنے کے لئے بنائے گئے تھے اور یہ اس لئے بنایا جاتا ہے کہ تمام قوم کے ارمان اس سے نکلیں۔"

صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ الفاظ کسی ادیب کی لسانی یا شاعر کا مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت میں قوم کے اس دردمند کا دل اس مدرسہ کو دیکھ کر جس کو وہ مسلمانوں کی ترقی و بہبود کا سنگ بنیاد سمجھتا تھا۔ فخر و مسرت سے جھوم اٹھا ہے اور یہ باتیں اس کے دل کی گہرائی سے نکل رہی ہیں اسے دیکھ کر مدرسہ کے بانی کی عظمت و قدر اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے چنانچہ فوراً ہی وہ اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں "جس طرح قادرِ ذوالجلال نے بنی نوع انسان پر نئی دنیا ظاہر کرنے کے لئے ... جنیوا میں کلمبس کو پیدا کیا تھا۔ اسی طرح اس نے ہماری بہبودی کے لئے ہندوستان میں ایک اولوالعزم اور عالی ہمت آدمی پیدا کیا ہے جو باوجود قوم کی سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں کے آج تک اپنے ارادے میں ثابت قدم ہے۔ ہم مدرسۃ العلوم کے اس وسیع میدان میں، کالج، دھوپ کے وقت ایک پیر مرد سفید ریش، نورانی صورت عالی دماغ آدمی کو باوجود کبرسنی ... کے نہایت ذوق و شوق اور امنگ کے ساتھ دو دو گھنٹے پا پیادہ پھرتے دیکھتے رہے ہیں..."

ایک اور مضمون "بدگمانی" میں ایک جگہ مسلمانوں کی بدگمانی کی عادت پر تنبیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اب چند سال سے قوم کی ایک خیر خواہ جماعت نے قوم کی تعلیم و تربیت کا سامان مہیا کرنے پر کمر باندھی ہے اور علی گڈھ میں ایک ایسا قومی مدرسہ قائم کیا ہے جس کی نظیر ایشیا کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی اس نے قوم کی بدگمانی رفع کرنے میں بھی حتی الامکان کوشش کی ہے اور کوئی عقدہ ان کی دلجمعی اور اطمینان کا فرو گذاشت نہیں کیا مگر قوم کی بدگمانی بدستور چلی آتی ہے۔ وہاں تعلیم کے ساتھ تربیت میں بھی بہت زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے .... وہاں طالب علموں کی حفظ صحت کا خیال بھی جو کہ نہایت ضروری چیز ہے حد سے زیادہ کیا جاتا ہے ان کو مذہبی قواعد کا بھی کمال قدغن کے ساتھ پابند کیا جاتا ہے.... غرض تعلیم و تربیت کا سامان وہاں اس قدر مہیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اولاد کے لیے اس سے بڑھ کر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے بہت سے بے پروائی سے اور بہت سے عناد سے اور سب سے زیادہ بدگمانی سے اس چشمۂ فیض سے محروم ہیں۔"

۱۸۸۰ء میں ایک اور مضمون "دورۂ ایام تعطیل" علیگڈھ انسٹی ٹیوٹ میں شائع ہوا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال بھر کے عرصہ میں باوجود منصبی فرائض کے حالی تین بار مدرسہ کو جا کر دیکھ چکے تھے......

"اب کی دفعہ مدرسۃ العلوم کو ہم نے تیسری بار دیکھا اس کی روز افزوں

ترقی دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا اور ہم کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اولوالعزم اور مستقل مزاج آدمی اپنے ارادوں کی مزاحمت سے اور زیادہ کامیاب ہوتے ہیں ان لوگوں کے سوا جو عناد اور دشمنی سے اس مدرسہ کے مخالف ہیں سب مسلمان رفتہ رفتہ اس کی قدر کرتے جاتے ہیں جن عمدہ اصول پر اس مدرسہ کی بنیاد قائم ہوئی ہے ان کی خوبی اور عمدگی سب پر ظاہر ہوتی جاتی ہے۔ علی گڈھ میں ہم بعض ایسے دوستوں سے بھی ملے جو چند سال پہلے اس مدرسہ کو دار الکفر سمجھتے تھے لیکن اب حد سے زیادہ اس کے مدح اور ثنا خواں ہیں۔۔۔۔"

مدرسہ کی ترقی اور مقبولیت دیکھ دیکھ کر حالی کے بلبلیوں خون بڑھتا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ وہ بھی ملازمت کی پابندیوں سے آزاد ہو کر یکسوئی کے ساتھ قوم کی اور شعر و ادب کی خدمت کریں لیکن یہ ایسا آسان کام نہ تھا۔ خاندان کی کفالت اور پیٹ کی پوجا کے لیے پرائی تابعداری کرنی پڑتی تھی لیکن جب ۱۸۸۷ء میں حیدرآباد سے ایک قلیل رقم ان کے لیے علمی وظیفہ کے طور پر مقرر ہو گئی تو انھوں نے ملازمت کو خیرباد کہہ دیا اور اپنا پورا وقت اور توجہ اپنے محبوب کاموں میں صرف کرنے لگے۔

حالی کا سرسید کے حلقہ احباب و ارادت میں شامل ہونا تھا کہ وہ بھی نیچری اور کافر سمجھے جانے لگے اور ان پر بھی ہر طرف سے لعن و طعن اور اعتراضوں کی بوچھار ہونے لگی۔ مندرجہ بالا مضمون

میں ایک جگہ لکھتے ہیں " کوچبان اتفاق سے نہایت متقی تھا اس نے رستہ میں پانی پینے کے لئے ہم کو اپنا برتن نہ دیا اور ہم سے ایسا پرہیز کرتا رہا جیسے بعض ہندو مسلمان سے کرتے ہیں اول ہم کو تعجب ہوا لیکن پھر یاد آیا کہ ہم نے اپنے عالی قدر میزبان یعنی مسٹر سید کے یہاں برابر دو وقت میز پر کھانا کھایا تھا۔ اس لئے ہم سے پرہیز لازمی تھا "

اسی زمانہ میں ایک دوسرے مضمون " سرسید احمد خاں اور مذہب " میں انھوں نے سرسید کے مذہبی خیالات کی تشریح کر کے یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ سرسید سچے مسلمان اور عاشق اسلام ہیں اور انھوں نے مذہب کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں ساتھ ہی یہ بھی واضح کیا ہے کہ وہ اپنے خیالات اور عقاید زبردستی مدرسہ کے طالب علموں پر ٹھونسا نہیں چاہتے بلکہ یہاں اس بات کی بڑی احتیاط کی جاتی ہے کہ ان کے جن مذہبی خیالات سے عام طور پر مسلمان ناراض ہیں ان کے بارے میں کتابیں یا اخبار مدرسہ میں نہ آئیں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ خود حالی سرسید کے مذہبی خیالات سے تمام تر متفق نہ تھے لیکن اس اختلاف کے باوجود وہ سرسید کی مذہبی خدمات کی قدر کرتے تھے حیات جاوید میں۔ انھوں نے اس مسئلہ پر بہت مفصل بحث کی ہے حالی خود پکے مذہبی آدمی تھے (انھیں) اسلام سے سچا عشق تھا جدید تعلیم کے بارہ میں اگر انھیں یہ اندیشہ ہوتا کہ وہ نوجوانوں کو مذہب سے دور لے جائے گی تو شاید یہ سبب ... ... وہ اس کی مخالفت کرتے۔ اگر انھوں اسے دیکھا ...

اس کے بانی کا دل تو خود نورِ ایمان سے روشن ہے اور اسلام کی محبت ہی اسے ابھار رہی ہے کہ وہ نئی پود کو الحاد اور لادینی سے بچائے اسی چیز نے حالیؔ کو اس تعلیمی تحریک کا اور بھی حامی بنا یا تھا حیات جاوید میں ایک جگہ سرسید کے مذہبی خیالات سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "ان کو" یعنی (سرسید) اس بات کا احساس تھا کہ انگریزی تعلیم کے مضر اثرات سے مسلمانوں کو بچانا چاہیئے"۔ یعنی الحاد و دہریت سے جو مغرب میں زور پکڑے ہوئے ہیں"۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ثابت کریں کہ اسلام موجودہ علوم و فلسفہ، حکمت سائنس کی ضرب سے ٹوٹ نہیں سکتا بلکہ سچا اسلام اس کا حامی ہے اور ان سے اسلام کی حمایت ہوتی ہے۔ مغربی تعلیم کے مخالف اسلام کو کمزور سمجھتے ہیں ورنہ کیوں ڈرتے ہیں؟.... وہ پرانے مولویوں سے بالکل ناامید تھے کیوں کہ بقول ان کے ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ یونانی فلسفہ کے علاوہ کوئی اور فلسفہ اور عربی زبان کے علاوہ کوئی اور زبان بھی دنیا میں موجود ہے یا نہیں.... علاوہ بریں تقلید کی عادت نے ان کو بالکل قدما کا پابند کر دیا ہے۔ اور طعن و ملامت کے خوف سے وہ کچھ نہیں کرتے لیکن ان کا خیال تھا کہ جوں جوں انگریزی تعلیم پھیلے گی مروجہ اسلام کی جانب سے بدظنی، بے پروائی، برگردانی پھیلتی جائے گی۔ اس کو دور کرنا اور حال کے علم طبعی اور فلسفہ کے مسائل کو اسلامی مسائل سے تطبیق دینا یا ان کا بطلان ثابت کرنا ہمارا فرض ہے وہ کہتے تھے کہ قدرت، یا فطرت خدا کا فعل ہے اور ہر سچا مذہب

اور اس کی کتاب خدا کا قول ہے ان دونوں میں مطابقت ضروری ہے اس بنا پر انھوں نے اپنی تفسیر لکھی اور اپنے علم کلام کی بنیاد ڈالی۔"

آل احمد سرور نے حالی کے لئے لکھا ہے کہ وہ شخصیت پرست نہیں اصول پرست ہیں۔۔۔۔؟ اور یہ بات بڑی حد تک درست ہی ان کے دل میں سرسید کی بڑی محبت تھی لیکن جس چیز نے چالیس سال تک انھیں علی گڈھ سے وابستہ رکھا وہ علی گڈھ کی تعلیمی تحریک تھی جسے وہ مسلمانوں کی ترقی و بہبود کے لئے اشد ضروری سمجھتے تھے سرسید کی اس قدر عظمت بھی ان کے دل میں اسی وجہ سے تھی وہ انھیں مسلمانوں کی کشتی کا ناخدا سمجھتے تھے" حیات جاوید" میں انھوں نے سرسید کی ذات اور شخصیت سے کہیں زیادہ ان کے کاموں اور اصولوں سے بحث کی اور انہیں اہمیت دی ہے۔

حالی صاحب قلم تھے اور یہی ان کی کوششوں کا اصل میدان تھا چنانچہ وہ اپنے قلم سے مدرسۃ العلوم علی گڈھ کی ہر ممکن خدمت انجام دیتے رہے، نثر میں، نظم میں، تقریر سے تحریر سے، تہذیب الاخلاق علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ اور دوسرے رسالوں میں مضمون لکھے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں تقریریں کرتے اور ان مواقع کے لیے خاص طور پر نظمیں کہتے تھے ۱۸۸۷ء میں ایک نظم ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھی۔

۱۸۸۹ء میں "مسلمانوں کی تعلیم" کے عنوان سے ایک اور طویل نظم ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھی جو بڑی پر اثر اور عبرت خیز ہے۔

غرض ان کی خاص موقع کی کہی ہوئی نظموں میں بھی اور دوسرے کلام میں بھی اصلاح و ترقی کی کوشش کی یہی روح جاری و ساری نظر آتی ہے لیکن جس نظم نے سب سے زیادہ سرسید کے مشن کو تقویت پہونچائی وہ مسدس ہے جس کا اصل مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو انکی ماضی کی شان و عظمت اور بلند مقام دکھا کر حال کی پستی و ذلت سے آگاہ کر کے مستقبل کے لئے راہِ ترقی میں قدم بڑھانے پر آمادہ کیا جائے۔

سرسید کی تحریک کے بعد حالی عرصہ تک مسدس کی تیاری میں لگے رہے حالی کا کوئی کام "چالو" نہیں ہوتا تھا وہ پوری محنت اور توجہ سے ہر کام کو سرانجام کرتے تھے اس دوران میں بہت سی پریشانیاں اور تفکرات ان کے راستہ میں حائل ہوئے مگر ان کو جس کام کی دھن لگ گئی تھی وہ لگی رہی۔ سرسید کی مضراب نے ان کے سازِ دل کے اس تار کو چھیڑ دیا تھا جس میں سے نئے دلسوز نغمے نکلنے کو خود ہی بیتاب تھے۔

حالی کی دور بین نظر نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ مسدس کو عام طور پر پسند نہ کیا جائے گا اور انھوں نے پیشین گوئی کر دی تھی کہ "ہمارے ملک کے اہل مذاق ظاہر، اس روکھی پھیکی سیدھی سادی نظم کو پسند نہ کریں گے ۔ جس میں نہ کہیں نازک خیالی ہے نہ رنگین بیانی ..... نہ مبالغے کی چاٹ ہے نہ تکلف کی چاشنی ..... " مگر بقول خود ان کے یہ نظم نہ واہ واہ سننے کے لئے کہی گئی تھی نہ مزے لینے کے لئے بلکہ " عزیزوں اور دوستوں کو غیرت اور شرم دلانے کے لئے ..... " چنانچہ وہی ہوا مخالفت اور

اور دل آزاری کا وہ شور و غوغا برپا ہوا کہ شروع شروع میں تعریف وتحسین کی آوازیں دب گئیں مگر وہ دریا کی سطح کے اس میل اور جھاگ کی طرح تھا جو ذرا کی ذرا شفاف پانی کو گدلا کر دیتا ہے وہ جلدی چھٹ گیا اور مسدس اپنی پوری عظمت و شان کے ساتھ آج تک جلوہ گر ہے مسدس کی تعریف میں تو اس وقت سے اب تک بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن جس انداز سے سرسید نے اس کو سراہا وہ اپنی نظیر آپ ہے اور سرسید کے الفاظ اس کے اصل مقام اور عظمت پر دال ہیں: "جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہوئی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے کس صفائی اور خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہے بیان سے باہر ہے تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایۂ ناز شعرا اور شاعری ہے بالکل مبرا ہے کیونکہ ایسی خوبی و خوش بیانی اور موثر طریقہ پر ادا ہوا ہے متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جا سکتے۔ حق ہے جو دل سے نکلتی ہے، دل میں بیٹھتی ہے ...... بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوا ہوں اور کچھ نہیں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے، اور قوم کو اس سے فائدہ بخشے ......"

حالی چاہتے تھے کہ اس کتاب کا حق تصنیف علی گڑھ کے مدرسہ کے

حق میں رجسٹری کرا دی جائے لیکن سرسید نے جو اپنے ہر دوست اور شناسا سے ہر ممکن اور ناممکن طریقے سے مدرسہ کے لیے مدد لیا کرتے تھے اور چندہ جمع کرنے کے لیے نئے ڈھنگ سوچتے تھے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس لیے کہ وہ اس نظم کی عظمت کو پہچان گئے تھے کہ یہ صرف حالی کی چیز نہیں بلکہ وہ ادب پارہ ہے جس کا اثر صدیوں تک رہتا ہے۔ اس لیے اسے کسی ایک شخص یا ادارے کے لیے مخصوص کر دینا اس کی اشاعت کو محدود کرنا ہے تو چاہتے تھے کہ مسجدوں میں امام نمازوں اور خطبوں میں اسے پڑھیں .... کہتے ہیں "میں نہیں چاہتا کہ اس مسدس کو جو قوم کے حال کا آئینہ یا ان کے ماتم کا مرثیہ ہے کسی قید سے مقید کیا جاوے جس قدر چھپے اور جس قدر وہ مشہور ہو اور لڑکے ڈنڈوں پر گاتے پھریں اور رنڈیاں مجلسوں میں طبلہ و سارنگی پر گاویں، قوال درگاہوں میں گاویں، حال لانے والے اس سچے حال پر اداویں اسی قدر مجھ کو زیادہ خوشی ہوگی ....."

سرسید کی یہ آرزو لفظاً بہ لفظاً پوری ہوئی۔ کوئی طبقہ ایسا نہ رہا جس نے اس کو پسند نہ کیا ہو اور اس کا اثر نہ لیا ہو۔ درس گاہوں، خانقاہوں، گھروں، بازاروں، مجلسوں، میلادوں، محفلوں، ناچ رنگ کے جلسوں ہر جگہ اس کے بند پڑھے اور گائے گئے۔ یہ سرسید کا تدبر اور دور اندیشی تھی کہ انہوں نے مسدس حالی کو قوم کی ملکیت رہنے دیا اور ہندوستان کے ہر شخص کو بلا تفریق مذہب و ملت یہ حق ہے کہ وہ جتنی چاہے اس کتاب کو چھاپے جس زبان میں چاہے ترجمہ کرے اور جتنا فائدہ اٹھا سکتا ہے

اٹھائے اسی کا نتیجہ ہے کہ شاید ہی اردو زبان کی کسی کتاب کی اس قدر اشاعت ہوئی ہو جتنی مسدس کی ہوئی ہے۔

لیکن حالی نے محض قلمی اعانت پر بس نہیں کی بلکہ اور بھی ہر ممکن طریقہ سے مدرسۃ العلوم کی خدمت انجام دیتے رہے، اپنے خاندان کے، دوستوں کے، وطن کے لڑکوں کو تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیجتے تھے اور ان میں سے اکثر کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔ سرسید کے ساتھ جگہ جگہ دور دراز کے سفر چندہ کی فراہمی کے لئے کرتے تھے اپنے شہر اور ضلع میں خود چندہ جمع کرکے مدرسہ کے لئے بھیجتے تھے اور ٹرسٹی کے فرائض پوری ذمہ داری سے ادا کرتے تھے انھیں اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے مدرسہ کی فکر رہتی تھی مکتوبات حالی میں سے بیشتر خط ایسے ہیں جن میں کسی نہ کسی جہت سے سرسید کا اور مدرسہ کا ذکر اور اس کی فکر کا اظہار ملتا ہے۔ جنوری ۱۸۹۴ء میں اپنے ایک عزیز کو لکھتے ہیں

"سید صاحب کو میں نے آج ہی خط لکھا ہے مگر تمہاری کوشش کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ وہ زبانی باتوں سے خوش ہونے والے نہیں۔ وہ تو جب تک قاضی الحاجات کا دیدار آنکھوں سے نہیں کر لیتے۔ ہرگز ایمان نہیں لاتے۔ حیدرآباد کے انقلاب سے افسوس ہے کہ مدرسہ کو اور سرسید کے منصوبوں کو سخت صدمہ پہنچا ہے ادھر سید محمود بھی چھوڑ بیٹھے .... تعمیر برابر جاری ہے (سرسید) اپنے نام سے قرض لے کر کام چلا رہے ہیں..... دس پندرہ ہزار کے قریب قرض لے چکے ہیں اور

بہت سے ادھورے پڑے ہیں خدا ہی پورا کرنے والا ہے۔۔۔۔!

۱۸۹۵ء سرسید انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں لاہور جا رہے تھے حالی کو یہ فکر ہوئی کہ سرسید یہاں سے یونہی نہ گذر جائیں بلکہ پانی پت یا کرنال میں ان کے اعزاز میں جلسہ کر کے ایڈریس پیش کیا جائے اور اس بہانے چندہ اکٹھا کر لیا جائے اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین کو جو علی گڈھ کے چند پہلے گریجوئیٹس میں تھے اور باپ کی طرح علی گڈھ کالج کی محبت ان کی رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں۔ میری رائے میں جلسہ کرنال ہی میں ہونا چاہیئے یہاں (پانی پت) جلسہ کرنا ٹھیک نہیں۔ اول تو یہاں سے چندہ کی کچھ امید نہیں" دوسرے کرنال کے جلسہ میں صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر بآسانی آ سکیں گے۔ میں نے سید صاحب کو بھی لکھ دیا ہے کہ کرنال میں جلسہ ہونا نہایت ضروری ہے اس کے بعد اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو ایک روز ہماری خوشی اور عزت افزائی کے لئے پانی پت میں بھی ٹھہر جائیے گا۔۔۔۔" پانی پت میں جو سید صاحب کا ٹھہرنے کا ارادہ تھا وہ صرف ہمارے خوش کرنے کے لئے تھا کچھ چندے کے خیال سے نہیں تھا۔ لیکن اب موقع ایسا آ پڑا ہے کہ چندہ کی تحریک کرنی ضروری ہے۔۔۔۔" چنانچہ سرسید وہاں آئے، جلسہ ہوا اور امید سے زیادہ چندہ لیکر گئے۔ اس کا ذکر اپنے عزیزوں کو یوں لکھا ہے "وہ ۲۰ فروری کو کرنال پہنچے اور ۲۲ کی صبح کو مع الخیر لاہور روانہ ہوئے۔۔۔۔۔۔ سوا نو سو روپیہ سجاد حسین اور محمد زاہد وغیرہ ہم نے کرنال گنج پور وہ بوندی وغیرہ سے جمع کیا اور نو سو روپے کیتھل کے تحصیلدار قاضی محتشم الدین صاحب

نے اپنی تحصیل سے اور چودہ سو پندرہ روپے سید نظیر علی صاحب نے تحصیل پانی پت سے جمع کر دیا۔ کرنال کے تحصیل دار نے بھی تین چار سو کا وعدہ کیا ہے مگر ابھی تک کچھ دیا نہیں۔ سید صاحب اکتیس سو روپے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔۔۔" آپ نے دیکھا کہ کہیں اس کوشش کی طرف اشارہ تک نہیں جو خود کاتب کو اس اکتیس سو روپے کے فراہم کرنے میں پڑی ہوگی۔

ستمبر ۱۸۹۱ء میں سر سید کے ساتھ ڈیپوٹیشن لیکر بھوپال اور حیدر آباد وغیرہ گئے وہاں سے خواجہ سجاد حسین کو لکھتے۔۔۔" ڈیپوٹیشن کو یا یوں کہو کہ سید صاحب کو توقع سے بہت زیادہ کامیابی ہوئی ایک سو اوپر بارہ ہزار بھوپال سے نقد ملے اور حضور نظام نے ایکہزار روپیہ ماہوار علاوہ ماہنامہ سابق کے کہ وہ بھی اسی قدر تھا مقرر فرمادیا۔ اور صرف ایک صوبہ سے ۲۵ ہزار نقد وصول ہوا ہے۔۔۔"

۱۸۹۵ء میں جب ایک کلرک نے کالج کے روپے میں غبن کیا تو اس کا جو کچھ صدمہ سر سید پر گذرا وہ ظاہر ہے جس شخص نے کوڑی کوڑی مانگ کر پیسہ جمع کیا ہو اور وہ اس طرح لٹ جائے تو اس حادثہ سے ان کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ سر سید کے صدمہ اور کالج کے نقصان کا رنج حالی کو بھی سر سید سے کم نہ تھا۔ ایک چوٹ جو سر سید کے دل پر لگی تھی اس کا درد ان کے دوست کو بھی اتنا ہی محسوس ہو رہا تھا انھوں نے اس واقعہ کے بعد سر سید کو جو خط لکھا اس کے جواب میں سر سید لکھتے ہیں۔۔۔" جو ہمدردی اس روپیہ کے غبن ہونے میں آپ نے میرے ساتھ فرمائی اس کا میں دل سے

شکر گذار ہوں مگر لاکھ روپیہ سے زیادہ کا غبن معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔" حالی نے حیات جاوید میں اس واقعہ کا ذکر بڑی دلسوزی اور رنج کے ساتھ کیا ہے۔ اور بڑی خوبی سے سرسید کی پوزیشن صاف کر کے دکھائی ہے کہ اس واقعہ میں ان کی بے پروائی نہ تھی ہاں ان کی نیک دلی اور کاموں کی اور ذمہ داریوں کی زیادتی کا دخل ضرور ہے لکھتے ہیں "جس قدر ہمتیں عالی ہوتی ہیں اسی قدر رنج و غم زیادہ ہوتے ہیں سرسید نے کالج کے عشق میں اتنے کام اپنے سر دھر لئے تھے کہ ایک آدمی کا ان سے عہدہ برآ ہونا سخت دشوار تھا۔ آخر ۱۸۹۵ء میں ان کو کالج کی بدولت ایسا دھکا لگا جس کا صدمہ آخر دم تک فراموش نہیں ہوا۔۔۔۔"

حالی نے سرسید کی سوانح عمری کئی سال پہلے ان کی زندگی ہی میں لکھنی شروع کر دی تھی مگر دوسرے کاموں کی وجہ سے بیچ بیچ میں یہ کام رک جاتا تھا۔ ۱۸۹۷ء میں سرسید کے انتقال کے بعد انھیں اس کی دھن لگ گئی کہ جلد سے جلد ان کی سوانح حیات مکمل ہو کر قوم کے ہاتھ میں آ جائے۔ ۱۹۰۱ء میں چھ سال کی محنت شاقہ کے بعد یہ کتاب مکمل ہو کر شائع ہوئی حالی کو اس کا بڑا افسوس تھا کہ انھوں نے سرسید کو نہیں دکھایا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ کتاب کی تکمیل کے بعد وہ ہیرو کو اس کی بائیوگرافی دکھائیں گے مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ حیاتِ جاوید کو مرتب کرنے میں حالی کو بہت محنت کرنی پڑی سرسید جیسی جامع شخصیت کے ساٹھ سالہ کاموں کو اکٹھا کرنا اور ان کی ترتیب و تکمیل آسان کام نہ تھا۔ بقول خود

حالی کے سرسید کی ذات میں اس قدر مختلف الجنس حیثیتیں جمع تھیں کہ ہر ایک حیثیت پر اس کی شان اور اس کے درجہ کے موافق گفتگو کرنا ایک ایسا کام ہے جس کا پورا پورا حق وہی مصنف ادا کر سکتا ہے جو خود بھی سرسید کے برابر جامع حیثیات ہو، مذہب، اخلاق، معاشرت، تعلیم، گورنمنٹ، پالیٹکس لٹریچر، پبلک سپیکنگ، (ریفارمیشن) وغیرہ وغیرہ کس کس بات کو بیان کیا جائے اور کس کس حیثیت پر گفتگو کی جائے: ..." ایک جگہ کہتے ہیں میں یہ ہرگز نہیں کہتا کہ میں نے اس عجیب و غریب شخص کی بائیوگرافی لکھنے کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے بلکہ مجھے اپنی کمزوریاں اور لغزشیں بخوبی معلوم ہیں اور میں علی الاعلان اقرار کرتا ہوں کہ مجھ سے اس بائیوگرافی کا حق ادا نہیں ہو سکا لیکن میں نے اپنی طرف سے کوشش کرنے میں کمی نہیں کی اور چھ برس تک اس کام کے سوا کسی طرف متوجہ نہیں ہوا۔ کسی متنفس کے قلم سے یا درم سے براہ راست مجھے مدد نہیں ملی لیکن ان کے اس انکسار کے باوجود حقیقت میں حالی کے سوا کوئی دوسرا اس کام کو سرانجام نہ کر سکتا تھا اور آج تک اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہیں لکھی گئی۔ مولوی شبلی جیسے ادیب انشاء پرداز نے حیات جاوید کو کتاب المناقب اور واقعات کا پشتارہ کہکر اپنی تنقیدی صلاحیت کا کوئی اونچا ثبوت نہیں دیا کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حالی نے اس محبت و عزت کے باوجود جو ان کے دل میں سرسید کے لئے تھی سرسید کی کمزوریوں کو نظرانداز نہیں کیا جہاں انھوں نے اپنے ہیرو کی لاتعداد اور غیرمعمولی خوبیوں کا ذکر کیا ان کے عظیم الشان کارناموں کو

گن یا اور ان کی زبردست شخصیت پر روشنی ڈالی ہے وہاں ان کے نقائص
کو بھی چھپایا نہیں وہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں اس پر نکتہ چینی بھی کرتے
ہیں اس لئے کہ وہ اپنے دشمن تک پر سخت لفظوں میں اعتراض نہیں کرتے
تھے تو ایسے شخص کی کمزوریوں کو جس سے انھیں بے پناہ عقیدت تھی اور جسکی
بے مثال خوبیوں کے وہ دل سے قائل تھے کیسے سخت لفظوں میں تنقید کرتے
وہ انسانی فطرت میں خوبی و کمزوری دونوں کے قائل تھے لیکن جس کی خوبیوں
کا پلہ کمزوریوں کے مقابلہ میں اتنا بھاری ہو جیسا سرسید کا تھا۔ اسے وہ
انسانیت کا بہت بلند درجہ دیتے ہیں انھوں نے حیاتِ جاوید کے دیباچہ
میں خود ہی اس مسئلہ کو چھیڑا ہے ..... "ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا
ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید
کی جڑ کاٹی ہے ... بڑے بڑے علما اور مفسرین کو للکارا ہے اماموں
اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے ... جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک
گروہ نے صدیق کہا تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا اور جس کو پالٹکس
کے لحاظ سے کسی نے "ٹائم سرور" سمجھا ہے تو کسی نے راستباز لبرل جانا ہے ایسے
شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے ضرور ہے کہ اس کا
سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا ین ٹھوک بجا کر دیکھا جائے وہ
ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے
اس لئے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی لائف میں اس کی پیروی کیجائے
اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے ..." ہاں حالی

نکتہ چینی کے قائل تھے عیب جوئی اور لعن وطعن کے نہیں۔ آگے چلکر کہتے ہیں اگر چہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہے اور نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اوروں کو بھی یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔۔۔" سرسید کا سچائی اور خلوص ہی تھا جس نے حالی کے دلمیں ان کی اس قدر وقعت بڑھا دی تھی اور انھیں اوصاف کی روشنی میں وہ ان کی پوری زندگی کو خود دیکھتے اور دوسروں کو دکھاتے ہیں اسی کو لوگوں نے تعصب سے مدلل مداحی کا خطاب دیا ہے کہیں اگر اس وقت حالی نے یہ کام انجام نہ دیا ہوتا تو نہ صرف یہ قوم اپنے اس بڑے محسن کے کارناموں اور اس کی سیرت سے بے خبر رہتی بلکہ اردو ادب حیات جاوید جیسی کتاب سے بھی محروم رہ جاتا لیکن اس قابل قدر کتاب کی طرف سے اس وقت بھی بڑی بے اعتنائی برتی گئی اور اس کی جیسی قدر ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی خاص طور پر سرسید کے دوستوں اور مداحوں نے جن سے حالی کو قدرتی طور پر یہ امید تھی کہ وہ اس کتاب کی پوری قدر کریں گے اس سے بڑی بے توجہی برتی اس کا حالی کو بڑا افسوس تھا اس لئے نہیں کہ ان کی چھ سالہ جانکاہ محنت کا یہ ثمرہ ملا۔ کیونکہ حیات جاوید کا مصنف شہرت کا پرستار اور تحسین کا بھوکا نہ تھا بلکہ اس لیے کہ انھوں نے اپنے نزدیک مسلمانوں کے محسن اور قوم کے بے مثال فرزند کی سیرت لکھ کر یہ سمجھا تھا کہ وہ اس سے سبق حاصل کریں گے مولوی حبیب الرحمن شیروانی کے ایک خط میں کیسے دلشکستہ انداز میں لکھتے ہیں

اگرچہ اس قلیل عرصہ میں کتابیں توقع سے زیادہ فروخت ہوگئیں ہیں مگر ایسی قدر دانی سے وہی خوش ہو سکتا ہے جو تجارت کے سوا تصنیف و تالیف کا کوئی اور مقصد خیال نہیں کرتا بلاشبہ میں نے کسی سے اشتہار یا ریویو وغیرہ لکھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی مگر میرا یہ خواہش نہ کرنا اس بات کا ہرگز مقتضی نہ تھا کہ سرسید کا کوئی دوست کتاب کا بالکل نوٹس نہ لے اور اخباروں کو جانے دیجئے۔ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جس کو سرسید کی یادگار کہا جاتا ہے ..... اس میں ایک حرف نہیں لکھا گیا اگرچہ میں صدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ سرسید کی لائف جیسی کہ چاہیئے تھی ویسی مجھ سے نہیں لکھی گئی لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ میں نے باوجود اپنی نا قابلیت کے اس بار گراں کو اپنے ذمہ لے کر سرسید کے تمام اصحاب اور حواریوں کو ایک فرض کفایہ سے سبکدوش کیا ہے...... ایک اور جگہ لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کی بے وقعتی نے ہیرو کی قدر بھی گھٹا دی

حالی اور سرسید کے آپس میں جو گہرے تعلقات تھے ان پر ہم نے بحث نہیں کی اس لئے کہ انھیں ثابت کرنا مشکل ہے البتہ قیاس کیا جا سکتا ہے حالی کے دلمیں سرسید کی محبت اور عقیدت اس قدر گھل مل گئی تھی کہ اسے الگ کر کے دیکھنا مشکل ہے یہ نوجوانی کی ہیرو ورشپ نہ تھی بلکہ پختہ عمر کی محبت تھی جس کی پائیداری اور خلوص مستند ہوتا ہے

سرسید کو بھی حالی سے کم محبت نہ تھی اور وہ عمر میں سرسید سے بہت چھوٹے تھے مگر سرسید ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ حالی اکثر علی گڈھ جاتے اور کبھی کبھی مہینوں رہتے تھے قیام کبھی سرسید کے یہاں ہوتا تھا اور کبھی سید زین العابدین کے یہاں اس طرح ان دونوں کو ایک دوسرے سے بڑا قرب حاصل ہو گیا تھا۔ سرسید شملہ گئے ہوئے تھے حالی نے بھی آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سرسید کا جواب دیکھیے۔ ایک ایک لفظ سے ایسی محبت ٹپکتی ہے "شملہ میں میرے لئے اس سے بڑھ کر کونسی نعمت ہو سکتی ہے کہ چند روز آپ کی صحبت رہے۔ میرا رمضان سچ مچ عید ہو جاویگا آپ بلا تامل تشریف لائیں۔ مکان، دل، آنکھیں سب حاضر ہیں"

سرسید کے دل میں حالی کی جو وقعت تھی اس کا اندازہ ان کے چند جملوں سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے علی گڈھ کے کسی جلسہ میں کہے تھے ..... "ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے اور فخر کرنا چاہیے کہ ہماری قوم میں ایک ایسا شخص پیدا ہوا آئندہ زمانہ میں کہا جائے کہ فخر قوم، فخر شعراء فخر علماء اور زندہ کرنے والا اور راہ بتانے والا اندرونی جذبات کا اور نجات دلانے والا قوم کا کون ہے تو کہا جاوے گا کہ حالی ....."

ایسے دوست اور رہنما کی وفات کا جو صدمہ بھی حالی کو نہ ہوا ہو تھوڑا ہے۔ حیات جاوید ان کی محبت وعقیدت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ہے لیکن شاعر کے دل کو جب ٹھیس لگتی ہے تو اس کا اصلی اظہار

ان شعروں میں ہوتا ہے جو ایسے موقعہ پر اس کا دل چیر کر نکل آتے ہیں
انھوں نے سرسید کی وفات پر جو فارسی مرثیہ کہا ہے وہ ان کے فارسی
کلام میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جس طرح اردو میں غالب کا مرثیہ
ان کا شہ پارہ ہے اسی طرح فارسی میں اس کا جواب نہیں۔

"ماخوذ از علی گڈھ میگزین علی گڈھ نمبر"

ڈاکٹر سید شاہ علی

حالی اور شبلی

باقاعدہ سوانح نگاری کا آغاز حالی سے ہوتا ہے ان کے بعد شبلی کا نمبر آتا ہے۔ یہ دو مصنف اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود اردو سوانح نگاری کے امام اور ان کی سوانحی تصانیف اردو ادب کا ایک وقیع حصہ، اور دوسری زبانوں کے ادب کے مقابل اردو ادب کی سربلندی کا باعث ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ خالص سوانح عمری کے معیار پر کہاں تک پوری اترتی ہیں۔ جہاں تک اردو ادب کا تعلق ہے یہ نقوش اولین کی حیثیت رکھنے کے علاوہ، اس کی صنف سوانح نگاری کا بھی اولین اور بہترین سرمایہ ہیں۔

حالی کو شبلی پر سبقت نہ صرف زمانے کے لحاظ سے، بلکہ ان کی تصانیف کے اعلیٰ معیار کی بنا پر بھی ہے، جس کا اعتراف شبلی کے ایک عزیز ترین اور وفادار دوست مہدی حسن کو بھی ہے جس کا ذکر (۱) آگے آئے گا۔ حالی کو یہ بھی شرف حاصل ہے کہ انھوں نے

(۱) افادات مہدی مطبوعہ ابراہیم پریس حیدرآباد ص ۳۲۷ تا ۳۲۹

نہ صرف سوانح عمری، بلکہ مختصر سی (طبعی رنگ کی وجہ سے) اپنی آپ بیتی لکھ کر خود نوشت سوانح عمری کی بھی بنیاد رکھی جس کی شرر، پریم چند عسکری وغیرہ نے تقلید کی۔ ایک اور اہم وجہ اس برتری کی جس پر بادی النظر میں غور نہیں کیا جاتا، یہ بھی ہے کہ حالیؔ کی جملہ تین سوانح عمریوں میں سے دو اپنی ہم عصر، اور عزیز ترین شخصیتوں سے وابستہ ہیں لیکن شبلیؔ کی تمام سوانح عمریاں زمانہ ماقبل کے افراد کی ہیں جن سے متعلق معلومات ذاتی تعلق و تجربے پر مبنی نہیں بلکہ دستیاب تحریری مواد تک محدود ہیں۔ ایک ہم عصر اور آشنا شخص ہی کسی کی کامیاب سوانح عمری لکھنے کا حق ادا کرسکتا ہے۔ گو اس میں مشکلات بھی زیادہ ہیں۔ لیکن یہی سوانح نگاری دراصل سوانح نگاری کہلانے کی مستحق ہے۔ وافر مواد کی موجودگی بھی ایک اجنبی مصنف کو اپنے موضوع کی شخصیت میں وہ درک اور بصیرت بہم نہیں پہنچاتی جو شخصیت کے مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے، چہ جائیکہ صدیوں بعد لکھی ہوئی سوانح عمریاں، جن کا مواد ایشیائی قیود، پابندیوں اور حد بندیوں کی چھلنی سے چھن کر نکلا ہے۔ قدیم وضع مشرقی تصانیف سے جدید مغربی انداز کی سوانح عمریوں کی تالیف مشکل چیز ہے۔ نہ یہاں روزنامچے موجود، نہ نجی خطوط مہیا، نہ دوست احباب کی ذاتی معلومات اور رائے، نہ کوئی اور ذاتی تحریرات و دستاویزات۔ علاوہ بریں 'شبلیؔ' کے موضوع زیادہ تر ایک وسیع اہمیت کے مالک ہیں۔ اور شبلیؔ کا ان سے تعلق ایک مذہبی جوش اور جذبے کا نتیجہ ہے، جو سوانح نگاری کیلئے

موضوع سمجھا جاتا ہے، جس کی شہادت ان کی دیگر تصانیف سے بھی ملتی ہے، گو اصلاح کی ضرورت کے نقطۂ نظر سے اسے کچھ زیادہ قابل اعتراض نہ سمجھا جائے۔ ایک اور خوش قسمتی 'حالی' کی یہ ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے موضوع کی موت بھی واقع ہوئی جس کے بغیر انسانی حیات ادھوری اور اس سے متعلق رائے غیر متوازن سمجھی جاتی (۱) ہے۔ بہر حال 'حالی' کو 'شبلی' کے مقابلے میں یہ تمام فائدے حاصل تھے۔

لیکن 'شبلی' نے 'حالی' پر چند سخت اعتراض کئے ہیں بحیثیت ایک پیش رو کے 'حالی' کے 'شبلی' پر اثرات اور الٹے 'شبلی' کے حالی پر اعتراضات وغیرہ پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک سرسری سا جائزہ ان حالات کا لیا جائے جن کے تحت 'حالی' اور پھر 'شبلی' نے میدان سوانح نگاری میں قدم رکھا۔

سوانح نگاری کے آغاز کی بحث میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ سوائے صوفیائے کرام کے ملفوظات کے، دکھنی ادب کی نیم سوانحی اور نیم افسانوی یا سیاسی و مذہبی مثنویوں، شاعروں کے بے سرو پا تذکروں اور ایک آدھ نام نہاد تالیف یا ترجمے کے اردو سوانح نگاری بلکہ اردو ادب کی کائنات میں بھی شاید ہی کچھ تھا۔ یوں تو اردو کی ہر صنف ادب سر سید کے زیر قیادت مغربی ادب سے متاثر ہوئی ہے، لیکن بعض اصناف مثلاً مضمون نگاری

---

(۱) مولانا حالی کی تصانیف میں انکے استاد مولانا عبدالرحمٰن کی سوانح عمری بھی گنائی جاسکتی ہے

سوانح نگاری، تاریخ وغیرہ کے متعلق یہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ خاص طور پر اس کی مرہون منت ہیں۔ "حالی کی حیات' سعدی کے دیباچے سے بھی کچھ اشارات اس باب کے آغاز میں نقل کئے جاچکے ہیں، جن سے صاف ظاہر ہے کہ حالی کے مدنظر مشرقی نہیں مغربی انداز سوانح نگاری تھا، کیونکہ عربی فارسی میں کسی اہل کمال کی کوئی مستقل سوانح عمری مشکل سے ملتی تھی۔ اسکے علاوہ اگرچہ مولانا 'حالی' نے یہودیوں، یونانیوں، رومیوں اور عیسائیوں کی سوانح عمریوں اور پلوٹارک اور سترھویں صدی میں انگریزی سوانح نگاری کی خاص ترقی کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کی تان جس پر ٹوٹتی ہے وہ وکٹوریائی عہد کی "حیات اور زمانہ" اور "حیات اور تصانیف" کی طرز کی ضخیم کئی جلدوں کی سوانح عمریاں ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں حال (۲) کی بیوگرافی میں اکثر مورخانہ تدقیق کی جاتی ہے اور واقعات سے منطقی طور پر نتائج استخراج کئے جاتے ہیں۔ اسکے مصنف کے کلام پر خوض کیا جاتا ہے۔ اور اس کے عیب اور خوبیاں صاف طور پر ظاہر کی جاتی ہیں۔ "اکثر ایک شخص کی لائف کئی ضخیم جلدوں میں لکھی جاتی ہے" 'حالی' سے (جن کی معلومات تراجم اور سنی سنائی باتوں تک محدود تھیں) یہ توقع کرنا کہ وہ پلوٹارک' باسول، اور لاک ہارٹ کے شاہ کاروں کے مطالعے سے اپنے لیے شاہ راہ عمل معین کرتے، بے جا ہے۔ علاوہ بریں ہر عہد کے لوگوں کی طرح ان کا جدید ترین انگریزی رجحانات سے متاثر ہونا بھی فطری ہے خصوصاً جبکہ سر سید اور ان کا پورا حلقہ مغربی تہذیب و ترقی پر ایمان بالغیب لا چکا تھا اور اس سے اس قدر مرعوب تھا کہ بات بات پر اس کا کلمہ پڑھتا تھا

(۲) حیات سعدی "دیباچہ"

ان جدید ترین رجحانات پر تنقیدی نظر کا خیال (بغیر کسی اپنے ذہنی سرمائے کے) ایک خیال خام ہوتا۔ شبلی کی اس طرح کی خفیف سی باغیانہ کوشش میں لغزشیں ہماری رائے کو اور تقویت بخشتی ہیں۔ جب خود انگلستان میں یہ طریقہ وکٹوریائی عہد کی طرح نصف صدی سے زیادہ بہار پر تھا، اور یہ صرف بیسویں صدی کے اوائل میں تھا، جو نقاد اسے اپنی تنقید اور تجزیے کے تحت لا سکے، تو بیچارے 'حالی' اور 'شبلی' سے ہم کس طرح اس کے برعکس توقع قائم کر سکتے تھے۔ جب ہم اس طریقے کا جائزہ لے چکیں گے تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ یہ 'حالی' کا ذوق سلیم اور ان کی سلامت روی تھی جو وہ پوری طرح اس رو میں نہیں بہہ گئے اور کچھ نہ کچھ سوانحی دلچسپی برقرار رکھی لیکن زیادہ تر انداز وہی رہا۔ یہ اردو ادب کی بد قسمتی تھی کہ اردو کے بہترین ادیبوں کو تقلید کے لئے سوانح نگاری کے بہترین نمونے نہ مل سکے اور ان کے زمانے میں اس سوانحی طریقہ کو عروج و اقتدار حاصل تھا جسے فن تنقید نے بعد میں مذموم قرار دیا۔

انیسویں صدی کے وکٹوریائی سوانح نگار اپنے موضوعات پر سچائی کی بجائے عزت و تعت کی چادر اوڑھانے کے قائل تھے۔ یہ طریقہ باسول کے سوانحی جذبے کے برخلاف تھا جو کسی مرقع کی کامیابی کے لئے روشنی اور سائے دونوں کے امتزاج کو ضروری سمجھتا تھا اور اپنے پیرومرشد جانسن کی بوالعجبیوں عجیب و غریب نظریوں، بے ہنگم اور بے ڈھب عادتوں اور دیگر لغزشوں کا بھی اسی جوش و خروش سے ذکر کرتا تھا جیسے اس کی خوبیوں کا۔ وکٹوریائی

عہد کے سوانح نگاروں نے اس کی تقلید صرف اس حد تک کی، کہ مختلف دستاویزات، اصلاحات اور مرقع جات کو بے ہنگم طور پر یکجا کر دیا"۔ انکے اس عزت کے ڈھونگ نے حقیقی سوانح نگاری کے (۱) سوتے خشک کر دیئے مسٹر اسٹراچی (Strachey) اپنی ایک تصنیف کے پیش لفظ (۲) میں جسے جدید سوانح نگاری کا مینی فیسٹو (Manifesto) مانا گیا ہے وکٹوریائی عہد کی سوانح عمریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ ان دو ضخیم جلدوں کو جن سے مردوں کی یادگار منانا ہمارا دستور ہے، اور ان کے بے ہنگم مواد کے ڈھیر، بھدے طرز ادا، ناگوار انداز مداح، انتخاب، ترتیب اور بے تکلفی کے افسوس ناک فقدان کو کون نہیں جانتا۔ ان سے ہم ایسے ہی آشنا ہیں، جیسے ان کے مرتب کرنے والوں کے ماتمی جلوس سے جس کی بے کیف وحشیانہ اور مردنی سی چھائی ہوئی فضا کا عکس، ان کی تصانیف سے بھی جھلکتا ہے (۱) بترل لکھتا ہے، میں کبھی اس لبی تلی اور ہموار سوانح عمری کا بغیر کرب و اضطراب کے احساس کے خیال ہی نہیں کر سکتا۔ ان میں سے ہر ایک میں آپ کو پیدائش، ولدیت، اسکول کے دن، یونیورسٹی کی ابتدائی جد و جہد، پیشے کے انتخاب، شادی، غیر ملکی سفر کے وہی عامیانہ اور آشنا عنوانات ملیں گے، حتیٰ کہ آپ کی تھکی ہوئی نگاہ ایک نامناسب

---

(۱) Essay on Ecelasiastical Biography 3rd Edition P. 267

(۲) Eminent Victorians By Lytton Strachey. Preface

(۳) Eminent Victorian - Preface

خوشی کے ساتھ، بیماری، موت اور خصائل کے ویسے ہی آشنا الفاظ پر جا رکے گی۔ یہ وکٹوریائی عہد کی سوانح عمریاں ایک دوسرے سے حیرت خیز مشابہت رکھتی تھیں، گویا ان کے عنوانات، الجبرائی طرزِ اظہار اور نشانات ا، ب، ج، z، y، x، وغیرہ کے نمونے تھے (ملکہ وکٹوریہ کی زیرِ نگرانی لکھی ہوئی "The Life of Prince Consort" اس کی ایک زندہ مثال ہے بدلتے ہوئے انسانی کردار اور حیات کے لامحدود تنوع اور نشیب و فراز کو انھوں نے ردّی اور بھورے کاغذ کے پیرہن میں قید کر دیا تھا۔ عہدِ وکٹوریہ کے سنجیدہ لوگ سچائی سے متنفر تھے (۲) سیر اچی، فورڈ (Froude) کی حیات کارلائل پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے" وکٹوریائی پبلک ایسی ہیرو پرستی کو نہیں سمجھ سکتی تھی جو ہیرو کی خامیوں کی پردہ دری کرے اور اس سادہ حقیقت سے منکر تھی کہ فورڈ کا جذبۂ پرستش اس کامل نوعیت کا تھا کہ وہ اپنی شبیہ کی ایک ہلکی سی لکیر کی نظر اندازی کے تصور سے بھی گھبرا اٹھتا تھا (۳)" وکٹوریائی سوانح نگری کا لب و لہجہ بے حد سنجیدہ، خشک اور بے رونق، شکل میکانکی اور سخت اسلوب غیر ضروری طوالت اور صراحت کا حامل تھا، جو اصول سوانح نگاری کے خلاف تھا۔ انیسویں صدی کی سوانح عمریوں میں خالی تاریخی مواد کی بھرمار ہے۔ وہ یا تو معاصری تذکرے ہیں یا ضخیم سیاسی اشتہار (پمفلٹ)، یہ رجحان ان کے عنوان "حیات اور زمانے" سے بھی واضح ہے

(۱) Norfobister Blota Byaugusiine Be 'l P. N. 12
(۲) Pothany - Miniature P. 192, 199.

زمانے کے کسی بھی مناسب بیان میں فرد کی اہمیت کا فراموش ہو جانا لازمی ہے ان ہی کے متعلق گاس (Gosse) نے کہا تھا کہ یہ تاریخ سے تعلق رکھتی ہیں نہ سوانح نگاری سے۔ (Massen) میسن کی حیات ملٹن اور بہت حد تک مورلے کی حیات گلیڈسٹون بھی اس کے نمونے ہیں۔ تعلیمی مقصد سے مطابع لاتعداد دستی سوانح عمریاں شائع کرتے رہتے تھے اور عوام کے دوست رشتہ دار اس کی وفات کے کچھ ہی عرصے بعد یا حیات میں ہی فخر وعجب یا انس کے جذبے سے متاثر ہو کے، اس کی یادداشتیں یا یادگاری مجموعے شائع کر دیتے تھے۔ اگو شہرت عام اور بقائے دوام کا اسے کوئی حق پہنچتا ہو یا نہ ہو، یہ کافی ہوتا تھا کہ وہ اس کے معاصرین کی نظر میں ایک عارضی جگہ کا مستحق ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ سوانح نگاری ہمیشہ سے اپنے زمانے کی روح کی ترجمانی کرتی رہی ہے، اور اس معاملے میں کوئی صنف ادب اس سے زیادہ حساس نہیں رہی ہے یعنی کسی اور صنف ادب پر قاری کی ضرورت واقتضا نے اتنا نمایاں اور فوری اثر نہیں ڈالا ہے۔ چنانچہ سوانح نگاری کی ایجاد انسان کی یادگار جبلت کی تسکین کے لیئے ہوئی تھی۔ اس خواہش کے تحت خاندانوں نے کتبے، نوحے اور مرثیے، قبائل نے رزمیہ داستانیں اور کارنامے اور مذاہب نے تذکرۃ الانبیا و اولیا لکھوائے۔ موخر الذکر نے اس میں اخلاقی اور فرقہ جاتی مقصد شامل کر لیا۔ فن سوانح نگاری کے مدت دراز تک ایک آزاد فن تسلیم نہ کئے جانے کی وجہ سے اس میں متواتر نشیب و فراز پیدا ہوئے

اُن کا باعث انسانی شخصیت میں عوامی دلچسپی اور نفسیات کا ذوق تھا
اور یہ بھی مذہبیت کی پیداوار تھا۔ ان عہدوں میں جب کہ قاری خدا اور
حیات بعد ممات پر یقین رکھتا ہے۔ اس مرکزی دلچسپی ابدی حقایق سے
ہے نہ کہ دنیاوی حقایق سے۔ ایسی حالت میں سوانح نگاری قیاسی، اخلاقی
موعظتی یا صرف سطحی بن کے رہ جاتی ہے۔ غور و فکر، شک اور عدم یقین
کے دور میں انسانی اطوار سے دلچسپی ہوتی ہے اور سوانح نگاری استقرائی
تنقیدی، بے لاگ اور واقعیت پسند بن جاتی ہے۔ اگر سوانح نگاری
قابل شناخت طور پر آزاد اور دوسرے اصناف ادب سے الگ ہوتی
تو عوامی مذاق سے آزاد ہوتی اور جاندار بھی، لیکن وہ اب تک دوسرے
مفادات مثلاً تاریخ، افسانہ اور سائنس میں گھری ہوئی ہے۔ انیسویں
صدی میں تو دنیا بھر میں مذہب پر سائنس کے حملوں نے لوگوں کے
ذہن میں انتشار پیدا کر دیا تھا۔ لوگ کچھ مدت تک چوکڑی بھول گئے
تھے اور وضاحت اور خود اعتمادی کی بجائے حالات کے از سر نو جائزے
کی ضرورت محسوس کر رہے تھے لیکن روشنی نظر آنے تک ان کے خیالات و
تصورات کا تتر بتر رہنا فطری تھا اور رجعت پسندی بھی بار بار مختلف طریقوں
سے اپنا سر اٹھاتی تھی ہر نئی اہم تحریک، تخریب اور تعمیر کی قوتوں کو
بروئے کار لاتی ہے۔ چنانچہ سوانح نگاری کے صحیح تصور کے دوبارہ قائم ہونے
سے پہلے، فن سوانح نگاری کو بھی اسی انتشار کے عالم سے گذرنا پڑا
انیسویں صدی کے سوانح نگار اپنے فرض کے تصورات کے ناقابل

ہو گئے اور انھوں نے مذکورہ بالا تمام سوانحی مقاصد کو ملا جلا دیا تھا۔ جن کے جدھر سینگ سمائے چل کھڑے ہوئے بعض نے جن کی آنکھیں یادگار رہی جذبے سے چندھیا دی تھیں مرثیے، اعتذار نامے اور دلکش داستانیں مرتب کیں۔ بعض نے مذہب کے زیر اثر سچے مرقعوں کی بجائے اخلاقی نمونے پیش کئے جو تاریخ کی طرف مائل ہوئے انھوں نے "حیات اور زمانہ" کا طریقہ اپنایا۔ جنھیں افسانوں نے للچایا انھوں نے تخیلی تصانیف لکھیں

حالی اور شبلی کی تصانیف میں وہ تنوع نہیں اور ان کے موضوع اس اعتراض کی زد میں نہیں آتے ان کا سوانحی مواد اور بیان اس سے بچ نہیں سکتا۔ چنانچہ حالی اور شبلی دونوں کے ہاں اخلاقی عنصر پایا جاتا ہے دونوں کی تصانیف حیات اور زمانے اور حیات اور تصانیف کے طریقوں کا نمونہ ہیں۔ دونوں ایک ہی وادی کے مسافر اور ایک ہی کشتی کے سوار ہیں شبلی نے اس میں سوا اس کے کوئی جدت نہیں پیدا کی کہ کارلائل کی طرز پر تاریخی رجحان کو شامل کر لیا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ممکن ہے کہ ان دونوں کو انگریزی زبان اور اردو ادب سے نامکمل واقفیت ہی ان کی بے راہ روی کے آڑے آئی ہو اور انھیں ع "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کے برعکس اس غیر مرغوب بہاؤ میں پوری طرح بہ جانے سے روکا ہو۔ چنانچہ (باوجود ان کی دو حصوں میں تقسیم کے) حیات سعدی اور یادگار غالب کا ہلکا پھلکا اور دلکش انداز بیان اپنی مثال آپ ہے۔ حیات جاوید ضخامت کیوجہ سے

انیسویں صدی کے بعض مصائب و نقائص کو جھلکاتی ہے مثلاً غیر ضروری تصریح وطوالت تشنۂ ترتیب مواد ، بندھے بندھائے عنوان وغیرہ۔ اور حالی کو موورلے سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت میں انیسویں صدی کے نپے تلے فارمولا کا حیات جاوید پر اتنا زیادہ اثر نہیں ہے جتنا ہو سکتا تھا بلکہ بہت سے نکات میں ، ممکن ہے یہ ان کے ذوق سلیم کی وجہ سے ہو ، اس بہترین انگریزی سوانح نگار باسول کے اثرات کی جھلک بھی اس میں اسی طرح نمایاں ہے جس طرح شبلی کے یہاں کارلائل کی باسول کے مقابل اگر کوئی سوانح نگار اردو کی طرف سے پیش کیا جا سکتا ہے تو وہ حالی اور صرف حالی ہیں اور حیات جانسن کی ٹکر کی کوئی اُردو سوانح عمری اردو میں موجود ہو تو وہ حیات جاوید ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ کچھ حد تک باسول اور حالی دونوں سوانح نگاروں اور ان کے ہیروؤں جانسن اور سر سید کی شخصیتوں اور ان کے مماثل تعلقات ہوں۔ بہر حال باسول اور حالی کا سرسری مقابلہ بعض دلچسپ نکات پیش کرتا ہے۔

یعنی اس سلسلے میں سب سے پہلی مشابہت جو ہم کو باسول اور حالی کی زندگی نظر آئی ہے وہ یہ کہ دونوں کا تعارف اپنے موضوعات جانسن اور سر سید سے ان کے اواخر زندگی میں ہوا۔ دونوں اپنے موضوعات کے خاص دوست اور چیلے تھے۔ دونوں کے موضوع ان سے عمر اور عظمت میں بڑے تھے۔ دونوں اپنی اپنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی پریشانیوں میں مبتلا ہونے کے باوجود حیات انسانی سے حد درجہ دلچسپی رکھتے تھے دونوں کا

حافظ اور مشاہدہ تیز اور قوی تھا۔ ایک سوانح نگار کے لئے یہ بڑے ضروری اوصاف ہیں۔ دونوں خود پسندی سے عاری اور سادہ مزاج تھے چنانچہ باوجود اپنے اپنے موضوعات سے گہرے تعلقات کے دونوں نے خود کو پس منظر میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ باسول نے پھر بھی فن کاری کے ساتھ کچھ حد تک اپنے جانسن کے تعلقات کی جھلک قاری کو دکھائی ہے لیکن حالی کا غیر ضروری حجاب تو ہمیں قابل اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ دونوں نے کو بہت ہی غیر معمولی دل و دماغ نہیں پایا تھا، یا جواہر قابل میں نہیں شمار ہوتے تھے مگر دونوں بے حد محنتی اور صبر و سکون کے مالک تھے چنانچہ دونوں نے تقریباً اسی قدر مدت ان سوانح عمریوں کی تیاری یا تصنیف میں صرف کی ہے اور دونوں تصانیف کی ضخامت بھی تقریباً ایک سی ہے۔ دونوں رواں اور عمدہ نثر لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے (گو باسول حالی کی طرح مسلم ادیب نہ تھا اور حیات جانسن اور پیر رڈس جنرل (A jouinle of the Hebridse) کے سوا اس کی کوئی تصنیف قابل ذکر نہیں ہے) دونوں سے پہلے خطوط، دستاویزات، لطائف وظرائف گفتگو وغیرہ کا استعمال اپنی اپنی زبانوں میں رواج پا چکا تھا، لیکن دونوں کی خوبی یہی ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ ان سب طریقوں کے امتزاج سے کام لے کر اپنے موضوعات کی شخصیتوں کے بہترین مرقعے چھوڑے، گو حالی کے یہاں ذاتی حالات و جزئیات کی وہ فراوانی نہیں پائی جاتی ہے جو باسول کے یہاں ہے مثلاً جانسن کی بھوری پاپوش، اس کے بے قاعدہ تکمے، اس کی گرد آلود ٹوپی، اس کے

ناخن تراشنے کا طریقہ، اس کی چائے دانی اور بلی، سنتروں کے چھلکوں کا اکٹھا کرنا، بے طور کھانا وغیرہ۔ لیکن سرسید کے ابتدائی حالات (تعلیم تربیت وغیرہ) میں چھوٹی چھوٹی جزئیات وحکایات سے، ان کے بچپن اور ماحول کی تصویرکشی اور ان کی تصنیف و تالیف، طرز تحریر، تقریر، اور ریفارمیشن وغیرہ کے بیانات میں، حالی نے کافی دلچسپی پیدا کر دی ہے اور مجموعی طور پر بقول ڈاکٹر عبداللہ "گویا حیات جاوید کے اوراق میں ہمیں سرسید اپنی عظیم و جسیم بزرگانہ شخصیت سمیت ـــــ کبھی چھینکوں پر لٹکتے اور کبھی بحث میں الجھتے نظر آتے ہیں" (۱) اگر اس کے باوجود شیخ چاند مرحوم کے الفاظ میں (۲) حیات جاوید کو "وہ شہرت اور مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو اس کے ہیرو اور مصنف دونوں کے شایان ہے" تو اس میں دونوں کے مصلح و ناصح ہونے کو بھی دخل ہے۔

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ باوجود مواد کی بے انتہا فراوانی کے باسول نے اپنی کتاب کو باب فصل یا حصوں میں تقسیم کئے بغیر بھی حیات جانسن کے مختلف آبدار موتیوں کو کامیابی کے ساتھ ایک لڑی میں پرو دیا ہے اس کے علاوہ اس میں خود اعتمادی ہے اور اس نے شعوری طور پر اپنے فن اور ڈرامائیت سے کام لے کر حیات جانسن کو ڈھلا دیا ہے اور اسے خود اسکی تصنیف کے بہترین ہونے کا احساس ہے۔ حالی صاحب یہاں رہ گئے ہیں

---

(۱) مولانا حالی کی کتب سوانح" اورینٹل کالج میگزین دسمبر ۱۹۳۷ سے فروری ۱۹۳۸ تک

(۲) رسالہ اردو جون ۱۹۳۵ ص ۳۰۳۔۳۴۷۔

ان کے ہاں ان چیزوں کی کمی ہے اور انیسویں صدی کے طریقوں کے مدنظر انھوں نے اپنی تصنیف کو دو حصوں میں تقسیم کر کے حیات، کارناموں اور ان پر تبصرے کے علاوہ اس زمانے کے حالات مذہب، معاشرت و سیاست، سوسائٹی، ماحول، معاصرین خیالات، ورجحانات وغیرہ پر حاوی اور جامع بحث کی ہے جس کی کئی باتوں کا اس قسم کی تقسیم کی وجہ سے بار بار اعادہ بھی ہوا ہے۔ حالی کو کچھ تو جملہ سوانحی مواد کو سمیٹنے میں اپنی ناکامی کا احساس ہے اور کچھ یہ ان کا طبعی انکسار ہے۔ خود تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اپنی کمزوریوں اور لغزشوں اور اس سلسلے میں کسی کی مدد حاصل نہ ہو سکنے کی وجہ سے اس عجیب و غریب شخص کی بیوگرافی لکھنے کا حق ادا نہ کر سکے ہیں اور یہ امید کرتے ہیں کہ اس داغ بیل پر اور لوگ عمارتیں اٹھائیں گے۔ ہم دیکھتے رہے ہیں کہ یہ امید یادگار غالب کی طرح اس کے بارے میں بھی کبھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ یادگار غالب کی طرح اس میں جملہ لطائف وظرائف کو قلمبند نہ کر سکنے، تصانیف کے اقتباسات، جگہ جگہ موعظت سے کام لینے وغیرہ کی طرف حیات جاوید پر تبصرے کے دوران میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ البتہ ان کی ایک حد تک ضروری خاندانی اور موروثی و اکتسابی خصوصیات کا مختصر بیان باسول سے جدید تر اور قابلِ تعریف چیز ہے۔

بہر حال حالی نے اپنی سلامت روی کو بہت حد تک اپنی تصانیف میں بھی برقرار رکھا ہے۔ اور باوجود چند تشکیلی خامیوں کے جو غلط تقلید کا

نتیجہ تھیں۔ سوانح نگاری کی اصل روح کو زیادہ صدمہ نہیں پہونچا یا ہے کیونکہ (اپنے انکسار اور زمانے کے انداز کے بدنظر انھوں نے ہزار اعتذار

اب ہم شبلی کی طرف توجہ کریں گے۔ شبلی کے ہاں بھی تقریباً وہ تمام اثرات پائے جاتے ہیں جو حالی کے یہاں ہیں یعنی وہی دو حصوں میں تقسیم وہی حیات سے کارناموں پر زیادہ تفصیلی بحث، وہ تشریحی اور توضیحی انداز بیان۔ البتہ وہ کارلائل سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ڈاکٹر عبداللہ کے شبلی کے اپنے شاگردوں کے ذریعے انگریزی ادب سے استفادے (۱) مصر میں کارلائل کی ہیرو اور ہیرو شپ کے ترجمے کے مطالعے کے بیان میں قیاس کو دخل ہو۔ لیکن ہمیں اس سے بھی اتفاق نہیں کہ وہ بالکل مغربی خیالات اور کارلائل سے متاثر نہیں ہوئے (۲) حالی کی طرح شبلی نے بھی جگہ جگہ اپنے سوانحی شعور کا مظاہرہ کیا ہے جس سے ان کا کارلائل سے متاثر ہونا صاف نظر آتا ہے چنانچہ المامون کی تمہید میں ان کا اسلامی تاریخ کی تصنیف کے ارادے کا "رائل ہیروز آف اسلام" کے سلسلے میں (تاریخ اور لائف کے امتزاج کے) مبدل ہونے کا ذکر آچکا ہے جو کارلائل کے اس نظریئے کا کہ "کسی ملک کی تاریخ اس کے مشاہیر کی تاریخ ہے" (یا تاریخ عالم مشاہیر عالم کی تاریخ کا نام ہے) کی ترجمانی کرتا ہے۔ اسی طرح شبلی نے الفاروق کے دیباچے میں تاریخ کی تعریف

۱۔ مکتوبات حالی صفحہ ۴۳ خط بنام مولانا عبدالحق
۲۔ شبلی کا نظریہ تاریخ از ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی رسالہ ترقی بنگلور ۱۹۵۷ء

ایک بڑے مصنف کے (جس کا نام نہیں دیا ہے) حوالے سے نقل کیا ہے جو یہ ہے "فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کئے اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا ہے، ان دونوں کے مجموعے کا نام تاریخ ہے" جو در اصل تاریخ پر صادق نہیں آتی۔ سیرت النبی کے دیباچے میں جب کہ ان کے داخلی شعور نے کچھ ترقی کی ہے لکھتے ہیں۔ علوم وفنون کی صنف میں سیرت (بیوگرافی) کا ایک خاص درجہ ہے، ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کے حالات زندگی بھی حقیقت شناسی اور عبرت پذیری کے لئے دلیل راہ ہیں چھوٹے سے چھوٹا انسان بھی کیسی عجیب خواہشیں رکھتا ہے، کیا کیا منصوبے باندھتا ہے: اپنے چھوٹے سے دائرہ عمل میں کس طرح آگے بڑھتا ہے، کیونکر ترقی کے زینوں پر چڑھتا ہے، کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا ہے کیا کیا زحمتیں اٹھاتا ہے، تھک کر بیٹھ جاتا ہے، سستاتا ہے اور پھر آگے بڑھتا ہے۔ غرض سعی وعمل جد وجہد، ہمت وغیرت کی جو عجیب وغریب نیرنگیاں سکندر اعظم کے کارنامۂ زندگی میں موجود ہیں، بعینہٖ یہی منظر ایک غریب مزدور کے عرصۂ حیات میں بھی نظر آتا ہے۔ کارلائل کے مندرجہ ذیل چند اشارات سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ چند سوالات کو بطور ایک سوانح عمری کی کسوٹی کے پیش کرتا ہے۔ لکھتا ہے "کسی (سو) انسان کی مخصوص پوزیشن کے مدنظر، دنیا اور انسانی حیات کا اس کے ذہن پر کیا

Essays On Carlyles Essay

نقش مترتب ہوا؟ خارجی حالات نے اس میں کیا تبدیلی پیدا کی اور اس نے ان پر کیا اثر ڈالا؟ کس سعی و قوت کے ساتھ اس نے ان پر حکومت کی اور کس مقاومت کے ساتھ ان سے ہزیمت اٹھائی۔ الغرض سماج کا اس پر اور اس کا سماج پر کیا اور کس طرح اثر مترتب ہوا؟ ہمیں یقین ہے کہ وہ جو کسی فرد کے متعلق ان سوالات کا جواب دے گا ایک مکمل سوانح عمری کا نام پیش کریگا (۱) کارلائل کا یہ قول پہلے باب کی موضوع کی بحث میں نقل کیا جا چکا ہے "کہ ایک چھوٹے سے چھوٹے انسان کی سچی مرقع کشی اور اسکی زندگی کے سفر کی داستان ایک بڑے سے بڑے انسان کی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔" کارلائل کی حیات سٹرلنگ گویا اس کا نمونہ ہے اور شبلی کا مذکورہ بالا قول کارلائل کے اسی قول کی وضاحت کرتا ہے لیکن شبلی نے اس پر عمل نہیں کیا۔ اس کے علاوہ سوا ایک ہم عصر اور معروف شخص کے کسی گم نام آدمی کے متعلق سوانحی مواد ملنا مشکل ہے لیکن شبلی کی نظر میں شاید ان کی مثالیت اور انتہاپسندی کی وجہ سے کوئی گم نام تو کیا نام ور بھی نہیں جچا۔ اگر کارلائل اور شبلی کا موازنہ کیا جائے تو پتہ چل جائے گا کہ کارلائل میں بھی مثالیت اور انتہاپسندی کی صفات موجود تھیں گو اس نے بھی معاصرین کو اس طرح کم نگاہی سے نہ دیکھا۔ ممکن ہے اسی باعث شبلی اور کارلائل دونوں کی ازدواجی زندگی بھی ان کے حسب خواہش میسر نہ ہو سکی اور ان کو حسب دلخواہ شریک حیات نہ مل سکی۔ یہی خصوصیات شاید دونوں کی ہیرو پرستی کا

---

(۱) مکاتیب شبلی جلد ا، ص ۱۱۱

باعث بھی تھیں۔ تاریخ کے علاوہ سیاست میں بھی دونوں انتہائی نظریہ کے حامل تھے۔ دونوں کی انفرادیت بہت قوی اور نمایاں تھی۔ دونوں بڑے پایے کے ادیب اور مورخ تھے۔ دونوں کی تحریروں میں فلسفیانہ تحقیق و تدقیق، منطقیانہ استدلال اور جوش بیان پایا جاتا ہے۔ دونوں نے غیر ملکی سیر و سفر سے بھی فائدہ اٹھایا تھا۔ قدیم و جدید کا امتزاج ہونیکے علاوہ وہ اپنے آزاد اور مستقل نظریۂ حیات بھی رکھتے تھے۔ شبلی کا بظاہر "ہیروز آف اسلام" کے سلسلے کا نام بھی شاید کارلائل کے ہیرو اینڈ ہیرو ورشپ کے سلسلے کا مرہون منت ہے جس کے عربی ترجمے کے مطالعے کا انھوں نے خود ذکر کیا ہے، جیسے سرسید کا تہذیب الاخلاق ٹیٹلر اور سکٹیٹر کے، اور سجاد حسین کا 'اودھ پنچ لندن پنچ کے نمونے پر تھا۔ کارلائل کی سوانح عمریاں بھی اس کے نظریے پر پوری طرح عمل کرتی ہیں جسے شبلی نے اپنانے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً اس کی حیات 'فریڈرک اعظم' عہد وکٹوریہ میں شخصیت کا احساس پیدا کرنے میں عظیم اثر کا باعث ہونیکے باوجود "حیات اور زمانے" کی طرز کی تصنیف ہے اور ایک فرد کے مطالعے سے زیادہ ایک فرد ہیں، اور اس کے ذریعے تاریخ کے مطالعے کی مثال ہے۔ البتہ دونوں نے اپنے ملکوں میں بین الاقوامی شہرت کے نامورں کی سوانح عمریوں کی تصنیف کی تحریک پیدا کی بلکہ غیر ملکی سوانح نگاری کو روشناس کرکے اس سے دلچسپی پیدا کی۔ جہاں تک غیر ملکی موضوع کا

(۱) مکاتیب شبلی جلد اول صفحہ ۲۱۱۔

تعلق ہے اردو میں حالی، نے حیات سعدی لکھ کر اس کی ابتدا کر دی تھی۔ اپنے موضوع کی نوعیت کی وجہ اُن کو غیر ملکی سوانح نگاری سے استفادے کا اتنا موقع نہیں مل سکا تھا جتنا شبلی کو۔ گو حالی، اور سر سید دونوں اسلاف کے کارناموں کے بیان کے ذریعے نئی پود میں عمل اور ترقی کی تحریک پیدا کرنا چاہتے تھے جو خود بھی مذہبی اور اخلاقی (بغیر سوانحی) جذبے کے زیر اثر تھا۔ لیکن وہ شبلی کی طرح ماضی کے احیائ کے حق میں نہ تھے۔

شبلی کو یہ آسانی تھی کہ ان کے سامنے 'حالی' کی مثال نمونے اور تجربات موجود تھے۔ 'حالی' کی طرح یہ دشواری نہ تھی کہ عربی فارسی اور مغربی سیرتوں، تذکروں اور سوانح عمریوں کے درمیان اپنے لئے صحیح راہِ عمل معین کرنا پڑتی۔ 'حیات سعدی' کا دیباچہ گویا اردو سوانح نگاری کا دستور العمل ہے۔ اس میں مشرقی سیرت نگاری اور اس کی روایت درایت اور مغربی سوانح نگاری اور اس کے طریقوں کے متعلق نہایت عمدہ اشارات ملتے ہیں، جن کو شبلی نے بعد میں وسعت دی ہے۔ شبلی کے یہاں موضوعات کا تنوع بھی 'حالی' سے زیادہ پایا جاتا ہے یعنی 'حالی' کے موضوع صرف ادبی اور سیاسی ہیں اور شبلی کے علمی، ادبی، مذہبی اور تاریخی لیکن۔(۱) باوجود سوانح عمری میں موضوع کے انسانی اور نفسیاتی پہلو کی اہمیت کے احساس کے اپنے مذہبی موضوعوں کے

(۱) سیرت النعمان صفحہ ۹ تا ۹۵۔

تقدس کا اثر ان پر غالب نظر آتا ہے۔ نہ صرف سوانح عمریوں کی شکل اور ہیئت بلکہ اس کے مواد اور بیان کے معاملے میں بھی شبلی' کے ہاں حالی' کے اثرات پائے جاتے ہیں جس طرح شبلی کی مختلف تصانیف مثلاً موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم، بیان خسرو اور دیگر تصانیف کے موضوعات وعنوانات بھی' آزاد' اور حالی' کی تصانیف مثلاً آب حیات، سخندان فارس، مقدمہ شعر و شاعری، اور یادگار غالب، وغیرہ سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کا طرز تحریر بھی' آزاد' کے شگفتہ اور جاندار، اور حالی' کے سنجیدہ مدلل اور واضح پیرایہ بیان کو جھلکاتا ہے۔ انسان پر اس کے ماحول کا عمل اور ردعمل فطری ہے۔ متاخرین کو متقدمین کے تجربے سے استفادے کا بڑا فائدہ حاصل ہے لیکن شبلی کا سب سے بڑا کارنامہ دارالمصنفین کی بنیاد اور مصنفین کے ایک حلقہ اور سلسلے کو چھوڑ جاتا ہے۔

لیکن شبلی نے حالی کے طریقہ سوانح نگاری میں کوئی خاص اور نمایاں جدت یا ترقی نہیں دی اور بجائے اس کے کہ اس نقاش اول کی خدمات کا فراخ دلی سے اعتراف کرکے ان پر سخت اعتراض کئے ہیں۔ شبلی کے ان اعتراضات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ بظاہر یہ حالی کے موضوعات یا مواد سے نہیں بلکہ ان کے طریقۂ بیان سے متعلق ہیں، لیکن نظر غور سے دیکھنے پر پتہ چلے گا کہ دراصل یہ حالی کے موضوع اور ایک خاص موضوع یعنی سر سید سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپنے اس خیال کے ثبوت میں دلائل پیش کرنے سے پہلے بعض نقادوں کے خیالات کا خلاصہ قلم بند کرنا

مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے ہم شبلی کے ایک عزیز ترین دوست اور معتقد۔ لیکن منصف مزاج نقاد مہدی حسن کے ایک بہترین مضمون حالی و شبلی کے معاصرانہ چشمک کے جس میں انھوں نے شبلی کے اعتراضات کا حقائق کی روشنی میں تجزیہ کیا ہے اور جو اس قابل ہے کہ پورے کا پورا نقل کیا جائے صرف اہم نکات نقل کریں گے۔ شبلی نے اپنی تصانیف مثلاً سوانح، مولانا روم، اور موازنہ انیس و دبیر میں اور دوسروں کی تصانیف مثلاً مناقب عمر بن عبدالعزیز اور مآثر رحیمی کے تبصروں میں "اردو کی اعلیٰ سے اعلیٰ سوانح عمریوں" کے الفاظ میں اشارات و کنایات سے اور دوستوں کو خطوط میں صاف صاف حیات جاوید کا نام لے کر اسے بیجا ترجیح، فریب دہی، خیانت اور خداعی، غلامانہ شخص پرستی اور مدلل مداحی کا نمونہ اور کتاب المناقب قرار دیا ہے، کیونکہ ان کی رائے میں مولانا حالی نے اس میں سر سید کی یک رخی تصویر دکھائی ہے اور باوجود دعویٰ تنقید کے اگر کہیں خفیف الفاظ میں کسی عیب کی طرف اشارا کیا بھی ہے، تو اس کا مقصد، اپنی تنقید اور نکتہ چینی کا اظہار کر کے، محاسن کو تقویت دینا ہے۔ شبلی نے اس سلسلے میں مغربی طریقہ سوانح نگاری کے متعلق بھی متضاد خیالات کا اظہار کیا ہے کہیں تو حالی کے اس خیانت و خداعی کے طریقے کو یورپ سے ماخوذ بتاتے ہیں اور کہیں اس کی وجہ سے موجودہ یورپ کے مذاق اور علمی ترقیوں کی بربادی کا اندیشہ ظاہر کرتے ہیں۔ مہدی نے بجا طور پر یہ سوال کیا ہے کہ یہ طریقہ دراصل حالی کی ایجاد ہے یا شبلی کی تصانیف بھی اس دائرے میں آجاتی ہیں

اس کے علاوہ کیا مغربی زبان کی کسی سوانح عمری میں، مولانا کی توقعات کے مطابق، ایسے مستقل ابواب، جن میں 'دیکے از اقوام جرائم پیشہ' یا 'بابالاشرار' کے عنوان سے کسی شخص کے حفظ غیب کا خاکہ اڑایا گیا ہو، ملتے ہیں؟ خود مولانا شبلی کی تصانیف موازنہ انیس و دبیر، شعرالعجم، حکایات خسرو، المامون، سیرت النعمان، الفاروق، اور الغزالی میں انسانی کمزوریاں کسی حد تک ابھار کر دکھائی گئی ہیں۔ اگر نہیں تو شیش محل میں بیٹھکر اوروں پر پتھر پھینکنا، ایک خوش ادائی سہی کیا دانائی بھی ہے اور کیا یہ علم النفس کی حق تلفی نہیں ہے جو ایک نکتہ سنج مورخ کے قلم سے ہو سکتی ہے۔ بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ حیات جاوید کے لئے حالی کی طرف سے کسی اعتذار (اپالوجی) کی بالکل ضرورت نہیں۔ ایک شریف نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگذشت لکھی اور آشنائے فن ہو کر لکھی اور یہی اونچے سے اونچا معیار تحریر ہے جو ایمان بالغیب کی حیثیت سے یورپ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ یہ قطعی ہے کہ حیات جاوید کا رئیس التذکرہ فرشتہ نہیں تھا، انسان تھا، لیکن اس کے اخلاقی اوصاف، اس کی اضطراری لغزشوں پر، جنھیں انسانی کمزوری سمجھئے غالب تھے یہی مابہ الامتیاز ہے جسکی بنا پر سوانح نگار کسی بڑے سے بڑے شخص کو دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے سرسید کی کمزوریاں جن کی بے نقابی پر شبلی کو اس قدر اصرار ہے اور جن کے اظہار میں حالی نے صرف بے دردی سے کام نہیں لیا، در اصل سرسید کی زندگی کے وہ عناصر ہیں، جن کے بغیر انسانی اخلاق کی تکمیل ناممکن ہے۔

لیکن اس قسم کی اضافی تصریحات کا بے ضرورت پھیلانا اور تفصیلی پہلو کا اس طرح نمایاں کرنا کہ اصلی محسن دب جائیں بالکل ایسا ہی ہوگا جس طرح "ندوہ" کے آخری مناقشات کو شبلی کی ادبی زندگی سے وابستہ کیا جائے جس پر مولانا کا سوانح نگار کبھی راضی نہیں ہوگا اور اسے شبلی کی "علمی نفسیت" سے دراصل کوئی تعلق نہیں ہے۔ شبلی کے دوست حبیب الرحمٰن شیروانی نے بھی ایک سخت ریویو لکھ کر بزعم خود اپنے آہنی قلم سے حیات جاوید کے فاسد مادے کو دور کرنے کی کوشش کی تھی جسے شبلی نے بہت پسند کیا تھا۔ صالحہ عابد حسین (۱) نے لکھا ہے "جہاں تک مدلل مداحی کا سوال ہے حالی کی تمام ادبی زندگی اور سیرت کی داخلی شہادت اس کے خلاف ہے۔ حالی نے علمی دنیا اور عملی زندگی دونوں میں عمر بھر دیانت داری، انصاف پسندی اور صداقت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اس لئے یہ قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے سرسید کے لئے جو کچھ لکھا اسمیں حقیقت کی طرف پوری توجہ نہیں کی"

مولانا عبدالحق لکھتے ہیں (۲) "علامہ موصوف کو کسی نامور شخص کی (بشرطیکہ وہ کسی ہم عصر کو اس قابل سمجھیں) سوانح عمری لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا اور نہ انھیں اس سے زیادہ دشواری پیش آئی جو ہماری زبان میں بہتر سے بہتر سوانح عمری لکھنے والے کو پیش آئی ہے۔ انھوں نے اب تک

(۱) یادگار حالی ص ۲۲۷

(۲) مقدمہ حیات النذیر، مقدمات عبدالحق حصہ اول ص ۱۹۴

انھیں قدر ہائے اکرام کے حالات پر قلم اٹھایا ہے، جنھیں لوگ ایک زمانے سے پوجتے آئے ہیں اور جن کی تنقید و نکتہ چینی کتب کے حوالے تک محدود ہے تاہم (بے ادبی معاف) کیا علامہ موصوف کی تالیفات اس "پر فریب" طریقے سے پاک و صاف ہیں؟ اور اس سوچ میں پڑجاتے ہیں کہ ایک سچا ادیب سچی تہذیب کا نمونہ کیوں نہیں ہے۔

ہماری ناچیز رائے میں شبلی کی یہ تنقید حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک کی مثال ہے نہ حالی کے شریفانہ کردار پر کوئی اعتراض ہے نہ معاصری سوانح عمری کی تصنیف کی دشواریوں سے ناواقفیت کے باعث ہے۔ بلکہ سر سید سے رشک و رقابت اور ہم چشمی بلکہ دعوئے برتری (یعنی حالی سے نہیں سر سید سے چشمک) کا نتیجہ ہے۔ شبلی نے حالی کی حیات سعدی کو ایک دلچسپ، محققانہ اور بے مثل سوانح عمری قرار دیا ہے حالانکہ ان کی ذہانت جلد یا بدیر اس کی محققانہ نوعیت کو تجھ چکی ہوگی۔ چنانچہ سوانح مولانا روم میں انھوں نے خود حالی کے حیات سعدی کے اس طریقے سے احتراز کیا ہے یادگار غالب کو اردو کی ایک بہترین سوانح عمری بتایا ہے اور غالب کی رنگین شخصیت کے صفحۂ قرطاس پر پیش نہ کئے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا حالانکہ حالی نے اپنی پہلی سوانح عمریوں کے ایک طرفہ ہونے کا اعتراف خود حیات جاوید کے دیباچے میں کیا ہے لیکن شبلی نے حیات جاوید پر کم از کم نصف درجن مرتبہ سخت سے سخت الفاظ میں اعتراض کئے ہیں جن کے فضول ہونے کا ثبوت مہدی نے پیش کر دیا ہے۔ محمد حسین آزاد کی

سخندان فارس پر شبلی کی تنقید میں یہ تلخی نہیں ہے اور نہ شبلی کی کسی اور معاصری تصنیف تنقید کا یہ لب ولہجہ ہے۔ لہٰذا اگر ہم سر سید اور شبلی کے تعلقات کا جائزہ لیں تو یہ چیز واضح ہو جائے گی کہ ان کی حیات جاوید پر تنقید کا اصل باعث ان کی سر سید سے کد ہے مہدی لکھتے ہیں "سر سید نے ہمیشہ معاصرین ادب کی حوصلہ افزائی کی ان کی باثر شخصیت خاموش تصرف کے ساتھ دوسروں کی قلب ماہیت کرتی رہتی تھی شبلی نے "مولویت" علی گڈھ پہنچ کر چھوڑی۔ ان کے خیالات کی کایا پلٹ، مذاق تصنیف اور وسیع النظری غرض یہ جو کچھ ہوئے سر سید کے دامن تربیت کا اثر تھا (۱) جسکے ثبوت میں شبلی کے اس خط کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے جس میں انھوں نے سر سید کی اپنے انمول کتب خانے کے استعمال کی عام اجازت اور تاریخ وجغرافیہ کی جرمنی میں طبع شدہ نایاب عربی کتابوں (جن سے مصر کے لوگ اور دیگر مشاہیر محروم تھے) خصوصاً سر سید کے اپنے صرف خاص سے کروائے ہوئے گبن کی تاریخ کے ترجمے سے استفادے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن شبلی نے اپنے مضمون "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" میں ۱۸۸۷ء میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کرنے کو سر سید کے لئے غلطی مان لینے کے باوجود انھیں اعتراضات اور دلائل کو جو سر سید نے پیش کئے تھے، دھرایا ہے اس کے باوجود سر سید نے المامون کی دوسری اشاعت کا جس خلوص سے دیباچہ لکھا وہ ان کی شرافت اور نیک دلی کا پتہ دیتا ہے اور الفاروق کی

(۱) حکایات شبلی حصہ اول ص

تصنیف میں سراج الدین احمد کی شبلی سے سبقت لے جانے کی کوشش کی مذمت، سرسید نے جن الفاظ میں کی وہ ان کی فراخ دلی کا مزید ثبوت ہے (۱) مہدی کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ شبلی کے لئے شمس العلما کے خطاب کی تحریک بھی سرسید نے کی تھی سرسید بقول مہدی علم کلام کی جدید بانیوں میں سے ہیں اور سرسید کی ساری تصانیف ان کی قلم کی آواز بازگشت کی مترادف ہیں شبلی نے الکلام لکھی لیکن سرسید کا نام تک نہ آیا حیات جاوید کے سلسلے میں گو وہ ایک حد تک صحیح ہی کیوں نہ ہوں اعتراضات کا بار بار آخر اعادہ کیا معنی رکھتا ہے؟ اس اصرار سے ہمیں شبلی کی نیت پر شبہ ہوتا ہے۔ مہدی نے بھی اسے محسوس کیا ہے۔ لکھتے ہیں یہ دلچسپ سوال ابھی باقی ہے کہ حالی کے ہیرو کے ساتھ شبلی کو اس قدر "چشمک" کیوں ہے۔ کیا یہ جامع حیثیات شخصیت شبلی کے نامور ان اسلام کا رنگ پھیکا کرنے والی ہے؟ یا جس طرح ایک خوبصورت عورت دوسری پرکالہ آتش کو نہیں دیکھ سکتی دراصل جذبۂ رشک اس کی تہ میں ہے۔ ملک کے ایک بہت بڑے فاضل کی رائے کے مطابق سرسید کے بعد اگر اردو میں کوئی قلم اٹھا سکتا ہے تو وہ حالی ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ حالی نے سرسید کی صرف کثیر الاوراق لائف ہی نہیں لکھ دی بلکہ یہ اردو لٹریچر میں ایسا اضافہ ہے جو حالی کی ذات پر ختم ہو گیا، مہدی سچائی کے قریب پہونچ کر لوٹ گئے ہیں۔ ان کے اس شک کا جواب ہمیں شبلی کے ایک

(۱) حیات شبلی صہ ۳۳۷

اور خاص دوست مولانا شرر (۱) کے شبلی کی وفات پر دلگداز میں مضمون سے مل جائے گا۔ شرر لکھتے ہیں کہ سرسید کی بدولت عوام میں مقبولیت حاصل کرنے کے باوجود شبلی سرسیّد کی فوج کے ایک نامی پہلوان بنے رہنے میں اپنی سبکی محسوس کرنے لگے تھے۔ انھیں خود قیادت کی ہوس تھی اور اسی لئے علی گڈھ سے علیحدگی اختیار کی اور علماء کے سرتاج بن کر سرسیّد سے زیادہ فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ باوجود شرر کے روکنے کے نہ ماننے اور ضد سے سرسیّد کو ان کے قدرشناسوں کی نظر میں گرانے کی سعی کرتے رہے۔ بالاخر ندوے سے انھیں جو انعام ملا وہ ظاہر ہے وغیرہ وغیرہ لیکن شرر کے اس واضح اشارے کو کسی نے زیادہ اہمیت نہ دی کیونکہ سرسید اور شبلی کی شخصیت کا فرق روز روشن کی طرح عیاں تھا مولانا شبلی کو بھی شاید کبھی بالاعلان اس دعوئی کی جسارت نہیں ہوئی۔ مہدی بیچارے بھی جنھوں نے شبلی کی تعریف میں اپنے کئی مضامین رنگین کئے ہیں سوچ میں رہ گئے۔ مولانا آزاد نے اپنے بزرگ دوست کی تنقید پر ایمان لاکر عالم الغیب کے سے اعتماد اور قطعیت کے ساتھ مہر کی۔ غالب کے تبصرے کے سلسلے میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ خواجہ مرحوم سوانح نگاری کو محض مدحت طرازی سمجھتے تھے۔ اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ ناگوار واقعات کو ابھرنے دیا جائے۔ حیات جاوید میں انھوں نے ہر جگہ ایسا ہی کیا ہے ——— اور جس قدر خاک ڈال سکتے تھے ڈال گئے

---

(۲) مضامین شرر، سیر رجال جلد سوم۔

(۱) پروفیسر سرور نے بھی اسے مولانا آزاد کی حسب معمول انتہا پسندی اور قطعیت کا ثبوت قرار دیا (۲) ہے۔ پروفیسر سرور، شرر کے خیال کی صحت کے امکان کو تسلیم کرتے ہوئے بھی شبلی کے سر سید سے اختلاف کو اختلاف دبستان کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اکرام صاحب بھی سر سید کی (۱) طرف سے شبلی کا دل صاف نہ ہونے اور ان کی علی گڈھ تحریک کی مخالفت اعتراف کرتے ہیں۔ لیکن شبلی کے اس راز، رمز اور کنائے کو کسی نے سمجھا تو وہ ان کے شاگرد خاص اور جانشین سلیمان ندوی تھے جنھوں نے ایک طرف تو عبدالرزاق کانپوری کو مولانا شبلی کے متعلق نجی حالات کے بیان کرنے سے روکا اور خود عطیہ بیگم فیضی کے اور ندوے کے معاملات کی تاویل دگر کی کوشش کی اور دوسری طرف حیات شبلی میں شبلی کی نسبی اور خاندانی تفصیلات کو حیات جاوید سے زیادہ تفصیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا (جن کی صداقت کے بارے میں بعض نقادوں کو دیانت دارانہ اختلاف ہے) ندوہ کو علی گڈھ کے مقابل رکھا، شبلی کے کارناموں کو سر سید کے کارناموں سے زیادہ چمکانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ حیات جاوید کی ضخامت کو بھی مات کر دیا۔ سلیمان ندوی کے بقول شبلی کی سر سید کی سوانح عمری لکھنے سے پہلو تہی (صفحہ ۲۸۳ حیات شبلی) اور نذیر احمد کے سوانح نگار افتخار عالم کو اپنی سوانح عمری

---

(۱) مقدمہ خطوط شبلی صہ مقدمات عبدالحق صہ۱۱

(۲) تنقید کیا ہے " سرور۔

لکھنے کی اجازت دینے سے انکار اور ان کے ہاتھوں کو آلودہ بتانا شبلی کے غلط احساس برتری کا ثبوت ہے۔ لیکن ان (خدائی فوجدار) نقادان سخن میں سے جو علم و ادب کی طرف سے حالی پر حرف زن تھے کسی نے ان کے متعلق کچھ نہ کہا۔

آخر اس ہم چشمی اور برابری کے دعوئی اور رشک و رقابت اور چشمک کی جو بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے وجہ کیا تھی؟ مہدی نے لکھا ہے "یہ غور طلب ہے کہ "غالب" کی طرح "شبلی" کی افراط خودداری معاصرانہ کمالات کے اعتراف میں فیاض نہیں" اور ابوالکلام کی مثال پیش کی ہے مولانا عبدالحق شبلی کو "اکل کھرے تنگ مزاج" کے الفاظ سے یاد کرتے ہیں ممکن ہے مولانا شبلی کی ماں باپ کی شفقت و محبت سے محرومی اپنی شخصیت کے متعلق اس غیر متوازن رائے اور طبعی رشک کا باعث ہوئی ہو لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی زندگی میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں مثلاً اپنے بھائی مہدی کی بیرسٹری کا خیال اُن کو بے چین کرتا رہا۔ والد، سوتیلی ماں، لڑکی کسی سے ان کے تعلقات کے سلسلے میں احتجاج، شبلی کے ابوالکلام آزاد سے گلے شکوے مہدی حسن کی دعوت کی منظوری کیلئے بیگم مہدی کے بے پردہ ہونے کی شرط وغیرہ۔ بہر حال وہ عائلی، کے خلوص و محبت کی دولت سے محروم تھے اور ان کی زندگی میں خود پسندی اور خود کا مادہ سرایت کر چکا تھا۔ ممکن ہے ان کی زندگی کی مختلف محرومیاں اور ان کی غیر معمولی ترقی کی خواہش وغیرہ بھی اس کا باعث ہوں۔

شبلی کی سر سید سے ملاقات کے وقت ان کی عمر تقریباً چوبیس سال تھی۔ دل میں ترقی کا جوش اور ولولے تھے۔ سر سید سے ملاقات کے وقت حالی کی عمر شاید چالیس کے قریب تھی۔ حالی ان طوفانوں اور چٹانوں سے جن سے سید نے تن تنہا ٹکر لی تھی اور ان سے اپنے تعلقات کے زمانے میں نہایت جوش اور عقیدت کے ساتھ نہ صرف ان کا مختلف کاموں میں ساتھ دیا تھا بلکہ خلوت وجلوت میں ان کے ساتھ رہے تھے اور ان کو سر سید کو پرکھنے کا خوب موقع ملا تھا۔ ان کے مقاصد، صفات اور نقطۂ نظر کا وہ صحیح طور پر اندازہ لگا سکتے تھے۔ شبلی کے سر سید سے روشناس ہونے تک بہت حد تک یہ طوفان ختم ہو چکا تھا۔ وہ ان تھپیڑوں کا اندازہ نہیں کر سکتے تھے جو مسلمانوں کو غدر اور اس کے بعد کے ایام میں کھانے پڑے تھے۔ مولانا عبدالحق کو اس سے اختلاف ہوا۔ آپ کے مطابق "حالی کی گاہ گاہ ملاقات ہوتی تھی لیکن شبلی برسوں سر سید کے ساتھ رہے" اس لحاظ سے تو دیدہ بینا کا معاملہ جس کا ثبوت ان کی مثنوی سے ملتا ہے۔ وہ اس کسم پرسی بے بسی اور بے چارگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے جس نے سر سید سے لائل محمڈنز آف انڈیا اور اسباب بغاوت ہند کی سی سرد و گرم کتابیں لکھوائیں تھیں۔ مسلمانوں کو سر سید کی کوششوں کی بدولت اپنے برے بھلے کی کچھ تمیز ہو چلی تھی۔ وہ قومی اور تعمیری کاموں کی اہمیت کو محسوس کرنے اور اس میں امداد دینے لگے تھے۔ راہ کُل متعین ہو چکی تھی۔ سر سید اور ان کے حلقے کے افراد (نذیر احمد) کی وسیع النظری، فراخ دلی اور ہمت افزائی نے شبلی کو

شہرت و عزت سے قبل از وقت دوچار کر دیا اور وہ اپنی قیادت کے خواب دیکھنے لگے ۔ اس کے علاوہ علماء شروع ہی سے مغربی تعلیم یافتوں کے مقابل اپنے آپ کو قیادت کا زیادہ مستحق سمجھتے رہے ۔ سر سید اور جناح دونوں کو ان کا مقابلہ کرنا پڑا بلکہ غیر ملکوں مثلاً ترکی افغانستان مصر و ایران وغیرہ کا بھی یہی حال ہے (۱) شبلی سر سید کے دست بازو اور ان کے اکھاڑے کے پہلوان بنے رہنے پر قانع نہ ہو سکے اور ندوہ کے بانیوں کے ساتھ مل کر سر سید کے تجربات سے فائدہ اٹھانے اور ان کے طریقوں پر عمل کر کے اسے ترقی دینے لگے لیکن شاید قدرت کو یہی منظور تھا کہ حیات جاوید کے اس سخت معترض کی حیات میں نجی اور پبلک دونوں طرح کے طوفان آئیں اور بشری کمزوریوں کا احساس دلائیں ۔ سر سید کی عملی صلاحیتوں ، ان کے خلوص ہمدردی اور قومی خدمت کے جذبے سے وہ محروم تھے ۔ ان کا جوش احتجاجی یا عشقیہ نظمیں لکھنے تک محدود تھا جو سرکار کی جبین پر ایک کے ساتھ مسردہو جاتا تھا ۔ ان کو وکالت کے پیشے میں کامیابی نہ ہو سکی تھی ۔ وہ سیاست کیا لڑتے لیکن ان کو اپنی خوبیوں اور خامیوں کا صحیح علم نہ تھا ۔ سر سید کے قوم کے لئے انگلستان سے سفر کے مقابل مشرق وسطیٰ کے سفر سر سید کے تمغے اور خطاب کے مقابل

(۱) ایک مرتبہ [illegible] بدایونی نے کراچی میں دوران تقریر میں کہا تھا اگر انسانی قانون (تعزیرات ہند) کا ماننے والا پاکستان بنا سکتا ہے تو خدائی قانون کا [illegible] والا کیا نہیں کر سکتا ہے ۔

سلطان ترکی کا تمغہ اور اس سفر میں خطبات احمدیہ کی تصنیف کے مقابل الفاروق پیش کر چکے تھے ۔ چنانچہ ان کا اپنے متعلق غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا بعید از قیاس نہ تھا، جس کی سزا انھیں بعد میں بھگتنی پڑی ۔ ان کی اپنی دورنگی زندگی کے باوجود حیات جاوید پر تلخ تنقید اوروں کی حیات شبلی پر تلخ تر تنقید کی شکل میں ظاہر ہوئی اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے وہ شاید اپنے آپ کو سرسید سے زیادہ جامع صفات اور مسلمانان ہند کا رہبر و بننے کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے ۔

چنانچہ ان کی تنقید حیات جاوید یا حالیؔ پر نہیں بلکہ سرسید پر تھی ۔ وہ ان کی عظمت کے دل سے قائل نہ تھے ۔ سرسید کی وفات اور لوگوں کے اصرار پر ان کی ادبی خدمات کا بہت عمدہ تذکرہ کیا تھا جو ممکن ہے ایک شاعرانہ اور اضطراری جذبے کا نتیجہ ہو لیکن اس میں اپنے الگ راستہ نکالنے کا ذکر تھا ۔ اس کے علاوہ اس سے سرسید کا جامع صفات ہونا ثابت نہ ہوتا تھا ۔ حالیؔ اور شبلی کے ذاتی تعلقات اور حالیؔ کی فرشتہ سیرت زندگی کے مدنظر ان سے کیا گلہ ہو سکتی تھی ۔ البتہ بحیثیت سرسید کے سوانح نگار اور بحیثیت "مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" والے مضمون کا حیات جاوید میں جواب لکھنے والے کے اور سرسید کی معمولی تعلیم ، بلکہ ان جسمانی قابلیتوں کو عظمت کیلئے لازمی بتانے والے اور سرسید کے خیالات کی حمایت کرنے والے کے ، وہ بھی اس چشمک کی زد میں آ گئے تھے اور شبلی کی نظر میں چھوٹی امت میں شمار ہوئے تھے ۔

غلام احمد فرقت کاکوروی

حالی اور طنز

شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی مسدس حالی کے دیباچہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"باغ جوانی کی بہار اگرچہ قابل دید تھی مگر دنیا کے فکروں نے دم لینے کی فرصت نہ دی، نہ خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی، نہ وصل کی لذت ملی نہ ہجر کا مزا چکھا۔

پھنسا تھا دام محبت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے"

مذکورہ بالا اعتراف کے بعد مولانا سے کسی قسم کی عشقیہ شاعری کی امید کرنا ان سے جوانی کی رنگ رلیوں اور امنگوں میں ڈوبے ہوئے اشعار کی توقع رکھنا یا ان کے کلام میں وصل و فراق کی معرکہ آرائیاں اور عاشقانہ و معشوقانہ غمزے تلاش کرنا اور ان کی کائنات شاعری میں ظرافت اور

زندہ دلی کو ڈھونڈھنا ریگستان میں زعفران کے کھیت کی تلاش سے کم نہیں
اسی مسدس کے دیباچہ میں موصوف ایک جگہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:۔

"بیس برس کی عمر سے چالیسویں سال تک تیلی کے بیل کی طرح اسی ایک چکر میں پھرتے رہے اور اپنے نزدیک سارا جہاں طے کر چکے، جب آنکھیں کھلیں تو معلوم ہوا کہ جہاں سے چلے تھے وہیں ہیں۔"

ظاہر ہے کہ بیس سے چالیس تک کی عمر ہر انسان کی زندگی میں ہنسنے ہنسانے اور قہقہے لگانے کی عمر ہوتی ہے اس کے بعد وہ بتدریج بجھنا شروع ہو جاتا ہے اور آخر میں نذرِ اجل ہو جاتا ہے جب مولانا اس عمر میں اپنی آنکھ پہ پٹی باندھے ایک گردش میں مبتلا رہے تو پھر مولانا پر خوش طبعی اور زندہ دلی کا الزام عاید کرنا دراصل ان کی ذات گرامی پر ایک بہت بڑی تہمت ہے اور ان کی سنجیدگی اور زہد پر براہ راست ایک کاری ضرب ہے۔ ان خیالات کے پیش نظر مولانا کی شاعری میں جس قدر لطافت بھی ہم کو ملتی ہے وہ تمام تر مولویانہ، کسبی اور روائتی ہی قسم کی کہی جا سکتی ہے۔ اور وہ ہی بھی واعظ اور محبت کی ذات تک محدود جو کہ گردش میں دن رات چکر لگاتے رہتے ہوں گے۔ مولانا حالی ہی پر کیا موقوف ہے۔ اس معاملہ میں تقریباً تمام اردو شاعروں نے خواہ وہ کتنے ہی سنجیدہ کیوں نہ ہوں، فارسی کا تتبع کیا ہے۔ چنانچہ میر درد جیسا ثقہ اور صوفی منش شاعر بھی اس اتباع سے اپنے آپ کو نہ بچا سکا اور اس نے بھی فارسی شعرا کی تقلید میں

شیخ اور واعظ کا مذاق اڑانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی چنانچہ میر درد فرماتے ہیں

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یا پھر اُن ہی کا یہ فرمانا

اٹھ چلے شیخ جی تم مجلس رنداں سے شتاب
ہم سے کچھ خوب مدارات نہ ہونے پائی

لہٰذا اگر حالی جیسے مولوی عالم اور خدا رسیدہ انسان سے مندرجہ ذیل اشعار واعظ اور محبت کی شان میں سرزد ہوئے تو اس میں چنداں حیرت کا مقام نہیں ہے

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ
اسکی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

شیخ اللہ رے تیری عیاری
کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز

آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم
تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث

واعظ دین کا خدا حافظ
انبیاء کے ہو تم اگر وارث

بات واعظ کی کوئی بگڑی گئی
ان دنوں کم تر ہے کچھ ہم پر لتاڑ

دیکھئے شیخ مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

سوال یہ ہے کہ وہ اس شیخ علاوہ اگر طنز کرتے بھی تو کس پر؟ کسی رقیب پر کرنے سے رہے کیونکہ وہ ساری زندگی نہ کسی کے رقیب رہے اور نہ انھوں نے اپنی مصروفیت کی بنا پر کسی کو رقیب ہونے کا موقع دیا۔ دوسرے یہ چیز کہ وصل و فراق سے متعلق ہوتی ہے اسلئے

مولانا اس سے بمراحل دور رہے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ "نہ مجھے خود آرائی کا خیال آیا اور نہ عشق و جوانی کی ہوا لگی نہ وصل کی لذت ملی نہ فراق کا مزا چکھا۔" دراصل وہ کچھ اس پائے کے بزرگ، مصلح، شاعر اور عالم باعمل تھے کہ ان کی علمی اور ادبی مصروفیتوں نے انھیں اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ شوخی اور طنز و مزاح کی محفل میں قدم رکھتے۔ اسی لئے وہ اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان "مزاح" ہے مسلمانوں کو اس سلسلے میں ڈانٹ ڈپٹ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ آجکل ہنسی اور چہل میں جو امتیاز ہماری قوم کو حاصل ہے وہ ہندوستان میں کسی قوم کو حاصل نہیں ہے جتنے ضلع جگت پھکڑ بولنے والے اور پھبتیاں کہنے والے پیدا ہوتے ہیں اس قوم میں پیدا ہوتے ہیں جتنی گالیاں ایک مسلمان شریف زادہ کو یاد ہوتی ہیں کسی کو نہیں ہوتی۔ عام ہندوستان میں جتنے پنچ اخبار ہیں ان کے ایڈیٹر، پروپرائٹر، مالک اور کرسپانڈنٹ (نامہ نگار) اسی قوم زندہ دل میں۔ ہندوستانی امیروں اور امیرزادوں کی مجلس میں جتنے مسخرے اور رونق محفل پاؤ گے۔ اسی قوم کے پاؤ گے، واعظوں میں جتنے لطیفہ گو اور بذلہ سنج دیکھو گے اسی قوم کے پاؤ گے، فحش اور بے حیائی کی کتابوں میں ایک بھی ایسی نہ ہوگی جس کا مصنف مسلمان ہوگا۔ مناظروں کی کتابیں اسی قوم کے عالموں کی ایسی نکلیں گی جس میں تمسخر ظریفی کا پورا پورا حق ادا

کیا گیا ہے۔ شاعروں میں کوئی حاجی، غزل گو، ریختی گو، اور یہ
تخندہ ذہن ایسا نہ ہوگا جو ــــــ قوم کا مسلمان نہ تھا ــــ
داستان لکھنے والوں میں صرف ایک شخص ایسا سنا گیا ہے۔ جو
اصل میں قوم کا مسلمان نہ تھا، لیکن آخر میں اُسے بھی مسلمان ہونا
پڑا۔ غرض اس قوم کی فصاحت، ذہانت اور فضیلت جس قدر
مزاح میں صرف ہوتی ہے ویسی کسی اور کام میں کہاں ہوتی ہے؟

ملاحظہ فرمایا آپ نے مولانا کو، مزاح سے ان کو نفرت نہیں تھی بلکہ وہ تمام پنچ
اخباروں کے بھی خلاف تھے اور آپ یہاں اردو ادب میں منشی سجاد حسین والے
اودھ پنچ سے طنز و مزاح کی باقاعدہ طور پر ابتدا ہوتی ہے پھر مولانا داستان گویوں
کے بھی خلاف تھے پھر بھلا کبھی اور لطیفہ گوئی کو بھی قوم ہی کیلئے ایک آزار تصور
فرماتے تھے۔ ابتدا مولانا کے یہاں شوخی یا شرارت یا مزاح والے شعر جہاں جہاں
آ گئے ہیں وہ غالباً موصوف استاد معظم مرزا غالب کا عطیہ ہیں یا ممکن ہے کہ
جب مولانا کے کلام نثر و نظم کو لوگوں نے بہت خشک اور روکھا پھیکا بتایا ہے
تو مولانا سخت پریشان ہو کر مرتے وقت مرزا غالب سے یہ مصیبت بیان
کرنے پہنچ گئے ہوں اور انھوں نے کہا ہو کہ میں تو بہر حال اس دنیا سے
شوخی بچا ہی کر رہا ہوں۔ میری شوخیاں ظاہر ہے کہ میرے ساتھ
ہلاک اور ختم ہو جائیں گی اس لئے تھوڑی سی شوخیاں اپنے پاس چھپا کر
اگر کہیں تمہیں ضرورت پڑے تو استعمال کر لینا تاکہ تمہاری نظم و نثر پر جو
روکھے پھیکے ہونے کا الزام ہے۔ وہ دھل جائے۔ اس پر مولانا نے کہا ہوگا

کرشمۂ خیال تو خیر مجھے پسند ہیں البتہ طنز کا چھوٹا سا عنصر رکھ لیتا ہوں اگر موقعہ ملا تو اسے استعمال میں لاتا رہوں گا اور یہ غالباً مسدس کے مندرجہ ذیل بندوں میں طنز کے کچھ کچھ عناصر ملتے ہیں۔ جو آپ بھی ملاحظہ فرماتے چلیں۔

اگر شش جہت میں کوئی دلربا ہے   تو دل اس کا نادیدہ اس پر فدا ہے
اگر خواب میں کچھ نظر آگیا ہے   تو یاد اس کی دن رات نام خدا ہے
بھری سب کی وحشت سے روداد یاں
جسے دیکھئے قیس و فرہاد ہے یاں

ایک دوسری جگہ مسلمانوں کی زبوں حالی پر طنز ملاحظہ ہو۔

عمل واعظوں کا اگر قول پر ہے   تو بخشش کی امید بے ضرورت زر ہے
نماز اور روزے کی حالت اگر ہے   تو روز حساب ان کو پھر کس کا ڈر ہے
اگر شہر میں کوئی مسجد بنا دی
تو فردوس میں نیو اپنی جما دی

مولویوں کے ناصحانہ انداز کی تصویر کشی ملاحظہ ہو۔

کبھی وہ گلے کی رگیں ہیں پھلاتے   کبھی جھاگ پر جھاگ ہیں منہ پر لاتے
کبھی خوک اور سگ ہیں اس کو بتاتے   کبھی مارنے کو عصا ہیں اٹھاتے
ستون چشم بد دور ہیں آپ دیں کے
نمونہ ہیں خلق رسول امیں کے

جو چاہے کہ خوش ان سے ہو کر ہو انساں   تو ہے شرط وہ قوم کا ہو مسلماں
نشاں سجدہ کا ہو جبیں پر نمایاں   تشرع میں اس کے نہ ہو کوئی نقصاں

نہیں جز جو رہی ہو نہ داڑھی چڑھی ہو ۔۔۔ ازار اپنی حد سے نہ آگے بڑھی ہو

عقاید میں حضرت کا ہم داستاں ہو ۔۔۔ ہر اک اصل میں فرع میں ہم زباں ہو

حریفوں سے اُن کے بہت بدگماں ہو ۔۔۔ مریدوں کا ان کے بڑا مدح خواں ہو

مولانا حالی کو عام مولویوں پر ان معنوں میں تو ضرور فضیلت اور فوقیت حاصل ہے کہ وہ شاید پہلے مولوی ہیں جو شادی ہونے کے بعد بھی شادی سے بھاگتے رہے ورنہ یہ کفران نعمت اور پھر ایک مولوی سے ظہور میں آنا معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟ لیکن مولانا کی اس لنترانی کے معنے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ مولانا سرے سے شادی بیاہ ہی کے خلاف تھے یا شادی کو کوئی لغو چیز سمجھتے تھے، ایسا بالکل نہیں تھا بلکہ جس عمر میں ان کی شادی کی گئی تھی اس کو وہ غیر مناسب سمجھتے تھے ورنہ اگر وہ بکار خویش ہشیار قسم کے انسان نہ ہوتے تو علم سے سیراب ہونے کے بعد دوبارہ گھر واپس آکر ہماری آپ کی طرح شادی شدہ زندگی نہ بسر کرتے۔ یہ ضرور ہے کہ عام مولویوں کی طرح وہ عورت سے کوئی زیادہ رغبت نہیں رکھتے تھے جیسا کہ ان کی مندرجہ ذیل رباعی سے پتہ چلتا ہے اور وہ مولوی اور عورت دونوں کو عقل و خرد کے اعتبار سے ایک ہی درجہ کی چیز سمجھتے ہیں۔ مگر وہ عام مولویت کو برا بھی نہیں سمجھتے تھے۔ دراصل ان کی شاعری ——— دو اور دو چار قسم کی شاعری تھی اور وہ زندگی میں صرف حقائق کے قائل تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

دیکھو جس سلطنت کو درہم ہے ۔۔۔ سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم

یا تو کوئی بیگم ہے مشیر دولت ۔۔۔ یا ہے کوئی مولوی وزیر اعظم

مذکورہ بالا رباعی کے مصرع ثانی میں "برکت کا قدم" براہ راست
سبز قدم یعنی نحوست کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح تیسرے مصرعہ میں
بیگم "کا لفظ اگرچہ موصوف نے بیگم بھوپال کے لئے استعمال کیا ہے مگر اس کا
مقصد ساری کی ساری جنس لطیف ہے جسے وہ عقل وخرد سے اسی طرح
بے گانہ تصور کرتے ہیں جس طرح انتظامی معاملات میں مولوی کو دراصل
یہ مولانا کی بہت بڑی جرأت اور ہمت تھی جو مولانا نے عام مولوں کی طرح
بجائے دل ہی دل میں عورت کو بے وقوف کہنے کے بہ آواز بلند کہہ ہی
نہیں دیا بلکہ لکھ دیا تاکہ سند رہے یا اسی طرح براہ راست مولوی کو سلطنت
کی تباہی اور بربادی کا ذمہ دار قرار دیا۔ مسدس کا ہموزن ایک دوسرا
کارنامہ ہے۔ اب مولانا کی شیخ اور محتسب پر چند چوٹیں ملاحظہ ہوں۔

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

سنتے ہیں آباد دوزخ کو حضور
خلد کو ویران کرداتے ہیں آپ

چھیڑ کر واعظ کی حامی قلم رے
بستر کیوں اپنا بھیگو اتے ہیں آپ

شب کو زاہد سے نہ مڈبھیڑ ہوئی خوب ہوا
نشہ زور دل پہ بھاشاید نہ چھپایا چھپاتا

اڑے گی خاک تقدس کی اب سر بازار   فقیہ و شیخ میں جوتی اچھلتی جاتی ہے

مشاعرے کی طرح پر غزل لکھنے کا عذر فرماتے ہوئے اُن شاعروں پر مولانا کا طنز و مزاح ملاحظہ ہو۔ جو بطور پیشہ شعر کہتے ہیں ۔

ہاں مگر کیجئے کچھ اس لئے غیروں کے یہاں
لائے باغ سے اوروں کے اُگا کر ڈالی

کھینچئے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر
کیجئے درد جدائی کی کبھی نقالی

تاکہ بھڑکائے جوانوں کے دل آتش کیطرح
وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہو لبِ خالی

پر یہ ڈر ہے کہ کہیں اپنی وہی ہو نہ مثل
قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

مولانا چونکہ اردو تنقید میں ایک امام کا درجہ رکھتے ہیں اور تنقید کی ابتدا ہی آپ کی مشہور کتاب "مقدمہ شعر و شاعری" سے ہوتی ہے اس لئے اگر مولانا کی نثر میں کوئی شگفتگی یا شوخی کی جھلک نہیں پائی جاتی تو چنداں حیرت کی بات نہیں بلکہ حیرت کا مقام اس وقت تھا جب وہ تنقید نگار نہ ہوتے۔ کیونکہ تنقید نگاروں کو ایسا ہی روکھا پھیکا ہونا چاہئے جیسے کہ مولانا تھے۔ مولانا نے نثر میں اتنا زیادہ لکھا ہے کہ شاید کم ہی لوگوں نے اتنا لکھا ہو۔ پھر جو کچھ لکھا ہے وہ دراصل اردو ادب میں ایک اضافہ ہے مگر اس نثر کے طویل ریگستان میں نخلستان کہیں نظر نہیں آتا۔ بڑی تلاش کے بعد ایک مضمون میں جو ایک اخبار رفیق ہند مورخہ ۱۵ اکتوبر ۱۸۹۲